فہرست مضامین

عالیجناب ڈاکٹر نواب عمادالملک بہادر مد ظلہ

سی-ایس-آئی، ال-ال-ڈی

٭

نواب عمادالملک بہادر ہماری قوم کے اُن بزرگوں میں سے ہیں جن پر ہمیں بجا فخر ہے - باوجود خاندانی وجاہت اور ہر قسم کے وسائل کے انہوں نے تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد سررشتۂ تعلیم ہی کو پسند کیا اور آخیر ملازمت تک اسی پر قائم رہے اور حقیقت یہ ہے کہ اس سے بڑھ کر ملک کی کوئی خدمت نہیں ہو سکتی اگرچہ ابتدا اس کی لکھنؤ میں ہوئی لیکن تھوڑے ہی عرصے بعد وہ حیدرآباد بلا لئے گئے جہاں وہ چند سال بعد سررشتۂ تعلیم کے اعلیٰ افسر مقرر ہوئے اور گو بیچ بیچ میں وہ اس سے اعلیٰ مناصب پر فائز ہوئے لیکن تعلیمی خدمت کو انہوں نے کبھی نہیں چھوڑا - آج جو تعلیم کا چرچا ہم حیدرآباد میں دیکھتے ہیں وہ انہیں کا طفیل ہے —

کتب خانۂ آصفیہ جس میں نادر اور بیش بہا قلمی کتابوں کا بہت اچھا ذخیرہ ہے آپ ہی کا قائم کیا ہوا ہے اور ان کتابوں کے بہم پہنچانے میں جو مشکلات پیش آئیں اس کے متحمل صرف نواب صاحب ہی ہو سکتے تھے دائرۃالمعارف جس میں عربی زبان کی ایسی نادر اور نایاب علمی کتابوں کی طبع و اشاعت کا انتظام کیا جاتا ہے جو اب تک نہیں چھپیں وہ آپ ہی کی سعی و توجہ کا نتیجہ ہے - یہ دونوں اب تک آپ ہی کی زیر نگرانی ہیں قدیم دارالعلوم کی ترقی بہت کچھ آپ ہی کی ذات سے ہوئی - حرفت و صنعت

کے مدارس اس ملک میں آپ ھی نے قائم کئے - اس کا آپ کو ھمیشہ خیال رھا اور اب تک ھے - غرض ریاست حیدرآباد کی جدید و قدیم تعلیم کی بانی آپ ھی کی ذات گرامی ھے - حال میں جب جامعۂ عثمانیہ حیدرآباد کا جلسۂ تقسیم اسناد ھوا تو امیر جامعہ نے ایل-ایل-ڈی کی ڈگری عطا کرتے وقت جو الفاظ آپ کی نسبت فرمائے تھے وہ نہایت صحیح اور موزوں تھے جنھیں ھم یہاں نقل کرتے ھیں

"... اس سلسلے میں سب سے پہلے جو نام میں لیتا ھوں وہ جامع علوم مشرقی و مغربی نواب عمادالملک بہادر کا اسم گرامی ھے جنھیں میں قلبی مسرت کے ساتھ جامعۂ عثمانیہ کی طرف سے ایل-ایل-ڈی کی اعزازی سند دیتا ھوں - اس نامور فاضل اور دیرینہ سال ماھر تعلیم سے آپ کا تعارف کرانا تحصیل حاصل ھے کہ اس بزرگ کے اوصاف اور کارناموں سے ملک کا ھر با خبر شخص آگاہ ھے اور یہ کہنا غلط نہ ھوگا کہ اس ریاست میں تعلیم جدید کی ساخت و پرداخت بہت کچھ صاحب موصوف ھی کے ھاتھوں ھوئی جو تیس برس تک ناظم تعلیمات سرکار عالی کے فرائض ادا کرتے رھے - آج جب کہ ھم اپنے ملک میں جدید تعلیم کے فروغ و ارتقا کا مشاھدہ اس جلسۂ تقسیم اسناد میں کر رھے ھیں عین مناسب ھے کہ مذکورۂ بالا ڈگری کے پیرائے میں ھم نواب عمادالملک کی نواسویں سالگرہ منائیں" —

نواب صاحب ممدوح کے علم و فضل اور ذوق سلیم سے کسی کو انکار نہیں ھو سکتا اور جامعۂ عثمانیہ نے اپنے پہلے جلسۂ اسناد میں ایل-ایل-ڈی کی ڈگری عطا کر کے اپنا حق ادا کیا ھے اور حقیقت یہ ھے کہ اُن سے بڑھ کر اس کا کوئی مستحق نہ تھا - یہ گویا اعتراف ھے اُن تعلیمی اور علمی خدمات کا جو انھوں نے اس ملک میں انجام دی ھیں —

علم و فضل سے قطع نظر کر کے جو بات آپ میں سب سے قابل قدر ھے وہ آپ کی سیرت ھے - آپ کی طالب علمانہ اور بے لاگ زندگی، آپ کی صاف

گوئی اور راست گفتاری، آپ کی تہذیب اور نفاست ذوق یہ ایسے جوہر ھیں جو بہت کم لوگوں میں پائے جاتے ھیں۔ حیدرآباد ایک ایسا مقام ھے جہاں اچھوں اچھوں کو لغزش ھو جاتی ھے - لیکن نواب عماد الملک کا دامن اُن تمام باتوں سے پاک رھا جن کے لئے حیدرآباد بد نام ھے —

آپ ھمیشہ طالب علم رھے اور اب بھی طالب علم ھیں - اس وقت بھی جب کہ آپ علالت کی وجہ سے (جو ٹانگ کے سبب سے لاحق ھو گئی ھے) آپ بہت ضعیف ھو گئے ھیں، آپ مطالعہ فرماتے رہتے ھیں اور اپنے ھاتھہ سے تمام خطوں کا جواب دیتے ھیں - اُن کی صحبت میں اب بھی ادب و مذھب کی گفتگو ھوتی رھتی ھے اور اُن لوگوں سے بڑی خوشی اور بے تکلفی سے ملتے ھیں جو علمی اور ادبی ذوق رکھتے ھیں - اگرچہ آپ کچھہ زیادہ دولت مند نہیں ھیں تاھم طالب علموں کی دستگیری فرماتے رھتے ھیں - اورنگ آباد کالج جو آپ ھی کے اشارے اور تحریک سے قائم ھوا، وھاں کے نادار طلبہ کی امداد آپ ابتدا سے اب تک برابر کرتے ھیں - علمی اور ادبی کاموں میں مدد دینے سے کبھی دریغ نہیں کرتے - انجمن ترقی اُردو پر اُن کی خاص عنایت ھے اور اس کے علمی کاموں میں جو قابل قدر امداد آپ نے فرمائی ھے اس کا شکریہ ادا نہیں ھو سکتا —

آپ کے قویٰ بہت اچھے تھے - ھمیشہ صحت اور عافیت کے ساتھہ بسر کی - اگر یہ پاؤں کا صدمہ نہ ھوتا جس کی وجہ سے آپ کو تکلیف رھتی ھے اور چلنے پھرنے سے معذور ھو گئے ھیں، تو آپ کی صحت بہت اچھی رھتی اور اس قدر ضعف نہ ھونے پاتا جیسا اب نظر آتا ھے - تاھم اب بھی اُن کی صحبت مغتنمات میں سے ھے اور اس کی قدر وھی جانتے ھیں جن کو اس سے مستفید ھونے کا موقع ملا ھے - ان کے مزاج میں خاص نفاست ھے اور وھی نفاست اُن کے کھانے پینے، رھنے سہنے، بات چیت اور علم و ادب میں ھے - مولانا عبدالحلیم صاحب شرر نے اس پر ایسا اچھا اور پاکیزہ مضمون لکھا ھے (جو اس کے بعد

آپ کی نظر سے گزرے گا) کہ مجھے اس پر لکھنے کی ضرورت باقی نہیں رہی —

ہم اُس فیض و فلاح کی شکر گزاری میں جو ملک کو آپ کی ذات سے پہنچی ہے اُردو کا یہ نمبر آپ کی تراسویں سالگرہ کی تقریب میں شایع کرتے ہیں اور دعا کرتے ہیں کہ آپ دیر تک صحت و عافیت کے ساتھ زندہ و سلامت رہیں —

عبدالحق

نواب عماد الملک مولوی سید حسین خان صاحب بہادر بلگرامی۔

از

(جناب مولانا عبد الحلیم صاحب شرر لکھنوی)

اُنیسویں صدی عیسوی کے آغاز میں ہندوستان ایک عجیب عالم کون و فساد بنا ہوا تھا۔اس لئے کہ پرانی ریاستوں کے ساتھہ پرانے مذاق کے صاحبان علم و فضل بھی فنا ہو رہے تھے اور نئی حکومت و تعلیم نے جدید کمالات علمی کے نمونے اور نئی شان کے علما و فضلا پیدا کرنا شروع کر دیے تھے۔ان دونوں متضاد زمانوں کو ربط دینے والی کڑی فقط وہی اہل علم ہو سکتے تھے جو دونوں قدیم و جدید مذاقوں سے آشنا ہوں—

اسی قسم کے ذی علم و اہل کمال میں سے اضلاع اودہ کا ایک بہت پرانا فاطمی النسل علمی خاندان تھا جو مشہور مرکز علماے عظام یعنی قصبہ بلگرام کو چھوڑ کر بنگالے پہونچا اور پھر اُس کے ہونہار فرزندوں کی طالبعلمانہ سرگرمی سے پرانا علمی کمال جدید علوم کے لباس میں نئے اقبال کی عالم افروز آب و تاب کے ساتھہ چمکنے لگا—

بلگرام اودہ کا بہت پرانا قصبہ ہے جس میں پانچویں صدی ہجری کے آغاز سے اسلام کے شریف و وضیع اور صاحب علم و کمال عربی خاندان آکے آباد ہونا شروع ہو گئے اور اس سر زمین کو اپنا وطن مالوف بنا لیا۔انہیں

الوالعزم آنے والوں میں ایک فاطمی نژاد ذی علم بزرگ تھے جنھوں نے سنہ ۵۶۴ ھجری میں وارد بلگرام ھوکر وھاں کے ھندو راجہ کو شکست دی اور اُس کی قلمرو پر متصرف ھوکر اس علاقے کے حاکم بن گئے۔یہ بزرگ چونکہ علوم معقول و منقول میں کمال رکھتے تھے لہذا اطراف و جوانب کے مسلمانوں کی پیشوائی اور مقتدائی کا عمامہ بھی اُنھیں کے سر پر تھا—

اس کے بعد یہ خاندان اپنی اُسی محدود حکومت پر قناعت کر کے علم و فضل میں ترقی و ناموری حاصل کرتا رھا اور تاریخ بتا رھی ھے کہ ھر دور میں اس کے ارکان بڑے متبحر عالم اور فاضلانہ وقار کے مصنف تھے جن کی علمی عظمت کے آگے بڑے بڑے اسلامی درباروں کے سر جھکے رھتے تھے اور غالباً اسی علمی فضیلت و مرجعیت نے اس خاندان کے نسب نامے کو ھمیشہ محفوظ رکھا۔ اودھ کے تمام قصبات کے شرفا اپنے پرانے نسب نامے پیش کر رھے ھیں مگر جس قدر مستند اور قابل وثوق نسب نامہ شرفا و فضلاے بلگرام کا ھے شاید اور کسی خاندان کا نہ ھوگا اور پھر سب سے زیادہ حیرت کی یہ بات ھے کہ اس خاندان نے اپنی شرافت کے ساتھہ اپنی آبائی و موروثی دولت علم کو بھی ھمیشہ محفوظ رکھا —

اسی خاندان کے ایک رکن رکین وہ بزرگ تھے جنھوں نے مذکورہ زمانہ کون و فساد یعنی انگریزی دور کے ابتدائی عہد میں زمانہ کی نبض پہچان کر دولت برطانیہ کی ملازمت اختیار کر لی۔اسی ملازمت کی کشش سے وطن کو خیر باد کہہ کر کلکتے پہونچے اور مغربی اقبالمندوں کے صحیفۂ اقبال کو مطالعہ کر کے اپنی قسمت انھیں سے وابستہ کر دی۔اُن کا قیام اکثر کلکتہ میں رھا اور وھیں اُن کے فرزند پیدا ھوے—

ان کے دو فرزندوں نے جو مولوی سید حسین بلگرامی کے والد اور چچا تھے خاندانی علوم عربی و فارسی میں کافی دستگاہ حاصل کرنے کے بعد

"اورنٹل کالج آف لرننگ" میں تعلیم پانا شروع کی اور یہی پہلے عالی خاندان مسلمان شریف زادے تھے جنھوں نے باقاعدہ طور پر انگریزی اسکول میں تعلیم پائی —

ان دونوں بھائیوں میں سے ایک یعنی مولوی سید حسین صاحب کے چچا نے دولت برطانیہ کے ارکان سلطنت میں اعتماد حاصل کر کے بڑا عروج پایا اور بڑی ذمہ داری کی سیاسی و اعزازی خدمتوں پر مامور ہوتے رہے۔مگر ان کے پدر بزرگوار نے اکزیکیو ٹیو محکمے میں ملازمت اختیار کی۔سنہ ۱۸۴۰ ع میں وہ ڈپٹی کلکٹر اور ڈپٹی مجسٹریٹ مقرر ہوے اور ایک مدت دراز تک ان خدمات کو اضلاع بنگالہ و بہار میں بکمال نیکنامی و اعلیٰ قابلیت انجام دے کر سنہ ۱۸۷۵ ع میں وظیفہ یاب ہوے —

سنہ ۱۸۴۴ ع میں جب کہ وہ ضلع گیا میں ڈپٹی کلکٹر تھے مولوی سید حسین صاحب پیدا ہوے جن کی جوبلی کے موقع پر ان کے مختصر حالات کو قلمبند کر کے ہم معترف کمال پبلک کے سامنے پیش کرتے ہیں۔پہلے ہم ان کی زندگی کے واقعات بیان کرتے ہیں اور اس کے بعد اُن کے اخلاق و عادات اور دیگر ذاتی و صفاتی خصوصیات سے بحث کریں گے —

مولوی سید حسین صاحب کا یہ بھی ایک نمایاں شرف ہے کہ جس خاک سے "بدھا" کا ایسا عدیم المثال دانائے روزگار پیدا ہوا تھا وہی خاک اُن کو بھی عالم وجود میں لائی۔چودہ پندرہ سال کی عمر تک خانگی مکتب میں خاندانی علوم عربی و فارسی کی تحصیل کی اور مشرقی علوم سے فارغ ہونے کے بعد انگریزی زبان اور اُس کے علوم کی طرف متوجہ ہوے۔چنانچہ پہلے بھاگل پور میں پھر پٹنے میں اور بعد ازاں کلکتے کے انگریزی مدارس میں تعلیم پا کر سنہ ۱۸۶۱ ع میں میٹری کیولیشن کی سند حاصل کی بعد ازاں سنہ ۱۸۶۶ ع میں فرسٹ گریڈ میں آنر کے ساتھ گریجویٹ ہوے —

اب بہ ظاہر تعلیم تکمیل کو پہونچ گئی تھی۔ پدر بزرگوار نے چاہا کہ اپنے ہی محکمے میں کسی معزز خدمت پر مقرر کرادیں مگر سید حسین ابھی تک اپنے تئیں طالب علم سمجھتے تھے۔ انہیں دنیا میں بہت کچھہ سیکھنا تھا۔ اسلئے گوارا نہ ہوا کہ کوئی ایسی ملازمت اختیار کرلیں جو ان کو اپنا پابند بناکر علمی ترقی سے روک دے۔ چنانچہ محکمہ تعلیمات کو پسند کیا اور کیننگ کالج لکھنؤ میں عربی کے پروفیسر مقرر ہوگئے۔ یوں اودھ کی شریف نسل کے اِس ہونہار فرزند نے جوگیا میں پیدا ہوا تھا پھر خاک وطن پر قدم رکھا اور کالج کے طلبہ کو تعلیم دینے کے ساتھہ ساتھہ لکھنؤ کے تمدنی اسکول میں معاشرتی آداب واخلاق سے بہرہ اندوز ہونے لگا—

سنہ ۱۸۷۲ ع میں مدارلمہام دولت آصفیۂ نظام نواب سر سالار جنگ بہادر اعظم سیاحت کرتے ہوے وارد لکھنو ہوئے تو جنرل بارو نے اس عجیب و غریب مجموعۂ علوم مشرق و مغرب یعنی نوجوان پروفیسر سید حسین کو ان سے ملایا۔ اور ان کی ذاتی وعلمی خوبیاں بیان کیں۔ نواب سالار جنگ بہادر کی مردم شناسی مشہور ہے۔ پہلی ہی ملاقات میں پہچھان گئے کہ یہ نوجوان کیا سے کیا ہونے والا ہے۔ چنانچہ مولوی سید حسین کے کمالات کے ایسے گرویدہ ہوئے کہ اُنہیں دولت نظام کی ملازمت کا شوق دلایا اور فرمایا جب میں حیدرآباد میں پہونچ لوں تو آپ وہاں آکر مجھہ سے ملیں—

مولوی سید حسین کی نظر میں علمی ترقی کے سوا اورکسی چیز کی وقعت نہ تھی اور ایسا مربی کہاں بھی پھر ملنا دشوار تھا۔ زبانی وعدہ تو کرلیا مگر دکن کا سفر دور دراز اختیار کرنے میں دل پس و پیش کررہا تھا۔ یہاں تک کہ نواب سرسار جنگ بہادر نے حیدرآباد پہونچ کر خود ہی خط بھیج کر انہیں بتاکید بلایا۔ یہاں ذوق علم نے اس درجہ مستغنی بنارکھا تھا کہ اب بھی کئی مہینے لیت و لعل میں گزر گئے۔ آخر سنہ ۱۸۷۳ ع میں دکن کا سفر کرنا ہی

پڑا اور حیدرآباد پہونچے—

سر سالار جنگ بہادر نے صورت دیکھتے ھی اپنا پرسنل اسٹنٹ مقرر کرلیا۔ سنہ ۱۸۷۶ ع تک اسی خدمت پر ماموور رھے تھے کہ سالار جنگ بہادر سفر یورپ سے واپس آئے اور آپ کو اپنا پرایوٹ سکرٹری اور معتمد صیغہ متفرقات بنادیا۔جس میں سررشتہ تعلیم اور متعدد چھوٹے چھوٹے محکمے شامل تھے—

بعد ازاں جب حضور پرنور نواب میر محبوب علی خاں بہادر اریکہ آرائے سلطنت ہوئے تو مولوی سید حسین کو خاص اپنا پرایوٹ سکرٹری مقرر فرماکر "علی یار خاں موتمن جنگ بہادر" کے خطاب سے ممتاز فرمایا اور چند سال بعد اُنھیں "عمادالدوله" اور پھر "عمادالملک" کے خطاب عطا ھوئے۔ تھوڑے زمانے کے بعد آپ ناظم تعلیمات مقرر کئے گئے جس خدمت کو آپ نے مدت دراز تک انجام دیا اور اگر غور سے دیکھئے تو قلمرو نظام کی ساری تعلیمی ترقی اور حیدرآباد کے تمام تعلیم یافتہ لوگوں کی قابلیت اور دماغی روشن خیالی آپ ھی کی ھمیشہ بر قرار رھنے والی برکت اور بہترین یادگار ھے—

اس عرصہ میں سلطنت برطانیہ کے اعلیٰ احکام کو نواب عمادالملک بہادر کی سیاسی اور تعلیمی معاملات میں قابل قدر بصیرت سے بخوبی شناسائی ھو گئی تھی۔سنہ ۱۹۰۳ ع میں آپ کو مجلس وضع قوانیں کا رکن نامزد کیا گیا۔پھر چند سال کے بعد "اصلاحات مارلے" نافذ ھوئیں تو نواب عمادالملک پہلے ھندوستانی تھے جنھیں وزیر ھند کي مجلس کا رکن منتخب کیا گیا اور وہ سنہ ۱۹۰۷ ع سے سنہ ۱۹۰۹ع تک اس معزز منصب پر سرفراز رھے۔اسی دوران میں آپ کو سی۔ایس۔آئی کا خطاب اور تمغہ عطا ھوا—

مجلس مذکور کی رکنیت سے بوجہ علالت دست بردار ھو کر نواب عمادالملک واپس تشریف لائے تو آپ کو نوجواں مدارالمہام نواب سالار جنگ ثالث کی مدد کے واسطے مشیرالمہام مقرر کیا گیا اور گو کچھہ عرصہ کے بعد اس

عہد سے علیحدہ ہو کر پھر آپ نے کوئی سرکاری خدمت لینی قبول نہ فرمائی بایں ہمہ اعلحضرت شہریار دکن آپ کی اب تک نہایت عزت و توقیر فرماتے ہیں کہ شاید حیدرآباد میں دوسروں کو کم نصیب ہوئی ہوگی۔ زمانۂ مشیرالمہامی میں آپ نے ملکی حرفت وصنعت اور اردو زبان کی ترقی کی تجویزیں نافذ فرمائیں —

یہ تو نواب عمادالملک بہادر کے حالات زندگی تھے اب یہ بتانا ہے کہ علمی استناد اعتبار اور دینوی عزت و وقار حاصل کرنے کے بعد اِن کا کیرکٹر کیا رہا اور ان کی کیا شان نمودار ہوئی - جن لوگوں نے ان کے صفحۂ زندگی پرغائر نظر ڈالی ہے وہ بالاتفاق مقر ہیں کہ اس سے زیادہ مہذب و شائستہ ہستی موجودہ ہندوستان میں نہیں نظر آسکتی —

باوجود اعلیٰ دولتمندی اور عالمانہ فضل وکمال کے آپ نہایت ہی سادی طبیعت رکھتے ہیں۔ حد سے زیادہ منکرالمزاج واقع ہوے ہیں، اسوقت تک طالب علم ہیں۔ اورہمیشہ رہیں گے - حیدرآباد کے سیاسی میدان میں بہت سے نامور لوگ آئے چلے گئے اور سب اپنے اپنے مقام پر اپنے خصوصیات دکھا کے اور انقلابات کے فہو نہ بن کے رخصت ہوگئے مگر عمادالملک بہادر جو آج سے پچاس سال پیشتر تھے وہی آج ہیں اور جو سچی شائستگی اور فاضلانہ بے پروائی و یکرنگی آپ میں ہے کسی میں نہیں دیکھی گئی —

مشرقی اور مغربی دونو علموں ادبوں میں اعلیٰ کمال رکھنے کے باعث آپ اپنے جد امجد اور بزرگوار کی طرح آج بھی وہ کڑی ہیں جسنے یورپ و ایشیا کی خوبیوں کو باہم ملایا اور ہندوستان کے اگلے اور پچھلے غیر مربوط دوروں کو جوڑ کے ایک کر دیا —

عربی و فارسی علم و فضل میں اعلیٰ درجہ رکھنے کی وجہ سے آپ علما و فضلا اور صاحب علم اتقیاے زمانہ کے ایسے قدرداں ہیں کہ اس زمانے میں اور

کوئی نہیں - پھر اس کے ساتھ انگریزی ادب اور جدید معلومات میں کامل بصیرت رکھنے کے باعث دانایان یورپ اور اس نئی روشنی کے ماہروں میں بھی ایسی مقبولیت رکھتے ہیں کہ علماے زمیں انھیں آنکھوں پر بٹھاتے اور اُن کی دو گھڑی کی صحبت کو اپنی زندگی کا یادگار حصہ تصور کرتے ہیں—

مجھے ایک مدت تک بالذات اُن کی روزانہ صحبتوں میں شریک ہونے کی عزت حاصل رہی ہے اور ان کے طالبعلمانہ مشاغل میں شریک ہو کر میں نے ان کے علم وفضل سے فائدہ اُٹھایا ہے - اسی سلسلے میں مجھے اُن کی واقفیت عامہ، اُن کے مذاق، اور اُن کے اسلوب زندگی کے اندازہ کرنے کا بخوبی موقع ملا - شعراے کے کلام کا مطالعہ کرنے میں چند روز میں اُن کے ساتھ شریک رہا - اور نظر آیا کہ جیسی محققانہ و مبصرانہ نظر کلام عرب پر اُن کی پڑتی ہے بہت کم کسی کی پڑتی ہے - سچ یہ ہے کہ میں نے اُنھیں ادب عربی میں یکتاے روزگار پایا - جاہلیت عرب کے سادے اور خالص عربی مذاق سخن کے دلدادہ ہیں - شعراے جاہلیت کے اشعار پر سر دھنتے ہیں اور مولدین کے کلام کو بالکل نہیں پسند کرتے—

یہی حال انگریزی ادب و انشا میں ہے - جیسی خوبصورت، سادی اور سہل ممتنع انگریزی عبارت وہ لکھتے ہیں اہل زبان ادیبوں میں سے بھی شاذ و نادر ہی کوئی لکھ سکتا ہے - اس سادے ادبی مذاق انگریزی نے انھیں نگریزی کا ایک سحر آفریں شاعر بنا دیا - ان کی انگریزی نظمیں شایع ہو چکی ہیں جو انگلستان کے سخن فہموں میں مزے لے لے کر پڑھی گئیں - ان میں بھی وہی سادگی بے تکلفی اور جدت طرازی نمایاں ہے جو ان کی سرشت میں داخل ہے |

آپ کو انگریزی زبان پر جو قدرت حاصل ہے اس کا اندازہ آپ کے ترجمہ قرآن سے ہو سکتا ہے - بہت دن ہوئے آپ نے کوشش شروع کی تھی کہ قرآن مجید کا ترجمہ انگریزی زبان میں کریں - جس کے لئے آپ نے بہت بڑا اہتمام کیا تھا اور تفسیروں کا بڑا بھاری ذخیرہ جمع کر لیا تھا - تقریباً سولہ پاروں کا ترجمہ کر کے پروف کی حیثیت سے چھپوا لیا تھا کہ ضعف بصارت و علالت کی وجہ سے وہ مقدس کام پڑا

رہ گیا-میں نے وہ ترجمہ پڑھا ھے-بالکل انگریزی بائیبل کی زبان اختیار کی ھے-یورپ والوں کو توراۃ و انجیل میں خدا کے کلام کی جو شان نظر آتی ھے وھی شان نواب عماد الملک بہادر نے اپنی قادر الکلامی سے ایسی خوبی کے ساتھہ قرآن کے ترجمہ میں دکھادی ھے کہ پڑھنے والے کو متحیر ھوکر ان کے اعلیٰ ترین کمال انگریزی دانی کا معترف ھوجانا پڑتا ھے—

انگریزی کے علاوہ نواب عماد الملک بہادر فرانسیسی زبان میں بھی کامل دستگاہ رکھتے ھیں-اگرچہ ان کی کوئی فرانسیسی تحریر شایع نہیں ھوئی-مگر جس زمانے میں مجھے ان کے طالبعلمانہ مشاغل میں شرکت کا فخر حاصل تھا انھوں نے میرے شوق دلانے سے ڈوزی کی ھسٹری آف اسلام کا ترجمہ فرانسیسی سے اردو میں اس طرح شروع کیا تھا کہ وہ بتاتے جاتے تھے اور میں لکھتا جاتا تھا-میں نے دیکھا کہ وہ بغیر کسی لغت کی مدد کے نہایت ھی صفائی سے بے تکلف فصیح اردو ترجمہ بتاتے چلے جاتے ھیں-اُن کی وجہ سے مجھے کبھی نہیں رکنا پڑتا بلکہ میری وجہ سے وہ بار بار رکتے ھیں-اور یہ ایسی بات ھے جو بغیر کسی زبان میں اعلیٰ مہارت و قدرت ھونے کے غیر ممکن ھے—

بنگالے میں نشو و نما ھونے کے باعث بنگالی زبان بھی بے تکلف بولتے ھیں اور بعض اوقات میں نے دیکھا کہ بنگالی ملنے والوں کو اُن کے بنگالی زبان میں گفتگو کرنے پر حیرت ھوگئی—

اردو میں بھی اُن کا مذاق سخن بہت ھی سادہ ھے-سادی عام فہم زبان کو پسند کرتے ھیں اور عربی و انگریزی الفاظ استعمال کرنے کے سخت خلاف ھیں-شعراے اردو میں سے دھلی والوں کے مذاق کو فوقیت دیتے بلکہ اسی کو اصلی مذاق شاعری جانتے ھیں-کلام میں عربی دقیق الفاظ اور شعراے فارسی کے دقیق خیالات سے جو رفعت و شوکت پیدا کی جاتی ھے اس کو بالکل نہیں پسند کرتے-چنانچہ ناسخ کی شاعری کو نہیں تسلیم کرتے اور کئی بار مجھہ سے فرمایا

کہ "اُس کو شاعر کس نے کہا ہے؟"—

لکھنؤ کے سادگی پسند شعراء بھی جو اکثر اوقات معشوق کے زیور و لباس اور چوٹی کنگی کی تعریف کرجاتے ھیں اس کو ناگوار ابتذال تصور کرتے اور سخت نفرت کی نگاہ سے دیکھتے ھیں اور اسی کا نتیجہ ھے کہ وہ لکھنؤ کی عام شاعری کو ناپسند کرتے ھیں—

ان ھی مغربی و مشرقی کمالات کے اجتماع نے اُن میں یہ مذاق پیدا کردیا ھے کہ کسی عالم یا طالب علم کی صحبت میں چاھے وہ کیسا ھی بے پایہ اور کم حیثیت ھو بڑا لطف آتا ھے اور جاھل دولت مند سے چاھے کیسا ھی باوقعت اور مشین ھو اُنھیں سخت نفرت ھے-غریب صاحب علم کی باتوں میں اپنے ضروری کاموں کو بھول جاتے ھیں اور نمایشی بڑہ بڑہ کے باتیں بنانے والے دولت مندوں کی فضول گوئی سے بھاگتے ھیں-میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ ایک غریب ذی علم شخص سے بیٹھے باتیں کر رھے ھیں اور اس اثنا میں کوئی عالی مرتبہ امیر آکے بیٹھ گیا تو اُنھیں خبر بھی نہ ھوئی کہ کون آیا ھے اور کیوں آیا ھے—

اس کے ساتھ غالباً اودھ کے قصباتی خاندانی رئیس ھونے کی ایک یہ جھلک بھی اُن کے اخلاق میں موجود ھے کہ شریف النسل لوگوں کی قدر کرتے ھیں اور فرومایہ رزیلوں کی صحبت سے جہاں تک بنتا ھے احتراز کرتے ھیں-ایک آدھ دفعہ میں نے یہ تماشا دیکھا کہ ایک فرومایہ دولت مند بے تکلف آکر اُن کے ڈرائنگ روم میں برابر بیٹھ گیا-ان کی نظر پڑی تو چہرہ سرخ ھوگیا-اُٹھ کھڑے ھوئے اور اس کو کھڑے کھڑے نکال دیا-اُن کا یھی اخلاق اور برتاؤ میں نے بعض ایسے لوگوں کے ساتھ بھی دیکھا جن کی بد اخلاقی طشت از بام ھو رھی تھی—

طالبعلمانہ ھم صحبتی کے زمانے میں مجھے اُن کی اصلی معاشرت کے دیکھنے

کا بھی موقع ملا اور میں نے اُن کی اور اُن قدیم علما کی وضع و حالت میں سر مو فرق نہ پایا جن کی نسبت کہا جاتا ہے کہ دنیاوی تکلفات سے بچا کر اور کہاں سادگی کے ساتھہ جویائے علم رہتے ہیں۔عہدے یا درباری تعلقات کے باعث نواب عمادالملک بہادر کی ظاہری صورت تو یہ ہے کہ نہایت شاندار کوتھی میں رہتے ہیں۔اچھا پہنتے اور اچھا کھاتے ہیں۔مکان اعلیٰ درجے کے فرنیچر سے آراستہ ہے۔عمدہ پیچواں سامنے لگا ہے اور لکھنؤ کے بہترین خمیرے کے معطر دھوئیں سے سارا کمرہ مہک رہا ہے۔لیکن جب مخلا بالطبع ہوتے ہیں تو یہ شان نظر آتی ہے کہ زمین پر ایک بوریا یا دری بچھی ہے چاروں طرف کتابوں کا ڈھیر لگا ہے۔جس میں عربی فارسی انگریزی فرانسیسی سب طرح کی کتابیں ملی ہوئی ہیں اور اس عالمانہ طومار علوم کے درمیان سادے کپڑے پہنے کہاں بے تکلفی سے بیٹھے کسی مسئلے کی تحقیق یا کسی تاریخی واقعے کی گفتگو کر رہے ہیں۔مجھہ سے کئی بار فرمایا کہ "مجھے اس زندگی میں جو لطف آتا ہے وہ تکلف کی درباری زندگی میں کبھی نہیں آیا"—

اسی وضع و مذاق نے ان کو حد سے زیادہ مستغنی اور بے پروا بنا دیا ہے۔حضور نواب میر محبوب علی خان بہادر کے عہد حکومت میں جب نواب فتح نواز جنگ بہادر کا مقدمہ چل رہا تھا۔سرور جنگ بہادر کا زور تھا اور کوشش ہو رہی تھی کہ عمادالملک بہادر بھی فتنہ جو جماعت میں سمیت لئے جائیں اور ان پر حملے ہو رہے تھے۔مگر اُن کی وضع و حالت میں ادنیٰ تغیر بھی نہیں ہوا۔اُسی زمانے میں حضور مغفور چاہتے تھے کہ عمادالملک حاضر ہو کر اپنی پرائیویٹ سکرٹری کی خدمت انجام دیں۔مگر چونکہ ایوان خسروی سازشوں سے بھرا تھا اور وہاں کسی کے اوقات باقاعدہ اور منتظم نہیں رہ سکتے تھے وہ کسی طرح نہ جاتے تھے۔ان کے بہت سے احباب نے سمجھایا۔میں نے بھی کئی بار عرض کیا مگر اُنہوں نے اپنے علمی مشاغل کو

نہ چھوڑنا تھا نہ چھوڑا اور نہ جانا تھا نہ گئے اور اُس پرفتن زمانے میں اپنی اُسی وضع سے نباہ دی اور یہ بات بجز اُن کے اور کسی سے نہ ہو سکتی تھی—

اُن کی سب سے بڑی خصوصیت تو یہ ہے کہ کذب و دروغ سے سخت متنفر ہیں۔نہ کبھی ایک لفظ جھوٹ بولتے ہیں اور نہ جھوٹے کو منہ لگانے کے قابل تصور کرتے ہیں۔اسی طرح کیادی و مکاری کی کارروائیوں اور دغل فصل کی باتوں سے بھاگتے ہیں۔ان کی عہدہ داری اور دربارداری کی طولانی زندگی میں حیدرآباد کے اندر بیسیوں پارٹیاں قائم ہوئیں۔بڑی بڑی سازشیں ہوئیں۔جن میں بڑے بڑے عہدہ داران ریاست شریک تھے مگر عماد الملک کا دامن اُن نجاستوں سے ہمیشہ پاک رہا۔لوگوں نے ہزار چاہا کہ اُنہیں اپنے گروہ میں لیں مگر اُنھوں نے اس کو کبھی گوارا نہ کیا۔حیدرآباد میں اعلیٰ خدمت پر ممتاز رہنے کے ساتھ اُن کا ایسا بے داغ رہنا حیرت کے قابل ہے اور یہ اُنہیں کے ساتھ خاص ہے کہ کبھی کسی سیاسی یا سازشی پارٹی میں نہیں شریک ہوتے اور ان کی اس استقامت کا نتیجہ یہ ہوا کہ ایک طرف تو اُن کی نسبت بعض لوگوں کا یہ خیال قائم ہو گیا کہ اسٹیٹمین ہونے کے قابل اور ڈپلومیسی کے اہل نہیں ہیں اور دوسری طرف ہر شخص کو اعتراف کرنا پڑا کہ اُن کے پایے کا سچا اور راست باز کوئی نہیں ہے اور مخالف پارٹیوں اور بڑوں ہمسروں سب طرح کے لوگوں میں بالاتفاق وہ بے عیب اور واجب الاحترام تسلیم کر لئے گئے—

سر وقارالامرا بہادر مرحوم کی مدارالمہامی کے آغاز میں عماد نواز جنگ حسن بن عبداللہ نے جو اپنے آپ کو ایک بہت بڑا اسٹیٹمین جانتے تھے مجھ سے کہا کہ نواب مدارالمہام کی خواہش ہے کہ فتح نواز جنگ اور اُن کی بیوی کے شرمناک واقعات کا ایک ناول آپ لکھ دیں۔مجھے اس میں

تامل تھا بہانہ کیا کہ میرے پاس ایسے ناول کے لئے مواد واقعات نہیں موجود ہے اور نہ اُن کے حالات سے آگاہ ہوں۔حسن صاحب نے کہا "اس کے تمام واقعات آپ کو نواب عماد الملک بہادر سے ملیں گے" اُن کا نام سن کر مجھے حیرت ہوئی اور اُن سے وعدہ کر لیا کہ اگر اُنھوں نے مدد دی تو میں یہ ناول لکھ دوں گا۔دوسرے دن میں نے نواب عماد الملک بہادر سے اس کا تذکرہ کیا تو اُن کے غصے کی کوئی انتہا نہ تھی اور کمال برھمی سے فرمانے لگے "میں ایسی بیہودہ باتوں میں نہیں پڑتا" چنانچہ حسن صاحب کو پھر نہ کچھ کہنے کی جرأت ہوئی اور نہ وہ شرمناک ناول لکھا گیا۔

غرض میں نے اپنے تجربہ سے ان کو ہر موقع پر راست باز اور نہایت ہی شریف النفس پایا اور اس اصول پر وہ ایسی استقامت کے ساتھ قائم ہیں کہ دولت۔حکومت۔عزت اور کسی چیز کا لالچ یا شوق ان کے قدم کو لغزش نہیں دے سکتا۔کذب و دروغ میں نہیں وہ ہر قسم کی بد اخلاقیوں اور بد وصفیوں سے سخت متنفر ہیں اور جن لوگوں میں ایسی خرابیاں سنیں اپنی صحبت کو ان سے بچایا۔

غور سے دیکھئے تو اُن کی زندگی اعلیٰ درجے کے حکیموں اور فلسفیوں کی ہے۔ہر نیک نفس اور خوش اطوار شخص چاہے کتنا ہی غیر ہو اُن کا عزیز قریب اور دوست ہے اور ہر بد کار و بد نفس آدمی چاہے اُن کا کتنا ہی قریب کا عزیز ہو غیر ہے۔یہ وہ اُصول ہے جس کو اگر ان کی زندگی کا ماٹو کہا جاے تو غلط نہیں ہو سکتا۔

اپنے چھوٹے بھائی مولوی سید علی مرحوم کو اُنھوں نے بیٹوں کی طرح پالا۔سکھایا پڑھایا اور علم و فضل میں سرآمد روزگار بنا دیا مگر چونکہ اُنھوں نے بعض سیاسی پارٹیوں میں شریک ہوکر سازش اور انٹریگ کو گوارا کر لیا تھا لہذا اُن سے ملنا چھوڑ دیا۔اور اُن کی نظر میں وہ غیروں سے

بھی بدتر تھے- میرے سامنے کا ذکر ہے کہ ایک بار مولوی سیدعلی مرحوم سخت بیمار ہوے مگر نواب عمادالملک بہادر باوجودیکہ میں نے اور اُن کے کئی احباب نے بار بار اصرار کیا ان کی عیادت کو نہ جانا تھا نہ گئے—

مذہباً نواب عمادالملک بہادر ایک آزاد خیال مسلمان ہیں- دینی احکام و عقائد کو تقلیداً نہیں بلکہ فلسفیانہ توجیہ و استدلال کے ساتھہ مانتے ہیں- اور گو کہ عبادات میں پابند دین نہیں نظر آتے مگر اعتقاداً اسلام کو سچا اور برگزیدہ دین مانتے ہیں- اُنہیں سب سے زیادہ وثوق مسئلہ وحدت وجود پرہے میں نے ایک بار اُن سے اس مسئلے میں بحث کی تو فرمایا "اور کسی حیثیت سے میں خدا کو مان ہی نہیں سکتا"—

مگر یہ اعتقادات و خیالات فقط اُن کے دل ودماغ تک محدود ہیں- اس کو بالکل پسند نہیں کرتے کہ مختلف فیہ مسائل میں کسی سے بحث کریں یا اعتقاد کے اختلاف کی بنا پر کسی سے نفرت یا مخالفت کریں- ان کے اعتقادی مسائل کا کوئی اثرباہمی تعلقات پر نہیں پڑتا- اُن کی بے توجہی کی یہ شان ہے کہ اگرچہ راسخ‌العقیدہ مسلمان ہیں مگر انگریزوں اور مسیحوں کی بہت سی اخلاقی باتوں کو پسند کرتے ہیں- بلکہ اُن کو اخلاقاً سب سے زیادہ شائستہ مانتے ہیں- ہندوں پر نہایت مہربان ہیں- اور اُن کے قدیم روحانی فلسفہ کا بہت زیادہ احترام کرتے ہیں—

اگرچہ شیعہ ہیں مگر سنی علما اور حنفی فضلا کا ویسا ہی ادب و احترام کرتے ہیں جیسا شیعہ مجتہدین کا- مولوی شبلی نعمانی مرحوم مجھہ سے کہتے تھے کہ "میں نے الفاروق کو شایع کیا تو اس کا ایک نسخہ نواب عمادالملک بہادر کی خدمت میں بھیجا اور خواہش کی کہ اس کی نسبت آپ اپنے خیالات ظاہر فرمائیں- اس کے جواب میں انھوں نے تحریر فرمایا کہ گزشتہ تیرہ سو برس میں صرف ایک شخص پیدا ہوا جس کا نام عمر بن‌الخطاب ہے لہذا اُن کی لائف

لکھنا اسلام کی خدمت تھی جس کو آپ نے ادا کیا ،، مگر خود مجھ سے اُن سے جب گفتگو ہوتی تو میں نے اُن کا یہ خیال پایا کہ حضرت عمر میں سختی اور درشتی زیادہ تھی - اور اگرچہ میں نے اُن کو وہ درشتی خلیفہ ہونے کے بعد نرمی سے بدل گئی تھی مگر اس کو انھوں نے نہیں مانا —

حیدرآباد کے مدرسہ دارالعلوم کی اعلیٰ مدرسی و مہتممی کی جگہ خالی ہوئی تو اُس پر نواب عمادالملک نے مولوی محمد الہی بخش صاحب کو مقرر کیا معین المہام تعلیمات نواب فخرالملک بہادر نے اس سے اختلاف کر کے ایک شیعہ عالم کو اس جگہ کے لیے نامزد کیا - اور مدارالمہام بہادر نے بھی اس سے اتفاق کر لیا - جب یہ حکم تعمیل کے لیے عمادالملک بہادر کے پاس آیا تو اُنھوں نے اس سے سختی کے ساتھ اختلاف کیا - اور کہا کہ یہ مدرسہ مدت سے خاص اہل سنت کے زیر انتظام و تعلیم چلا آتا ہے جس میں اہل سنت کے دینیات کی تعلیم ہوتی ہے لہذا اس خدمت پر کسی شیعہ کا تقرر نہیں ہوسکتا - نواب فخرالملک بہادر نے پھر اپنی رائے پر اصرار کیا اور تحریر فرمایا کہ اس بے تعصبی کے عہد میں ایسی تفریق نہ ہونی چاہئیے - مگر نواب مدارالمہام پر وقارالامرا بہادر نے اپنی پہلی رائے بدل کے عمادالملک بہادر کی رائے سے اتفاق کر لیا - اور مولوی الہی بخش صاحب مقرر ہو گئے —

یہی بے تعصبی اُن سے ہمیشہ ظاہر ہوتی رہی - اور سب جانتے ہیں کہ محکمہ تعلیمات دولت آصفیہ ایک مدت دراز تک اُن کے ہاتھ میں رہا - لیکن کبھی کسی شخص کو محسوس بھی نہ ہوسکا کہ ناظم تعلیمات ایک شیعہ شخص ہے - اُنھوں نے ہمیشہ غیر جانب داری سے کام لیا - اور وطنی و غیر وطنی سنیوں کو ویسا ہی خوش اور مطمئن رکھا جیسا کہ شیعوں کو —

الغرض نواب عمادالملک بہادر کی ذات غیر معمولی صفات سے آراستہ اور خدا کی ایک بےنظیر نعمت و برکت ہے اور وہ رعایائے نظام و ہندوستان کے عام

لوگوں کے هر گروہ اور هر طبقے میں هر دلعزیز اور واجب الاحترام هیں—

لهذا مسلمان بلکه تمام اهل هند اگر اُن کی درازی عمر پر خوشیاں منائیں اور ایک دوسرے کو مبارک باد دیں تو نهایت هی مناسب بالکه اپنے ایک ضروری فرض کا بجالانا هے—
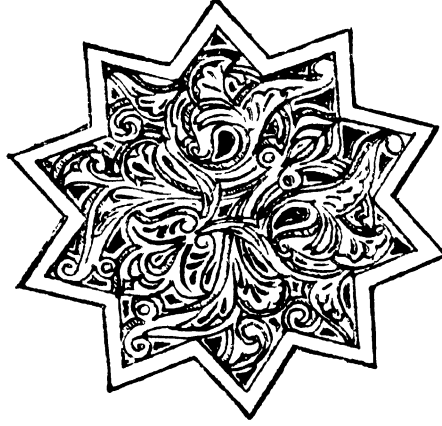
عرب کی شاعری

از

(جناب مولانا وحیدالدین سلیم پروفیسر عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد دکن)

تمہـــــــید

ایک مشہور مقولہ ھے کہ "الشعر دیوان العرب" یعنی عرب کی شاعری عرب کا دفتر ھے-دفتر کے لفظ سے یہ مراد ھے کہ اُس میں عرب کا جغرافیہ-عرب کی تاریخ-عرب کا تمدن-عرب کا طریقۂ معاشرت-عرب کے خیالات و توهمات-عرب کی ملکی اور قومی خصوصیات سب کچھہ ھے-اگر کوئی شخص عرب کی شاعری کا مطالعہ کرے تو کوئی بات عرب اور اھل عرب کے متعلق ایسی نہیں ھے جو اس میں نہ مل سکے-میں عرب کی شاعری کو اسی نقطۂ نظر سے دیکھنا چاھتا ھوں-اس کے ساتھہ ھی یہ بتا دینا چاھتا ھوں کہ ادائے خیالات کے کیا طریقے عربی شاعری میں تھے—

میں نے اس غرض کے لئے ایام جاھلیت کی شاعری پر نظر ڈالی ھے-ظہور اسلام کے بعد اوایل بنی اُمیہ کی شاعری کو بھی شامل کر لیا ھے-ایام جاھلیت کی شاعری کا خالص عربی رنگ ھے اور وہ فی الواقع عرب کے تمام حالات و خیالات کا آئینہ ھے-اوایل عہد بنی اُمیہ تک بھی کچھہ اصلی خصایص عربی شاعری کے باقی رھے-مگر دولت عباسیہ کے زمانے میں اُس پر عجمیت غالب آگئی اور شاعری کا خالص عربی رنگ نہیں رھا-اگرچہ اس زمانے کی شاعری اُس زمانے کے عربوں کے انقلاب حالت کی تصویر ھے-مگر میں نے اُس کو اپنے موضوع

سے خارج کر دیا ہے۔میں یہ سب کچھہ اپنی محبوب زبان اُردو میں لکھنا چاھتا ھوں۔اصل عربی اشعار اس مضمون میں نہیں لکھوں گا۔اس کی دو وجہیں ھیں—

ایک تو یہ کہ بیچ بیچ میں غیر زبان کے اقتباسات لانے سے مضمون کی روانی میں فرق آ جاتا ھے اور پڑھنے والے اس کو دلچسپی کے ساتھہ نہیں پڑھتے—

دوسرے یہ کہ اھل یورپ کی طرح میری دلی خواھش یہ ھے کہ غیر زبانوں کے ادبیات کے متعلق جو کچھہ لکھا جاے وہ اپنی ھی مادری زبان میں ھو۔تاکہ ھمارا ادب وسیع ھو اور ترقی حاصل کرے۔اگر غیر زبانوں کے حاصل کرنے والے اُن کے تمام ادبی ذخیروں کو ھماری زبان کے ادب میں بھر دیں تو گھر بیٹھے ھم دنیا کے اعلیٰ اور لطیف خیالات پر عبور حاصل کر سکیں گے۔دنیا کی ھر قدیم و جدید زبان کے اعلیٰ شاعروں اور ادیبوں کے شہپارے اُردو زبان میں بھر دینے چاھئیں۔تا کہ زمانۂ حال کے انشا پردازوں اور شاعروں کو مدد ملے اور ایک محدود دایرہ سے نکل کر آگے بڑھنے کے رستے اُن کو نظر آنے لگیں۔اگر ایسا نہ کیا جاے تو نہ ھمارا ادب کبھی ترقی کرے گا اور نہ اُس میں وسعت اور گہرائی پیدا ھو گی—

ایک اور بات بھی ھے جس کی وجہ سے ایسے مضامین تحریر کرنے کی ضرورت پیش آئی ھے۔اگر ھمارے نوجوان انشا پرداز اور شاعر جو غیر زبانوں کے ادب سے نا بلد ھیں یہ معلوم کریں گے کہ ھر ملک کا ادب اُس ملک کی قومی اور ملکی خصوصیات کا آئینہ ھے۔پھر اپنی شاعری اور انشا پردازی پر نظر ڈالیں گے تو اُن کو صاف دکھائی دے گا کہ اِس میں اِس ملک کی خصوصیات کا کوئی پتہ نہیں ھے۔ھماری ساری شاعری اور ساری انشا پردازی بیرونی ادب کی نقالی ھے اور اس میں ھر چیز باھر سے لائی گئی ھے۔کیا یہ

شرم و عبرت کا مقام نہیں ھے؟ کیا اس نقص کے معلوم ھونے کے بعد ھم کو اپنے ادب کی اس کھلی کمزوری کی تلافی نہیں کرنی چاھئیے؟ کیا زمانۂ سابق کی طرح آئندہ بھی ھم کو صرف بیرونی ادب کی نقالی پر قناعت کرنا لازم ھے؟ کیا ابھی وقت نہیں آیا کہ ھم اپنی زبان کے ادب میں انقلاب پیدا کریں اور اُس کو ایک ملکی ادب بنانے کی کوشش میں سر گرم نہ ھوں؟ اگر یہ ضرورت مسلم ھے تو پھر ایسے مضامین ھی اھل فکر و بصیرت کے لئے تحریک و ترغیب کا باعث ھوں گے —

شاعری کے موضوع

عرب کی شاعری کے اھم موضوع حسب ذیل ھیں:—

۱ - بہادری کے جذبات

۲ - اخلاقی جذبات

۳ - عاشقانہ جذبات

۴ - مدح و ذم

۵ - غم کے جذبات

اِن میں سے ھر موضوع پر جو کچھہ عرب شعرا نے کہا ھے وہ اُن کے دلی خیالات اور اصلی حالات کا آئینہ ھے - وہ جو کچھہ کہتے ھیں وھی کر دکھاتے ھیں - اُن کی شاعری اصلی اور حقیقی شاعری ھے - اپنے عیب و صواب سب کھول کر رکھہ دئے ھیں - کوئی بات ڈھکی چھپی نہیں رکھی - اُن کی زبان اُن کی دلی واردات کی ترجمان ھے - اُن کی شیخیاں جھوٹی شیخیاں نہیں ھیں - اُن کے کارنامے اُن کی نیتوں کے گواہ ھیں - وہ اگر کسی کی مدح کرتے ھیں تو صرف اُس کی جس کے قول اور فعل میں مطابقت ھے اور جس کی ذات میں فی الواقع وہ خوبیاں موجود ھیں جن کا ذکر مدح میں کیا گیا ھے - اگر کسی کے مرنے پر آنسو بہاتے اور اُس کے اوصاف بیان کرتے ھیں تو وہ درحقیقت

ایسا هی شخص هوتا هے جس کا وجود خیر و برکت کا باعث تھا-جھوٹی مدح وہ کبھی نہیں کرتے-جھوٹے آنسو وہ کبھی نہیں بہاتے-اُن کی زبان اور اُن کے دل دونوں ایک دوسرے کی تصدیق کرتے هیں —

یہاں مثال کے طور پر چند نمونے عربی شاعری کے پیش کئے جاتے هیں جن سے ناظرین کو اندازہ هو گا کہ اُن میں کس قدر سچائی اور اصلیت کی جھلک هے اور اهل عرب کی بیرونی اور اندرونی کیفیات کا صحیح نقشہ اُن میں کس طرح کھینچ کر رکھا گیا هے —

فخریہ اشعار

اے هیضم کے دونوں بیٹو! کیا تم نے عزم و همت کے وقت میری تدبیر کو سست پایا؟ میں نے دنیا کے بہت سے واقعات کا امتحان کیا هے اور واقعات نے میرا امتحان کیا هے-گویا کہ میں گزری هوئی قوموں کا آدمی هوں-هم ایسی ماں کے بیٹے نہیں هیں جس کی چھاتیاں چھوٹی هوں اور اُن کا دودھ منقطع هو گیا هو اور وہ صرف ایک هی دفعہ جنی هو-هم ایسی صاحب نصیب عورت کی اولاد هیں جس نے حوض ولادت سے مکرر پانی پیا هے اور جس نے مکرر اولاد پیدا کی هے-زمین کا اندا شق هوا اور هم اُس میں سے نکل پڑے-اب هم زمین کے سخت حصے اور ریگستانی حصے کے فرزند هیں-همارے قبضے میں اجاء اور سلمی کے پہاڑی قلعے هیں اور دونوں قلعوں کی مشرقی زمین بھی همارے پاس هے-قلعۂ تیماء کے مالک بھی همیں هیں-جو قوم عاد کے زمانے سے همارے قبضے میں هے اور هم نے اپنے برچھوں کے زور سے اُس کو بچایا هے (قبیصہ بن جابر) —

هم هنشل کے پوتے هیں اور اس پر فخر کرتے هیں اور همارا دادا هم پر فخرکرتا هے-عزت اور برتری کی کسی حد تک گھوڑے دوڑائے جائیں-

سب سے آگے بڑھنے والے جب پاؤگے بنی هیشل هی کے گھوڑے پاؤگے-هم میں سے کوئی سردار جب تک که کوئی لڑکا اپنا جانشین بننے کے لائق نہیں چھوڑ تا دنیا سے نہیں اُٹھتا-لڑائی کے دن هم اپنی جانیں سستی کر دیتے هیں-مگر امن کے زمانے میں اگر اُن کی قیمت پوچھئے تو وہ انمول هیں-هماری مانگوں کے بال خوشبوؤں کے استعمال سے سفید هیں-هماری دیگیں مہمانوں کے لئے گرم هیں-همارا مال همارے مقتولوں کے خونبہا کے لئے وقف هے-میں اُس قوم میں سے هوں جس کے بزرگوں نے دشمنوں کے اتنے کہنے پر که "کہاں هیں قوم کے حمایتی" اپنے کو نیست و نابود کر دیا تھا-اگر هزار میں همارا ایک موجود هو تو بھی جب یہ کہا جائے گا که "کون هے شہسوار" تو اُس کی اپنے هی پر نگاہ پڑے گی—

(بشامه بن حزن)

اگر انسان کی عزت پر بخل کا داغ نه هو تو پھر وہ جو لباس پہنے اس کے بدن پر کھلتا اور زیب دیتا هے-اگر انسان اپنے تئیں بخل کے جذبات سے نه روکے تو پھر مدح و ستائش کا رسته اُسے نہیں ملتا-وہ عورت هم پر الزام لگاتی هے که هماری تعداد تھوڑی هے-میں نے جواب دیا که شریف انسان دنیا میں تھوڑے هی هوتے هیں-وہ قوم کم نہیں سمجھی جائیگی جس کی یادگار هم جیسے بلند مرتبه نوجوان اور ادھیڑ عمر کے هوں-تعداد کی کمی همیں کیا نقصان پہنچا سکتی هے-جب که همارے همسایے طاقتور هیں-حالانکه اوروں کے همسایے ذلیل هوتے هیں هم ایک ایسے بلند پہاڑ کے مالک هیں جس کی طرف اگر نظر اُٹھائی جائے تو وہ تھک کر واپس آجاتی هے-هم جس کو چاهیں اس پر پناہ لینے کی اجازت دیتے هیں-اس پہاڑ کی جڑ تحت الثری میں هے اور اس کی چوٹی لمبی اور اس قدر بلند هے که وهاں تک کوئی نہیں پہنچ سکتا-هم وہ قوم هیں که جنگ میں مارے جانے کو عیب نہیں جانتے-حالانکه بنی عامر اور نبی سلول ایسا هی جانتے هیں-

ہم موت کو پسند کرتے ھیں۔اس لئے ھماری عمریں کوتاہ ھیں۔مگر وہ موت سے بھاگتے ھیں اس لئے اُن کی زندگی اکثر دراز ھوتی ھے۔ھمارا کوئی سردار بچھونے پر پڑکر نہیں مرا۔ھماری قوم کا کوئی ایسا مقتول نہیں ھے جس کا انتقام یا خون بہا نہ لیا گیا ھو۔ھمارے خون بس تلواروں کی دھاروں ھی پر بہتے ھیں۔ھم نسل میں خالص اور غیر مکدر ھیں۔ماؤں اور باپوں نے ھمارے نسب کو خالص اور محفوظ رکھا ھے۔ھم لطافت اور صفائی میں آب باران کے مانند ھیں۔ نہ ھم میں کوئی بخیل ھے، نہ کند ذھن۔اگر چاھیں تو اوروں کی بات کہیں تو پھر کسی کو انکار کی مجال نہیں ھوتی۔اگر ھمارا کوئی سردار مرتا ھے تو اس کا جانشیں ایک ایسا ھی سردار ھوتا ھے جس کا دل اور زبان شریفوں کی طرح ایک ھو۔رات کے آنے والے مہمانوں کے لئے ھماری آگ کبھی نہیں کُھی اور نہ کسی مہمان نے کبھی ھماری شکایت کی۔دشمنوں کے ساتھ جو معرکے ھمیں پیش آئے وہ نہایت درخشاں اور نمایاں ھیں۔ھماری تلواریں مغرب و مشرق میں مشہور ھیں اور زرہ پوشوں پر بار بار پڑنے سے اُن میں دندانے پڑگئے ھیں۔ھماری تلواروں کی عادت ھے کہ جب تک ایک جماعت کا ستھراؤ نہ ھو لے اور وہ اچھی طرح لہو نہ چاٹ لیں میانوں میں نہیں جاتیں۔اگر تمھیں ھمارا حال معلوم نہ ھو تو دنیا کے لوگوں سے پوچھ لو۔اس لئے کہ نبی دیان اپنی قوم کے لئے بمنزلہ قطب کے ھیں اور قوم کے سارے معاملات کی چکیاں اسی قطب کے گرد گھومتی اور چلتی رھتی ھیں—

(سموءل بن عادیا)

شجاعت اور بزدلی کی تصویریں

اگر میں بنی مازن میں سے ھوتا تو مجال نہ تھی کہ میرے اونٹ آل ذھل کے غارت گر لوٹ کر لے جاتے۔اگر میں بنی مازن میں سے ھوتا تو میری حمایت پر ایک ایسی قوم کمر بستہ ھوتی جو غیرت اور غصہ کے وقت سخت ھے گو کہ

بزدل آدمی اُس وقت نرم اور سست پڑ جاتے ھیں-بنی مازن وہ قوم ھے کہ جب لڑائی درندہ کی طرح اپنی ڈاڑھیں یا کُچلیاں نکال کر ڈراتی ھے تو یہ اکیلے اور اکٹھے اُس پر ٹوٹ پڑتے ھیں-وہ طالب حمایت سے کوئی دلیل نہیں پوچھتے اور فوراً اُس کی حمایت کے لئے دوڑ پڑتے ھیں-مگر میری قوم باوجود کثرت کے اس قابل نہیں ھے کہ تھوڑی سی مصیبت میں بھی لڑنے پر کمر بستہ ھو-اگر کوئی ظالم ان پر ظلم کرے تو وہ بزدلی کے سبب اُس کو معاف کر دیتے ھیں- اور اگر کوئی اُن کے ساتھہ بدی سے پیش آئے تو وہ نیکی کرنے پر تلے رھتے ھیں- گویا خدا نے اُن کے سوا کوئی ایسی قوم دنیا میں پیدا نہیں کی جس کے دل میں خوف خدا ھو-کاش مجھے اس قوم کے بدلے کوئی اور ایسی قوم مل جائے کہ جب وہ گھوڑوں یا اونٹوں پر سوار ھو تو خوب غارت گری کرے—

(قریط بن اُنیف)

ایک سو نو برس کے بڑھے عرب کے جذبات

اگر میں بہت بوڑھا ھوگیا ھوں تو کیا مضایقہ ھے-میں مدت تک جوان رہ چکا ھوں-میری پیدائش کے دن سے ایک سو نو برس گذر چکے ھیں جن کو میں نے لباس کی طرح اُتار پھینکا ھے-میں سواروں کے بہت سے رسالے مرتب کر چکا ھوں جو لووں کی ٹکڑیوں کی طرح ایک جگہ آکر جمع ھوتے تھے-وہ ایک ایسی گھٹا تھی جس میں موت بجلی کی طرح چمکتی تھی-میں نے ان سواروں کے ساتھہ لوٹ مار کی ھے اور بہت سے مزے اُڑاے ھیں-مگر دنیا کے تمام مزے چند روزہ ھیں-میں نے جنگ پھیما کے دن بہت سی عورتیں کو دیکھا جو مارے خوف کے مونھہ کے بل گری پڑتی تھیں-انھیں میں سے ایک عورت خوف کے سبب پیاسی دکھائی دی-اُس کا گلا گھٹا جاتا تھا-وہ بول نہیں سکتی تھی-اُس کی آنکھوں سے متواتر آنسو بہ رھے تھے-جب میں نے اُس کے شوھر کو قتل کردیا تو کھنے لگی کہ اے مجمع تو ھلاک ھر جیسا کہ تونے مجھے ھلاک کیا ھے-میں نے کہا-میں نہیں-

بلکہ اے اُم مجاشع! تو اور تیری قوم ہلاک ہوئی ہے۔میں نے اس عورت کے شوہر کو ایک ایسے لمبے اور چمکدار نیزہ سے قتل کیا تھا کہ جب وہ ہلایا جاتا ہے تو اُس سے آگ کے شعلے لپکتے ہیں۔اس کے سوا اور بہت سی عزت دار عورتیں تھیں جن کو میں نے ایسے حال میں چھوڑا کہ اُن کے مونھہ پر خراش تھی۔وہ غمگیں تھیں اور زار زار روتی تھیں—

(مجمع بن ہلال)

فوج کشی کا سماں

ہم جب لڑائی پر کمر بستہ ہوتے ہیں تو ایسی فوج ساتھہ لیکر چلتے ہیں جس کے اطراف میں ابلق گھوڑے غایب ہوجائیں۔جس کا پچھلا حصہ مدینہ میں اور اگلا حصہ دمشق میں ہوتا ہے۔جب ہم مشرق اور مغرب کے درمیان چلتے ہیں تو جاگتی اور سوتی زمین لرزنے لگتی ہے۔یعنی وہ زمین جس پر لوگ چلتے ہیں اور وہ زمین جس پر لوگ نہیں چلتے ہیں یکساں طور سے زلزلہ میں آجاتی ہے—

(ابان بن عبدہ)

نشے کی ترنگ

میں نے چھوٹے اور بڑے پیالوں میں شراب ڈالکر پی ہے۔جب میں نشے میں ہوتا ہوں تو اپنے تئیں پادشاہ نعمان کے شاندار محلات خورنق اور سدیر کا مالک سمجھتا ہوں۔مگر جب ہوش میں آتا ہوں تو پھر وہی بکریوں اور اونٹوں والا ہوتا ہوں جو پہلے تھا—

(منخل بن حارث لشکری)

غم کے جذبات

قیس کا مرنا ایک شخص کا مرنا نہیں ہے۔بلکہ وہ ایک قوم کی بنیاد تھا۔ جو گر گئی اور اس سبب سے وہ قوم بھی گر گئی—

(عبدہ بن طبیب)

میرے ایک دوست نے قبروں کے پاس رونے سے مجھکو ملامت کی اور کہا کیا تو ہر قبر کو دیکھکر روئے گا۔حالانکہ تو جس قبر کے خیال میں ہے وہ لوی اور دکادک کے درمیان واقع ہے-میں نے کہا-ایک غم دوسرے کو اُکساتا ہے- میرے حال پر چھوڑ دے-میرے نزدیک تو یہ سب قبریں میرے بھائی مالک ہی کی ہیں—

(متمم بن تو بیرہ)

وہ لوگ جو اُس کو قبر کی طرف لے گئے نہیں جانتے کہ انھوں نے کس چیز کو بے پروائی سے کفن میں لپیٹ دیا ہے—

(محمد بن بشیر خارجی)

میں نہیں جانتا تھا کہ لوگوں پر اس کی فیاضی کا کس قدر احسان ہے- یہاں تک کہ اس کو پتھروں کی سلوں نے اپنے اندر چھپا لیا-وہ مرکر زمیں کی ایک تنگ جگہ میں سما گیا-حالانکہ جب وہ زندہ تھا تو (فوج کی کثرت کے سبب) بڑے بڑے میدانوں میں بھی نہیں سما تا تھا-اب میں تیرے مر جانے کے بعد کسی بڑی سے بڑی مصیبت سے بھی گھبرانے والا نہیں ہوں—

(اشجع سلمی)

اے معن کی قبر! تو نے اُس کی فیاضی کو اپنے اندر کیوں چھپا لیا-حالانکہ جب وہ زندہ تھا تو اس کی فیاضی سے زمین کی خشکی اور تری سب بھر گئی تھی-ہاں بے شک فیاضی خود مرگئی ہے-اس لئے وہ تیرے اندر سما سکی اور اگر وہ زندہ ہوتی تو اس کے سبب تو پھٹ جاتی-وہ ایسا جواں مرد تھا کہ مرنے کے بعد بھی لوگ اُس کی فیاضی سے زندہ ہیں-جس طرح سیل کے گذرنے کے بعد زمین سر سبز و شاداب ہو جاتی ہے-سچ یہ ہے کہ معن کے مرنے سے سخاوت بھی مرگئی اور اُس کا خاتمہ ہو گیا اور انسانی کمالات اور خوبیوں کی ناک کٹ گئی—

(حسین بن مطہر اسدی)

مرحوم کے احسانات نے مرحوم کو دوبارا زندہ کر دیا ہے جب وہ احسان زندہ ہیں تو گویا وہ خود دوبارہ زندہ ہوگیا ہے۔ قبر کی زمین کا طول چار گز ہے اور عرض پانچ بالشت پھر تعجب ہے کہ اس میں ایک بلند پہاڑ کیونکر سما گیا — (عبداللہ ابن ایوب)

اے میری نادان گھروالی! تو اس اونٹ کے جاتے رہنے پر کیوں غم کرتی اور روتی ہے جس کو بیچ کر میں نے شرب پی لی ہے؟ خدا کرے تیرے آنسو کبھی نہ تھمیں آخر زیدالفوارس اور زیدااللات پر کیوں نہیں روتی اور بنی نضر کے دو گزرے ہوے نامور اشخاص کی موت پر کیوں آنسو نہیں بہاتی؟ اُن نامور اور فیاض لوگوں نے مر کر زمانے کو مجھہ پر چھوڑ دیا ہے اور میں اب زمانے کے حملوں کا نشانہ بنا ہوا ہوں —

(خراز بن عمرو)

سچی تعریف کا جذبہ

ہشام بن عبدالملک ایک بار حج کے لئے گیا۔ اُس نے سنگ اسود کو بوسہ دینے کے لئے بھیڑ کو چیر کر آگے بڑھنا چاہا مگر ممکن نہ ہوا۔ اس اثنا میں امام زین العابدین تشریف لاے اُن کے آتے ہی بھیڑ چھٹ گئی اور وہ آسانی سے سنگ اسود تک پہنچ گئے۔ ہشام نے جان بوجھکر سرداران شام سے جو اُس کے ساتھہ تھے پوچھا کہ یہ کون شخص ہے۔ اُس وقت فرزدق شاعر موجود تھا۔ اُس نے چند مدحیہ اشعار امام کی شان میں پڑھے اور ہشام کو بتایا کہ وہ کون ہیں۔ اشعار کا مضمون حسب ذیل تھا —

یہ وہ ہے جس کے قدموں کے نشان کو بطحا کی زمین پہچانتی ہے۔ کعبہ پہچانتا ہے اور حل و حرم بھی پہچانتے ہیں۔ یہ اُس شخص کا فرزند ہے جو خدا کے بندوں میں سب سے بہتر اور برتر تھا۔ یہ نامور شخص پاک و صاف اور متقی اور پرہیزگار ہے۔ جب قریش اُس کو دیکھتے ہیں تو کہتے ہیں کہ

بزرگی اور شرافت کا خاتمہ اسی شخص کی ذات پر ھے-جب وہ سنگ اسود کو بوسہ دینے کے لئے بڑھا تو قریب تھا کہ وہ اُس کے ھاتھہ کو پہچاننے کے سبب اُس کو روک لے اور اُس سے برکت حاصل کرے-قبایل عرب میں سے کون قبیلہ ھے جس کی گردن پر اس شخص کے بزرگوں کے احسانات نہ ھوں-اُس کے ھاتھہ میں ایک چھڑی ھے جس کی خوشبو ھر طرف پھیل رھی ھے-کیونکہ وہ ایک ایسے شخص کے پاس ھے جو حسین و جمیل بھی ھے اور بلند مرتبہ بھی-وہ شرم و حیا کے سبب آنکھیں جھکاے رھتا ھے اور لوگ اُس کے رعب سے آنکھیں نیچی رکھتے ھیں-کسی کی مجال اُس سے بات کرنے کی نہیں ھوتی مگر جب کہ حسن اتفاق سے وہ مسکراے-اُس نے کلمۂ شہادت کے سوا کبھی لا (نہیں) نہیں کہا-اگر کلمۂ شہادت نہ ھوتا تو اُس کا لا (نہیں) نعم ھاں) سے بدل جاتا—

(فرزدق)

مختلف مدحیہ اشعار

وہ میدان جنگ میں ایسے اطمینان سے چلتے ھیں جیسے شیر زور کی بارش میں حرارت مزاج کے سبب چلتے ھیں—

جب بنی قیس اور اُن کے ساتھی بنی ذھل دریاے ذخار کی طرح جوش میں آجاتے ھیں تو مثل بڑے دریاؤں کے ھوتے ھیں-جن میں اور بڑے دریا آ ملیں—

لطیف اخلاق روحیں ھیں اور آل مہلب اُن روحوں کے لئے اجسام ھیں—

تو اُن کی عزت دوسروں کو نہیں دے سکتا جب تک کہ کوہ یسوم کو معہ اُس کی پہاڑیوں کے اُس کی جگہ سے اُٹھا کر دوسری جگہ نہ رکھہ دے (یعنی یہ بات نا ممکن ھے)—

وہ اپنے ارادوں کے پورا کرنے میں اور قد کی درازی اور گردنوں کی لمبائی میں تلواروں سے تشبیہ دے جاتے ھیں—

زیاد کے دونوں بیٹے دو سید ھے گندم گوں خطی نیزے تھے۔ زمین اُن کے چلنے سے نیچے کو دبی جاتی تھی۔اے مخالف! تو ایسے ھی لوگوں کے بھروسے پر کسی قوم سے لڑ سکتا یا صلح کر سکتا ھے —

وہ شخص تلوار کے مانند ھے کہ اگر تو اُس کو نرمی سے چھوے تو نرم معلوم ھوتی ھے اور اگر اُس کو سختی سے چھوے تو پھر اُس کی دونوں دھاریں تیز ھیں —

لوگ اُس کے سامنے ایسے خاموش بیٹھتے تھے کہ گویا اُن کے سروں پر پرندے ھیں کہ اگر ذرا سر ھلائیں تو پھر سے اُڑ جائیں (رعب کی تصویر ھے) —

هجویہ اشعار

تم ایسے ابر ھو جس میں خوفناک گرج ھے۔جس کے ساتھ تند ھوا ھے جو سنگ ریزے اُڑاتی اور خیموں کی رسیاں کاٹ دیتی ھے۔مگر وہ برستا کبھی نہیں —

تمھاری اونٹنیاں موٹی ھیں یعنی تم بخیل اور نامرد ھو نہ مہمانوں کے لیے اُن کو ذبح کرتے ھو اور نہ اُن پر سوار ھو کر میدان جنگ کو جاتے ھو —

وہ جب کھانا کھاتے ھیں تو آھستہ بولتے ھیں (تا کہ کوئی مسکین آواز نہ سنے) اور اپنے گھر کے بند دروازے سے عہد لے لیتے ھیں کہ جب تک ھم کھانا کھائیں کسی کے کھولنے سے مت کھلیو —

اگر میں تمھارے دروازے پر شراب لے آتا تو تمھارا کتا مجھے صاحب خانہ خیال کرتا اور نہ بھونکتا (یعنی تم شرابی ھو اور تمھارا کتا اُس کی بو سے مانوس ھے) مگر میں جب تمھارے پاس آیا تو مشک اور عود کی خوشبو میرے کپڑوں میں بسی ھوئی تھی (اسی لئے تمھارا کتا چوکنا ھوا اور اُس نے اِس بو کو آجنبی سمجھا —

وہ گفتگو کی قدرت نہ ھونے کے سبب اپنے تالو کو زبان سے چاٹنے لگتا

اور اُس کے دل کا ابر کبھی نہیں کھلتا (یعنے ہمیشہ شک و تردد کی حالت میں رہتا ہے) —

عاشقانہ جذبات

اے خدا کے بندو! کیا سچ مچ جب تک کہ بھورے ہرن اپنی دمیں ہلاتے رہینگے میں بریدہ سے نہ مل سکوں گا —

جب اُس محبوب کی اونٹنی صبح کو روانہ ہوگئی تو میں نے اپنی اونٹنی کو اُس کے پیچھے ہنکایا حالانکہ اُس کے پاؤں بندھے ہوے تھے (یہ بیخودی کا عالم ہے)

نازنینوں کے شوق سے ہمارے دل اس طرح اہتزاز حاصل کرتے ہیں جیسے خیری کے پھول شبنم سے —

زمانے کی گردش نے اگر مجھے اُم عمرو پر کبھی قدرت دی تو پھر میں زمانے کا قصور معاف نہ کروں گا —

جب ہمارے قافلے کے اونٹ ہمیں شام کی طرف لے جارہے تھے تو یکایک آدھی رات کے وقت تیرا خیال آیا اور میں شام کی طرف ایک قدم نہ چل سکا میں نے تیرے خیال کو لبیک کہا اور حدی خوانوں سے کہا کہ اونٹوں کو حجاز کی طرف واپس چلاؤ۔اب شام کی طرف کوچ کرنے کی حاجت نہیں —

تاریک رات کی سردی میں جب کوہ جودی کے پہلوؤں پر بادل سے کچھ پانی برسا ہو اور شمال کی ہوا نے اس کو یخ کر دیا ہو تو وہ پانی میری محبوبہ کے آب دہن سے اچھا نہیں ہو سکتا۔اگرچہ میں نے اس کا مزا نہیں چکھا۔ مگر جس چیز کو میری آنکھہ دیکھتی ہے میں اُس خوب پہچانتا ہوں —

اے نجد کی ہوا! تو کب چلی۔تیرے جھوکوں نے مجھہ پر عشق کی تہیں چڑھا دیں۔جب چاشت کے وقت درخت اند کی تر و تازہ شاخ پر ایک کبوتری بولی تو اُس کی آواز سن کر میں بچوں کی طرح رونے لگا اور وہ بھید جو

میرے دل میں مدت سے چھپا ہوا تھا یکایک فاش ہو گیا—

تونے مجھے اپنے پاس بلایا اور ایسے نرم و شیریں کلام سے جو وحشی بکریوں کو بھی پہاڑوں کی چوٹیوں سے میدانوں میں اُتار لاے-یعنی وحشیوں کو رام کر لے مجھ پر قبضہ کر لیا-پھر تو مجھ سے دور بھاگ گئی اور تونے میری پسلیوں میں آگ لگا دی—

اے محبوبہ! تو بان کے سبز درخت سے پوچھ جو ریت کے ایک ٹیلے پر کھڑا ہے-کیا میں نے تیری قیام گاہ کے کھنڈروں کو سلام نہیں کیا؟ کیا میں اُن کھنڈروں کے پاس شام کو دیر تک غمگین کھڑا نہیں رہا؟ کیا میری آنکھوں نے وہاں صبح کے وقت اس طرح آنسو نہیں بہاے کہ گویا موتیوں کی ایک لڑی ٹوٹ گئی ہے اور اُس کے موتی لگاتار گر رہے ہیں؟ لوگ موسم بہار کی آرزو کرتے ہیں مگر میرے لئے موسم بہار تیرا وصال ہے-میں دنیا کو دیکھتا ہوں کہ وہ قحط کے نام سے کانپتی ہے مگر میرے لئے قحط تیرا کوچ کر جانا اور جدائی اختیار کرنا ہے—

جس رات میں نے سنا کہ لیلیٰ صبح یا شام روانہ ہو گی تو میرا دل اُس لوے کی طرح جو صیاد کے پھندے میں پھنس گیا ہو اور پھندے سے گردن چھڑانے کے لئے پھڑکتا ہو بے اختیار پھڑکنے لگا—

اے محبوبہ! تو میرے ہر سونے میں آخر شے ہے اور ہر جاگنے میں اول شے ہے—

اگر جنگل کے بھیڑیے میری محبوبہ کے ہم نسب ہوتے تو میں قسم کھا کر کہتا ہوں کہ میں اُن سے بھی محبت کرتا—

اے لیلیٰ کے کُنبے کے لوگو! خدا تم میں لیلیٰ جیسے بہت سے معشوق پیدا کرے تا کہ تم میری لیلیٰ مجھے دے ڈالو اور اُس کے دینے میں بخل نہ کرو—

میری معشوقہ یا تو پری ہے یا اُس کے ساتھ کوئی جن ہے جو بے چلہ

کمان سے دلوں پر تیر چلانا اُسے سکھاتا ہے۔وہ معشوقہ مقام جواء کی جنگلی گایوں کی طرح سنہری رنگ کی ہے —

اے محبوبہ تونے مجھے ایسے آرام کے وقت گھر سے نکلنے اور اپنی تلاش میں سفر کرنے پر مجبور کیا ہے جب کہ رنگ برنگ کے لوے نہر کے دونوں کناروں پر زمین سے چھاتی لگائے آرام کر رہے ہیں —

اے محبوبہ! جب تو مجھ سے خفا ہوتی ہے تو میں ایسے اضطراب میں رات گزارتا ہوں کہ گویا بچھو نے کاٹ کھایا ہے —

میں نک چھدے اونٹ کی طرح تیرے عشق کا تابع ہوں کہ جہاں وہ لے جاتا ہے اُس کے ساتھ جاتا ہوں —

میں تیرے وصل کا ایسا آرزو مند ہوں جیسے کوئی پیاسا کنواں کھودے اور پانی کی جگہ کوئی سخت پتھر کی سل آجائے جس کو نہ وہ توڑ سکے نہ اُس میں شگاف دے سکے —

میں فراق کی رات میں اس طرح بے چین تھا جیسے کوئی سانپ کوڑے سے پیٹا جائے اور اُس کی پشت کے مہرے ٹوٹ گئے ہوں اور وہ تڑپتا ہو مرتا نہ ہو۔ یعنی میں زندوں میں تھا نہ مردوں میں —

امرءالقیس کی شاعری کا نمونہ

جب وہ دونوں نازنینیں کھڑی ہوتی تھیں تو اُن سے ایسی خوشبو آتی تھی گویا باد صبا لونگوں کے درختوں سے گزر کر آئی ہے —

آنسو میرے سینے پر اس قدر جاری ہوئے کہ میری تلوار کا پرتلا تر ہو گیا —

اے لمبی رات! کیا تیرے ستارے کتان کی مضبوط رسیوں سے سخت پتھر کی چٹان سے باندھ دیے گئے ہیں؟ (کہ اپنی جگہ سے نہیں ہلتے اور صبح ہونے میں نہیں آتی) —

میں صبح کو ایسے وقت اُٹھتا ہوں کہ پرندے اپنے آشیانوں میں ہوتے ہیں-پھر گھوڑے پر سوار ہو کر نکل جاتا ہوں-اس گھوڑے کا ڈیل بڑا ہے اور بدن پر بال کم ہیں-وحشی جانور اُس کے آگے سے بھاگ نہیں سکتے-جب تم حملہ کرنا چاہو تو وہ بڑا حملہ آور ہے اور جب اُس کو پیچھے ہٹانا چاہو تو بڑی تیزی سے پیچھے ہٹتا ہے-آگے بڑھنے اور پیچھے ہٹنے کے اوصاف اُس میں ایک ساتھہ جمع ہیں-تیز رفتاری کا یہ حال ہے کہ گویا پتھر کی ایک چٹان کو سیلاب نے پہاڑ کی بلندی سے نیچے دھکیل دیا ہے-عرق گیر جو زین کے نیچے رہتا ہے اُس کی سپاٹ پیٹھہ پر سے پھسل جاتا ہے-باوجود چھریرے پن کے جب اُس کو ایڑ کا اشارہ کیا جاتا ہے تو وہ بہت گرم ہو جاتا ہے اور چلنے میں ایسی آواز آتی ہے گویا ہنڈیا جوش کھا رہی ہے-جب اور گھوڑے روندی ہوئی پتھریلی زمین میں تھک کر قدم رگڑنے اور غبار اُڑانے لگتے ہیں تو وہ اس حالت میں بھی اس طرح چلتا ہے کہ گویا تازہ دم ہے-اگر کوئی نوسوار لڑکا اُس کی پشت پر سوار ہو تو اُس کی کمر پر سے پھسل جاتا ہے اور اگر کوئی شہسوار ہو تو اُس کی تیزی کے سبب وہ اپنے کپڑے سنبھال نہیں سکتا-کاوے میں اس طرح پھرتا ہے کہ گویا پھرکی ہے جسے کوئی لڑکا بار بار گھما رہا ہے-کمر کی کوکیں ہرن جیسی ہیں-ٹانگیں شترمرغ جیسی-دوڑ بھیڑیے کے سی ہے اور پویہ چال میں وہ لومڑی کے بچے سے مشابہ ہے-اُس کے تمام اعضا کامل ہیں-سینہ فراخ ہے-دم دراز ہے کہ زمین سے کچھہ ہی اونچی رہتی ہے اور ایسی گھنی ہے کہ اگر پیچھے کی طرف سے تم اُسے دیکھو تو وہ اُس کی رانوں کے درمیانی فاصلے کو چھپائے ہوئے ہے-وہ کج دم نہیں ہے-جب وہ ہمارے مکان کے قریب کھڑا ہوتا ہے تو اُس کی پشت ایسی معلوم ہوتی ہے کہ گویا دلہن کی خوشبو پیسنے کی سل ہے-یا اندراین کا پھل توڑنے کا پتھر ہے-آگے آنے والی نیل گایوں کا خون جب کہ اُن کی سرینوں پر نیزہ لگتا ہے-اُس

گھوڑے کے سینے پر ایسا معلوم ھوتا ھے کہ گویا کنگھی کے سفید بالوں میں مہندی کا رنگ ھے-نیل گایوں کا ایک گلہ یکایک ھمارے سامنے سے گزرا یہ ایسی خوش نما تھیں کہ جیسے کنواری لڑکیاں ھیں جو لمبی چادریں اوڑھے دوار بت کا طواف کر رھی ھیں-ھمیں دیکھہ کر وہ پیچھے پھریں اُس وقت اُن کی قطار یمن کے سفید و سیاہ مہروں کا ایک ھار معلوم ھوتی تھی-اس گھوڑے نے اگلی گایوں کی طرف ھمیں اس تیزی سے پہنچا دیا کہ ابھی پچھلی گائیں بکھرنے نہ پائی تھیں-پھر اُس نے ایک جھپٹ میں ایک گاے اور اُس کے نر کو آگے پیچھے سے دبا لیا اور باوجود اس قدر دوڑ کے اُسے پسینا بالکل نہیں آیا-ھمارے ساتھہ کے شکاری گوشت پکانے میں مشغول ھو گئے-بعض دھکتے کویلوں پر کباب لگا رھے تھے اور بعض نے ھانڈیاں چولھوں پر چڑھا دی تھیں-شکار کے بعد جب شام کو ھم گھر واپس آے تو باوجود اس قدر محنت کے گھوڑے کے حسن و جمال میں فرق نہیں آیا تھا-اب بھی ھماری نظر اُس کے جسم پر پڑ کر پھسل جاتی تھی—

دوست! ذرا آسمان کی طرف دیکھہ-بجلی کس طرح چ ک رھی ھے.تہ بتہ ابر میں گویا کوئی شخص اپنے دونوں ھاتوں کو حرکت دے رھا ھے-بجلی گویا راھب کا چراغ ھے جس کی بتی پر تیل خوب جھکادیا گیا ھے-ھم ضارج اور عذیب کے درمیان بجلی اور بادل کا تماشا دیکھنے کے لئے بیٹھہ گئے-بجلی کی روشنی میں معلوم ھوتا تھا کہ دائیں طرف بارش کا سلسلہ کوہ قطن تک ھے اور بائیں طرف کوہ ستار اور یذبل تک موضع کتیف میں اس زور کی بارش نے کنھبل جیسے بڑے بڑے درختوں کو گرادیا ھے-تیماء میں کوئی مکان بے گرائے نہیں چھوڑا بجز اُن مکانوں کے جو پتھروں سے بنائے گئے تھے-کوہ ثبیر بارش کی دھاروں میں ایسا معلوم ھوتا ھے کہ گویا کوئی بڑا سردار دھاری دار کملی اوڑھے بیٹھا ھے-کوہ مجیمر اور اُس کی آس پاس کی چوٹیاں پانی کے سیلاب اور

خیبر کا قلعہ مشہور تھا عرب کی شاعری میں اُس کا ذکر اس سبب سے بھی آیا ھے کہ وھاں ایک قسم کا مہلک بخار پھیلا کرتا تھا —

عکاظ ایک مقام کا نام ھے جو نخلہ اور طائف کے درمیان تھا - یکم ذیقعدہ سے بیس دن تک یہاں ایک بازار لگتا تھا عرب کے شعرا ھر سال یہاں آتے اور فخر کا اظہار کرتے تھے —

ضریہ بصرہ کے قریب ایک گاؤں تھا جہاں شکاری پرندے کثرت سے تھے —

جواء ایک موضع ھے جہاں کی وادی میں زرد رنگ کی جنگلی گائیں چرا کرتی تھیں اور وھاں چکاکی نام ایک پرندہ بھی کثرت پایا جاتا تھا —

خط یمامہ کا ایک مشہور مقام تھا جہاں عمدہ نیزے فروخت ھوتے تھے اور وہ خطی نیزے کہلاتے تھے —

بصریٰ ملک شام کا ایک شہر تھا جہاں تلوار خالص فولاد کی بنتی تھی اور چوڑی ھوتی تھی —

ھجر یمن کا ایک شہر ھے جہاں کا خرما مشہور تھا —

وجرہ ایک گاؤں کا نام تھا جس کا جنگل وحشی نیل گایوں سے بھرا ھوا تھا - یہاں کے سفید ھرن بھی مشہور تھے —

وادی عید یا وادی حمار یمن کی ایک وادی ھے یہ پہلے نہایت سرسبز تھی مگر ایک بار بجلی نے اُس کو جلا کر خاک کر دیا اُس وقت سے ھر ویران مقام کو وادی حمار سے تشبیہ دینے لگے —

عدولی بحرین کا ایک قریہ تھا جہاں کشتیاں بنائی جاتی تھیں —

توضح ایک گاؤں تھا یہاں کی نیل گائیں بھی مشہور تھیں —

دومۃ الجندل کا مکھن مشہور تھا —

ان کے علاوہ یمن کی ریشمی چادریں اور دو دھاری تلواریں اور ام کا کاغذ اور اعلیٰ ریشمی کپڑے شہرت رکھتے تھے - مشرقی تلواریں بھی

شام سے آتی تھیں—

ریگستانوں اور سرابوں کا ذکر عرب کی شاعری میں بار بار آتا ھے۔ موسموں کے ذکر میں سخت گرمی اور تمتماتی دھوپ، کبھی کبھی بارش، راتوں کا سرد ھونا اور موسم سرما میں قحط کے آثار نمایاں ھونا عرب کے اشعار سے بار بار معلوم ھوتا ھے۔ شمال کی ھوا کو شمال، جنوب کی ھوا کو جنوب کہتے تھے۔ مشرق کی ھوا صبا اور مغرب کی ھوا دبور کہلاتی تھی۔ نکباء ایک ھوا چلتی تھی جس سے قحط کی علامت محسوس ھوتی تھی۔ بیابانوں کے سفر میں غریب ستاروں کو دیکھکر چلتے تھے۔ بنات النعش شام کی طرف کے ستارے اور سہیل یمن کی طرف کا ستارہ کہلاتا تھا۔ فرقدین اور کہکشاں کا ذکر بھی بار بار آیا ھے۔ قمری منزلوں سے بارش کے ھونے نہ ھونے کا حساب لگایا کرتے تھے۔ گرمی کا بیان کرتے تھے تو کہتے تھے کہ جب ثریا صبح کو طلوع کرتا ھے اور جب جوزا آسمان پر نمایاں ھوتا ھے۔ سفری ستارے کا طلوع سخت گرمی کی علامت خیال کیا جاتا تھا۔ شامی ھوا کا چلنا جو ٹھنڈی ھوتی تھی قحط کی نشانی تھی۔ مردوں کو دعا دیتے تھے کہ خدا کرے تیری قبر کو ابر قبلہ تر کرے۔ یہ اس لئے کہ عرب میں بھی قبلہ سے جو بادل اُٹھتا ھے وہ بہت برسنے والا سمجھا جاتا تھا۔ بعد مغرب ثریا کا طلوع کرنا بھی سردی کی علامت تھی اور سردی قحط کی—

حیوانات میں عرب کے اونٹ اور گھوڑے خاصکر مشہور ھیں۔ اُن کی سینکڑوں نسلیں تھیں۔ ان دونوں جانوروں کا ذکر عرب کی شاعری میں کثرت سے آیا ھے۔ ان کے علاوہ جن جانوروں کے نام لئے گئے ھیں وہ حسب ذیل ھیں—

کتا جس سے پہرے اور شکار کا کام لیا جاتا تھا۔ کبوتر۔ فاختہ۔ قمری۔ اِن کا ذکر عاشقانہ شاعری میں بہت آتا ھے۔ شیر۔ بھیڑیا۔ گورخر۔ لومڑی۔ نیل گاے۔ شتر مرغ۔ بکری۔ چیتا۔ گرگٹ۔ کفتار۔ عقاب۔ باز۔ اُلو۔ گد۔ شکرا۔ لوا۔ ھد ھد۔ شہد

کی مکھی - ٹڈی - چمگادڑ - مینڈک - مچھلی - چیونٹیاں - چوھا - بلی وغیرہ ایک چھوٹے سے جانور کا ذکر بھی آتا ھے جس کو جد جد کہتے تھے اور جو چمڑا کاٹکر کھاتا تھا —

نباتات میں سب سے زیادہ کھجور کا ذکر آتا ھے - اِس کے علاوہ جن جنگلی درختوں کا نام لیا گیا ھے وہ حسب ذیل ھیں —

ببول - جھاو - پیلو - تھوء ر - جانڈ - آکھی - ارنڈ - کُھمبی - اندراین وغیرہ کنہبل - بشام - طلح - سیال - عرفج - اسحل خاص عرب کے درخت ھیں - شیزی ایک آبنوس جیسے درخت کی لکڑی تھی جس کے بڑے بڑے پیالے بنائے جاتے تھے - مرار ایک نہایت کڑوی گھاس کا نام تھا - نبعہ ایک درخت تھا جس کی لکڑی کمانوں کے لئے موزوں تھی - حرم بھی ایک ایسے ھی درخت کا نام تھا - درخت تنوم پر سانپ لپٹے رھتے تھے - پھولوں میں گلاب - سنبل - عرار - خیری - یابونہ - چمبیلی اور بنفشہ کا ذکر اکثر آیا ھے - اند اور بان دو نازک درخت ھیں جن کا نام عاشقانہ شاعری میں بار بار لیا جاتا ھے - ورس ایک گھاس کا نام ھے جو رنگنے کے کام میں آتی تھی - مہندی کا بھی نام لیا گیا ھے - کالی مرچیں شراب میں ڈالی جاتی تھیں تاکہ نشہ تیز ھو - میووں میں انگور اور انار وغیرہ کا ذکر آیا ھے —

تاریخی حوالے

ایام جاھلیت میں مختلف قبایل جو عرب میں آباد تھے اُن میں ذرا ذرا سی بات پر لڑائیاں ھوتی رھتی تھیں اور بعض لڑائیاں طول پکڑ جاتی تھیں شاعری نے ان قبایل کے نام کو اب تک زندہ رکھا ھے - جا بجا اُن قبایل کے نام عربی اشعار میں لئے گئے ھیں مثلاً

آل مازن - آل زبیان - آل رباب - آل ضرار - آل مطرف - آل حیہ - بنی مطر - بنی اسد - بنی کلب - بنی نمیر - بنی طریف - بنی زھیر - بنی ثعلب - بنی شیبان وغیرہ

اہم معرکے جو پیش آے ہیں اُن کے نام عرب نے رکھہ لئے ہیں-یہ نام بھی جا بجا مذکور ہیں مثلاً

یوم ہریر-یوم کلاب-یوم بردان-یوم خزاز-یوم بہیما وغیرہ

گھوڑے ان لڑائیوں میں خوب کام دیتے تھے-عربوں کو گھوڑوں سے خاص محبت تھی اور وہ اُن کو اپنی اولاد کے برابر عزیز رکھتے تھے-وہ اعلی اور شریف نسل کے گھوڑوں اور گھوڑیوں کے نام رکھتے تھے-یہ نام بھی عرب کی شاعری میں مذکور ہیں-مثلاً

گھوڑوں کے نام:- شہر-ورد-صموت-جون-عرقوب-عصا-ادھم-سبط-اغبر اغر-خطار وغیرہ

گھوڑیوں کے نام:- سکاب-دھماء-شولہ-شقراء-خصاف-غبراء-نعامہ حنفاء وغیرہ

تلواروں اور زرھوں پر بھی عرب فخر کرتے تھے اور اُن کے بھی خاص خاص نام تھے مثلاً

تلواروں کے نام:- معلوب-اصرم-ذوالعیات وغیرہ

زرھوں کے نام:- ذات الحواشي-ذات السلاسل وغیرہ

عربوں کی رزم آرائیاں-غارتگریاں-فتح و شکست-صلح و معاهدے عہد شکنیاں-خونبہا اور انتقام وغیرہ سب کچھہ ان کے اشعار سے معلوم ہو سکتا ہے-ابن اثیر اور طبری وغیرہ مورخوں نے عرب کی شاعری ہی سے مدد لیکر اس زمانے کی تاریخ مرتب کی ہے-یہ شاعری ہی کی برکت ہے کہ آج تک اس زمانے کے واقعات زندہ ہیں—

اخلاق و تمدن

عرب کے اخلاق اور معاشرت و تمدن کا حال معلوم کرنا چاہو تو اُن کی شاعری کا مطالعہ کرو-وہ اس سارے دفتر کو تمہاری آنکھوں کے سامنے

کھولکر رکھہ دیگی —

عرب جس طرح جنگجو اور بہادر هیں اُسی طرح عاشق مزاج بھی هیں- اُن کی عشق کی داستانیں بھی اُن کے اشعار میں قلمبند هیں- جن جن حسین عورتوں کے ساتھہ عربوں نے عشق کیا هے اُن کے نام اُنھوں نے بے تکلف اپنے اشعار میں درج کر دئے هیں- مثلاً

لمیس - عبلہ - اُمامہ - طریفہ - عنیزہ - زینب - اُم رباب - نوار - سحابہ - لیلیٰ سلمیٰ - ذلفاء - ریا - خولہ - سعاد - تماضر - اُم عامر - سمیہ - ردینہ - اُم حسان وغیرہ —

اگر عاشق ایک قبیلے کا اور معشوقہ دوسرے قبیلے کی هوتی اور دونوں قبیلوں میں رسم و راہ نہ هوتی تو عاشق و معشوق چھپ چھپ کر راتوں کو ملتے تھے اور عاشق اپنی معشوقاؤں کو بھگا لے جانے کی کوشش کرتے تھے اور اگر ضرورت هوتی تو اس مطلب کے لئے لڑنے اور خون بہانے سے بھی دریغ نہ کرتے تھے- خانہ بدوش قبایل جہاں کہیں پانی کے چشمے دیکھتے چند روز کے لئے تھیر جاتے تھے- پھر گھاس اور پانی نہ هونے کی صورت میں نقل مکانی کرتے تھے- ایسے هی موقعوں پر نوجوان مردوں اور نوجوان عورتوں کی آنکھیں لڑ جایا کرتی تھیں- نقل مکانی کے بعد جب کوئی عاشق ایسے مقام پر پہنچتا تھا جہاں پہلے اُس کی معشوقہ تھیری تھی تو وہ اُس کے قیام کے نشانوں کو دیکھکر خطاب کرتا تھا اور اُس کے فراق میں دردناک اشعار کہتا تھا اور شعرائے عرب کے قصاید کی تمہید اسی خطاب اور نوحہ سے هوئی هے —

رهزنی اور غارتگری عربوں کی فطرت میں داخل تھی اس کو عیب نہیں سمجھتے تھے بلکہ فخر کرتے تھے- اِسی پر اُن کی معاش کا مدار تھا- موقع پا کر ایک قبیلہ کے آدمی دوسرے قبیلے پر چڑہ دوڑتے تھے اور ان کے مویشی لوٹ لاتے تھے- لوٹ کے لئے دھاوا اکثر صبح کے وقت هوتا تھا جب کہ لوگ غافل

سوے ہوے ہوں-غارتگری کے دھاووں میں تیز رفتار اونٹوں اور اونٹنیوں سے کام لیتے تھے-اونٹوں کی خاص خاص نسلیں مشہور تھیں-ایک نسل کو مہاری کہتے تھے یہ نسل مہرہ بن حیداں کی طرف منسوب تھی جو یمن کا باشندہ تھا-شریف نسل کے اونٹوں کے ذرا ذرا سے کان کاٹ دیتے تھے اُن کو مزنم کہتے تھے-اونٹنیاں جن کی آنکھیں سیاہ اور بال سرخ ہوں نہایت قیمتی خیال کی جاتی تھیں—

گھوڑے دوڑانے اور ایک دوسرے سے بازی لے جانے کا شوق بھی عربوں کو تھا-گُھڑ دوڑ کے گھوڑے خاص اہتمام سے پالے جاتے تھے-شریف اور نسل دار گھوڑوں پر نشان لگاے جاتے تھے تاکہ وہ دور سے پہچانے جائیں-گُھڑ دوڑ کی ہار جیت میں منجملہ دس گھوڑوں کے سات گھوڑوں کو حصہ دیا جاتا تھا-تین گھوڑے محروم رہتے تھے-دوڑ میں جو گھوڑا سب سے اول آتا تھا اُس کو مجلی، دوسرے کو مصلی، تیسرے کو مسلی، چوتھے کو تالی، پانچویں کو مرتاح، چھٹے کو عاطف اور ساتویں کو مومل کہتے تھے-باقی تین محروم گھوڑے خظی، لطیم اور سکیت کہلاتے تھے—

جوا طرح طرح سے کھیلا جاتا تھا-جوے کا مشہور طریقہ تیروں سے کھیلنے کا تھا-اونٹ کے دس حصے کئے جاتے تھے اور جو تیر آتے اُن کا حصۂ معینہ اونٹ کے گوشت میں سے دیا جاتا-جوے کے تیروں کے نام حسب ذیل تھے-فذ-توأم-رقیب-حلس-نافس-مسبل-معلق-ان سات تیروں میں سے پہلے تیر کا ایک حصہ تھا-دوسرے کے دو-تیسرے کے تین-اس حساب سے رقیب کے تین اور معلی کے سات حصے ہوتے ہیں-اگر کوئی شخص رقیب اور معلی نام کے تیر جیت لیتا تھا تو اونٹ کے دسوں حصے اُسی کو ملتے تھے-تین تیر اور تھے جن کے نام یہ تھے-سفیح-منیح-وغد-ان تیروں کا کوئی حصہ نہ تھا-اگر قحط کا زمانہ ہوتا تو جوا کھیلنے میں زیادہ فخر تھا-اس زمانے میں اگر کوئی مہمان آجاتا تو باہم جوا کھیلتے

تھے۔جو شخص جیت جاتا وہ جیت کی آمدنی سے مہمان نوازی کرتا تھا—

شراب پینے کا رواج بھی عربوں میں تھا۔مختلف قسم کی شرابوں کے مختلف نام تھے۔شراب کی اعلی قسمیں اکثر ملک شام سے آتی تھیں۔اس کو عام طور پر مشکیزوں میں رکھتے تھے۔اکثر صبح یا شام کے وقت پی جاتی تھی۔صبح کی شراب کو صبوح اور شام کی شراب کو غبوق کہتے تھے۔صبح کے وقت اکثر چار جام پئے جاتے تھے۔شراب نوشی کو بھی عیب نہیں جانتے تھے۔بلکہ اس پر فخر کرتے تھے۔مے فروش کی دوکان پر ایک جھنڈی لہرایا کرتی تھی۔جس کو دیکھکر شراب پینے والے لوگ وھاں جمع ھو جاتے تھے۔سردی میں اکثر شراب میں گرم پانی ملا کر پیتے تھے۔نشہ تیز کرنے کے لئے کالی مرچیں ملا دیتے تھے۔جو لوگ خود کشی کرنا چاھتے تھے وہ خالص شراب پیتے تھے۔چنانچہ زھیر۔عمرو بن کلثوم جو نامور شاعر تھے اور ابو عامر ملا عب الاسنہ نے اسی طرح خود کشی کی تھی۔جب دشمن سے انتقام لینے کی قسم کھاتے تھے تو قمار بازی کی طرح شراب نوشی کو بھی اپنے اوپر حرام کر لیتے تھے۔انتقام لینے کے بعد البتہ جی کھول کر جوا کھیلتے اور شراب پیتے تھے—

مہمان نوازی تو گویا عربوں کے خمیر میں تھی۔اگر اتفاقاً کوئی شخص مہمان نواز نہ ھوتا تو اس کو نہایت نفرت کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔رات کے وقت میدانوں میں یا ٹیلوں پر آگ روشن کی جاتی تھی۔تاکہ بھولا بھٹکا مسافر وھاں آکر پناہ لے۔مہمانوں کے لئے اونٹ ذبح کئے جاتے تھے۔شیزی کے بڑے بڑے بادیوں میں لوھے کے بڑے بڑے چمچوں سے گوشت نکالا جاتا تھا اور مہمانوں کے آگے رکھا جاتا تھا۔اعلی درجہ کی مہمان نوازی یہ تھی کہ ایسی اونٹنیاں مہمانوں کے لئے ذبح کی جائیں جو ھمیشہ سادہ بچے جنتی ھوں۔کیونکہ ایسی اونٹنیاں قیمتی ھوتی تھیں۔گوشت کھانے کے وقت علی العموم چھریوں سے کاٹا جاتا تھا۔مہمان نوازوں کی دیگوں کا سیاہ رھنا تعریف کی بات تھی۔کیونکہ یہ ھمیشہ

کھانا پکنے کی علامت تھی-شاعر جو اپنی مہمان نوازی کی تعریف کرتے ہیں، اپنی قیام گاہ پر آگ جلانے، دیگوں کے سیاہ ہونے، اُن میں گوشت کے جوش کھانے، آگ کے شعلے اور دھویں کے بلند ہونے، دیگوں میں پیالے یا چمچے ڈال کر شوربا اور گوشت نکالنے اور اُس وقت کنیزوں کی پھرتی اور سرگرمی کی تعریف مزے لے لے کر کرتے ہیں-ہجو کے موقع پر کہتے تھے کہ فلاں شخص کی اونٹنیاں موٹی تازی ہیں، یعنی وہ مہمانوں کی خاطر ان کو ذبح نہیں کرتا-عورتیں البتہ اپنے شوہروں کو حد سے زیادہ مہمان نوازی پر ملامت کیا کرتی تھیں-مگر اس کی پروا نہیں کی جاتی تھی-مہمان نوازی کے علاوہ قیدیوں کو چھڑانا، تاوان و دیت ادا کرنا سایلوں کو دینا اور یتیموں کی پرورش کرنا بھی عربوں کے نزدیک نیکی اور بھلائی کے کاموں میں داخل تھا—

عورتوں کا درجہ عربوں کے نزدیک نہایت ادنیٰ تھا-وہ گھروں میں باندیوں سے زیادہ وقعت نہ رکھتی تھیں-ان کی بات کی مطلق پروا نہیں کی جاتی تھی-وہ لوٹ کے مال کی طرح لوگوں کے ھاتھہ آسکتی اور غیروں کے ہاں باندیاں بنائی جاسکتی تھیں-عربوں کا قول تھا کہ عورتوں کی موت ان کی زندگی سے بہتر ھے-چنانچہ اس خیال کو بار بار عرب شعرا نے بیان کیا ھے-لڑکیاں ذرا بالغ ھوتیں تو اکثر زندہ دفن کردی جاتی تھیں-اس رسم کو اسلام نے آکر فنا کیا اور عورتوں کے درجے کو بلند کیا-اُس زمانے کی عورتیں طرح طرح کے توھمات میں مبتلا تھیں-اس کا ذکر آگے آتا ھے-آسودہ حال عورتیں ریشم کا سفید یا زرتار لباس پہنتی تھیں-وہ اکثر آرام طلب ھوتی تھیں اور چاشت کے وقت تک سوتی رھتی تھیں-وہ رات کے وقت جامۂ خواب پر پٹکا نہیں باندھتی تھیں-یہ عادت خادمہ عورتوں کی تھی-کرتی اور انگیا کا بھی رواج تھا-مگر کرتی جوان عورتیں پہنتی تھیں اور انگیا وہ لڑکیاں جو قریب بلوغ ھوں-بدن کے حصوں کو سوئی سے گودنے اور اُن میں سرمہ یا نیل بھرنے کا بھی

رواج تھا-دولت مند اور آسودہ حال گھرانوں کی عورتیں جو ریشم کی چادریں استعمال کرتی تھیں ان پر کجاوہ کی تصویر اور دوسری قسم کی تصویریں اور گل بوٹے بنے ہوتے تھے- زیوروں میں خلخال بازو بند کنگن اور هار کا رواج تھا-اکثر عورتیں سرمہ سے دانتوں اور مسوڑھوں کو سیاہ کرتی تھیں-اور یہ بات اُن کے نزدیک زیبائش و آرایش میں داخل تھی- عرب کوتاہ قد اور دبلی پتلی عورتوں کو پسند نہ کرتے تھے-ان کے نزدیک عورتوں کا موٹا تازہ ہونا اور دراز قد ہونا ممدوح تھا—

مردوں کی پوشاک عام طور سے تہبند اور کرتہ اور دھاری دار چادر تھی- لڑائی کے وقت چرمی کرتہ پہنتے تھے اور اُس پر زرہ پہنا کرتے تھے زرہ اکثر ایران سے آتی تھی باریک بنی ہوئی اور چھوٹے حلقوں والی زرہ کو پسند کرتے تھے اور اس کو داؤدی زرہ کہتے تھے- سغد ایک زرہ ساز کا نام تھا- اس کی بنائی ہوئی زرهیں مشہور تھیں- سر پر خود لگاتے تھے- تلواروں اور برچھوں سے لڑتے تھے یمنی اور هندی تلواریں اور ردینی نیزے مشہور تھے، ردین ایک نیزہ ساز کا نام تھا- دور کی لڑائی میں تیروں کا استعمال کرتے تھے - اگر تیر نہ رهتے تو کمانوں کولا ٹھیاں بنا کر لڑتے تھے- لڑائی کے بردے فروخت کردئے جاتے تھے- یا ان کے ناک کان کاٹ لئے جاتے تھے- عورتیں باندیاں بنالی جاتی تھیں- اِن باندیوں سے گھر کا تمام کام کاج لیا جاتا تھا- وہ جنگل سے لکڑیاں چن‌کر لاتی تھیں پانی بھرتی تھیں مہمانوں کی خدمت کرنا بھی ان کے فریض میں داخل تھا-ان کا لباس بمقابلہ گھر کی عورتوں کے ادنیٰ درجہ کا تھا- باندیوں کو ناچنا گانا بھی سکھایا جاتا تھا چناچہ ایک گویا ابن محرز باندیوں کو گانا سکھانے کا کام انجام دیتا تھا- باجوں میں رباب دف عود اور مبربط کا رواج تھا- لڑائی میں جو باندیاں زخمیوں کی مرهم پٹی کرتی تھیں وہ رواسی کہلاتی تھیں- یہ کام عرب بذات خود عیب سمجھکر نہیں کرتے تھے- فوج کے

سرداروں کو لڑائی فتح ہونے کے بعد مال غنیمت کا چوتھائی حصہ ملتا تھا۔اپنے گروہ اور دشمن کے گروہ میں جنگ کے وقت تمیز کرنے کے لیے کوئی علامت مقرر کرلیتے تھے۔ مثلاً سرمنڈالیتے۔عربوں کے نزدیک بستر پر گل سڑ کر مرنا سخت عیب تھا وہ چاہتے تھے کہ چاقے ھاتھہ پاؤں لڑکر مارے جائیں۔ ان کی عورتیں اپنے شوہروں کی جوانمردی پر فخر کرتی تھیں۔ اسی لئے شاعر لڑائی کا ذکر عورتوں سے مخاطب ہوکر کرتے ہیں۔ وہ نسب پر فخر کرتے تھے دوغلوں کو نامرد اور بہادری ان کے نزدیک شریفوں کی علامت تھی۔لڑائی میں پیٹھہ پھیرنا ان کے نزدیک بہت معیوب تھا۔ ان کا قول تھا کہ ھمارے زخموں کا خون ھماری ایڑیوں پر نہیں گرتا۔ بلکہ قدموں پر گرتا ہے۔ لڑائی کے تازہ مقتولوں کا ماتم عورتیں ننگے سر ہوکر صبح شام کیاکرتی تھیں۔مردوں کو کفن دیکر دفن کرنے کا رواج تھا۔ قبراکثر چارگز لمبی اور پانچ بالشت چوڑی ہوتی تھی۔ کوشش کی جاتی تھی کہ اپنے مقتولوں کا انتقام لیاجائے یادیت لی جائے۔ مگر دوسری صورت اکثر کمزور اورنامردی کی علامت خیال کی جاتی تھی۔ دستور تھا کہ صلح کی گفتگوکے وقت ہر ایک فریق دوسرے کی طرف نیزہ کی بوڑی رکھکر بیٹھتا تھا اگر صلح منقطع ہوجاتی تو نیزے کی بھال ایک دوسرے کی طرف کردی جاتی تھی قوم کے سردار ایسی محفلوں میں کوٹ باندھکر بیٹھتے تھے اور آگے تلور رکھلتے تھے معاہدوں کی پابندی کی جاتی تھی مگر کبھی کبھی عہد شکنی پر بھی مایل ہوجاتے تھے۔اس صورت میں عہدشکنی کرنے ولا شخص یافریق تمام عرب میں بدنام ہوجاتا تھا۔ اس کے بدنام کرنے کے لئے اونچے مقامات پر آگ جلائی جاتی تھی اگر کوئی شخص پناہ میں آتا اور قتل سے بچا یا جاتا تو جو آدمی پناہ دیتا تھا وہ پناہ مانگنے والے پر چادر ڈال دیتا تھا۔

عرب اکثر خیموں میں زندگی بسر کرتے تھے مکان بنا کر بہت کم رہتے تھے۔ شہروں اور قصبوں میں مکان بھی تھے تو وہ معمولی قسم کے تھے۔اِس زندگی کے

علاوہ عربوں کے اخلاق و تمدن کے متعلق متفرق باتیں عرب کی شاعری سے معلوم ہوتی ہیں وہ حسب ذیل ہیں—

زمانہ امن کا مشغلہ اکثر شکار ہوتا تھا۔ نیل گایوں اور ہرنوں کا شکار نہایت پھرتی اور مستعدی کے ساتھہ کیا جاتا۔ شکاری کتوں سے بھی شکار میں کام لیا جاتا تھا۔ اعلی نسل کے شکاری کتوں کی بڑی قدر کی جاتی تھی۔ ان کے کان لٹکے ہوے اور کمر پتلی ہوتی تھی ان میں سے بعض کے نام بھی عرب کے اشعار میں مذکور ہیں۔ مثلاً کساب اور سخام دو اعلی نسل کے شکاری کتوں کے نام تھے۔ شکار میں تیر اور نیزہ کا استعمال کرتے تھے اور شکار کے وقت پھرتی کی غرض سے چادر سر سے اُتار کر کمر سے باندہ لیتے تھے—

زبردست لوگ اپنے اونٹوں کو داغ دیا کرتے تھے تاکہ لوگ پہچان جائیں کہ یہ فلاں سردار کے ہیں اور اُن کو چشموں پر پہلے پانی پینے دیں۔ اس کے علاوہ طاقتور لوگ اپنی ہیکڑی جتانے کے لئے طرح طرح کی تجویزیں کرتے رہتے تھے۔ مثلاً کلیب نے ایک کتا پال رکھا تھا۔ لوگوں کا فرض تھا کہ اِس کتے کے دائیں بائیں سے گزریں۔ اُس کے پاس نہ آئیں۔ بنی ابیعہ داڑھیاں منڈواتے اور مونچھیں کترواتے تھے۔ اگر کوئی اور ایسا کرتا تو گویا اُن سے لڑائی مول لیتا تھا۔ بنی عبدالقیس کا دستور تھا کہ اگر کوئی گالی دے تو یہ اُس کے طمانچہ مارتے تھے۔ اگر وہ بھی طمانچہ مارے تو قتل کیا جاتا تھا۔ بنی بکر ایک پرندہ کو وسط سڑک میں باندہ دیتے تھے۔ ضرور تھا کہ لوگ اُس رستے سے نہ جائیں۔ اشد ضرورت کی حالت میں اُس کے دائیں بائیں سے گزریں—

عرب اپنے بچوں کو سونگھتے تھے اور اسی لئے ان کو ریحانہ کہتے تھے۔ ان کے گلوں میں اکثر کوڑیوں کا ہار ڈالتے تھے۔ بچے کپڑے کے کوڑے بناکر ایک دوسرے کو مارتے اور کھیلتے تھے۔ بچوں میں پھرکیوں سے کھیلنے کا بھی رواج تھا۔ بچوں کے ایک خاص کھیل کا نام اشعار میں آیا ہے جس کو فیال کہتے تھے۔

مٹی یا ریت کو دو حصوں میں تقسیم کرکے کسی حصے میں کوئی چیز دباتے اور پوچھتے کہ وہ چیز کس حصے میں ہے۔اسی پر ہار جیت کا مدار تھا۔

رات کا سفر اور دوپہر کے وقت کا سفر عرب کے نزدیک پسندیدہ تھا۔کیونکہ اس میں جفاکشی اور جرأت پائی جاتی۔ سفر کے وقت ان کی عادت تھی کہ تجربہ کار اونٹ کو آگے بڑھاتے تھے اور وہ زمین کو سونگھکر معلوم کرلیتا تھا کہ پانی یہاں سے اس قدر دور ہے اور منزل مقصود کتنے فاصلے پر ہے۔اگر دونوں مقام دور ہوتے تو وہ جلد جلد چلنے لگتا تھا۔سوف عربی میں سونگھنے کو کہتے ہیں اور اسی سے مسافت کا لفظ بنایا گیا ہے۔

سرسبز مقامات مثلاً یمامہ وغیرہ میں پانی سے زمین کو سینچنے کے لئے رہٹ بھی جاری تھے جن کو عرب منجنوں کہتے تھے۔اس کے علاوہ عرب کے اشعار سے پن چکی کے رواج کا بھی پتہ چلتا ہے۔

لکھنا پڑھنا عرب کے لوگ بہت کم جانتے تھے۔عہد رسالت میں بھی اس فن کے جاننے والے اُنگلیوں پرگنے جا سکتے ہیں۔قران مجید میں اسی سبب سے عرب کی قوم اُمی بتائی گئی ہے۔ایام جاہلیت کے شعرا فن کتابت کو روم و فارس کی طرف منسوب کرتے ہیں۔ہرن کی پتلی کھال پر لکھنے کا رواج تھا جس کو عربی زبان میں رق کہتے ہیں۔قرآن مجید میں یہ لفظ آیا ہے۔

عقائد و توہمات

اسلام سے پہلے حجاز اور وسط عرب میں بت پرستی ہوتی تھی۔کعبہ میں تین سو ساٹھ بت بتائے جاتے ہیں۔ان میں سے مشہور بتوں کے نام حسب ذیل ہیں۔

لات۔منات۔عزیٰ۔اساف۔نائلہ۔دوار۔ان میں سے دوار کا ذکر اکثر آتا ہے اور کہیں کہیں لات اور عزیٰ کا بھی۔دوار کے گرد نوجوان عورتیں سروں پر چادریں ڈالے طواف کرتی تھیں۔

عیسائی، یہودی اور مجوس بھی عرب میں جا بجا تھے۔حضرت ابراھیم کا دین توحید ماننے والے بھی تھے ایام جاھلیت میں کچھہ لوگ ایسے بھی تھے جو حشر و نشر کے قایل تھے اور اس بات پر عقیدہ رکھتے تھے کہ مرنے کے بعد ایک دن آئے گا جب کہ نیکیوں اور بدیوں کی جزا اور سزا دی جاے گی —

عوام عرب طرح طرح کے توھمات میں گرفتار تھے۔عورتیں مختلف رنگ کے ڈورے گلے میں ڈالتی تھیں تاکہ نظر بد سے بچیں۔ان ڈوروں کو بریم کہتے تھے۔عرب مراد پوری ھونے کے لئے طرح طرح کی منتیں مانتے تھے۔ان منتوں کے پورا کرنے میں کبھی کبھی لوگ چالاکی بھی کرتے تھے۔مثلاً بعض لوگ منت مانتے تھے کہ اگر اُن کا بکریوں کا گلہ سو تک پہنچ جاے گا تو بتوں کے نام پر ایک بکری ذبح کی جاے گی مگر منت پوری ھونے پر بکری کی جگہ ھرن کا بچہ ذبح کیا جاتا تھا۔دستور تھا کہ کسی شخص کے مرنے پر اُس کی اونٹنی اُس کی قبر پر باندہ دی جاتی تھی۔اُس کی آنکھوں پر پٹی باندہ دیتے تھے اور بھوکا پیاسا رکھتے تھے۔یہاں تک کہ وہ مرجاتی تھی۔خیال تھا کہ قیامت کے دن مرنے والا اس اونٹنی پر سوار ھوگا۔ایسی اونٹنی کو بلیہ کہتے تھے۔عرب خیال کرتے تھے کہ ھر شاعر کے ساتھہ ایک جن رھتا ھے جو شعر کا القا کرتا ھے۔اگر کوئی شعر لکھنے میں عاجز ھوتا تو کہتے کہ اس کا جن بھاگ گیا جن لوگوں سے عجیب و غریب یا غیر معمولی کام سرزد ھوں ان کو دیونی کی اولاد بتاتے تھے۔وہ بھوتوں کے بھی قایل تھے۔ان کے سروں کے گرد آلود ھونے اور تیزی کے ساتھہ چلنے کا ذکر بھی اشعار میں آتا ھے۔اگر کسی مقتول کا بدلہ نہ لیا جاے تو خیال کرتے تھے کہ اس کی قبر میں ھمیشہ اندھیرا رھے گا۔وہ گھوڑوں کی سعادت و نحوست کے قایل تھے۔منحوس گھوڑوں کو ایک منحوس گھوڑے کی اولاد بتاتے تھے جس کا نام راحس تھا۔اُن کا خیال تھا کہ اگر تیر چلانے والا اپنے تیر پر تھوک دیتا ھے تو پھر اُس کے تیر کا نشانہ جو شخص ھو وہ زندہ نہیں بچتا۔اُن کا خیال تھا کہ اگر

پادشاہ کے بائیں ہاتھ کی بیچ کی انگلی میں پچھنے لگا کر خون لیا جائے اور یہ خون چھوارے میں رکھکر اُس شخص کو کھلایا جائے جسے باولے کتے نے کاٹا ہے۔ تو اس کو شفا ہوجاتی ہے۔ ان کا خیال تھا کہ جب مردہ گل کر مٹی ہو جاتا ہے تو اس کے سر میں سے ایک پرندہ نکلتا ہے اور اس قبر پر آواز لگاتا ہے۔ اس پرندہ کو صدیٰ یا ھامہ کہتے تھے۔ عرب شگونوں کے بھی قایل تھے اور اکثر پرندوں سے شگون لیا کرتے تھے۔ جب وہ کسی دوست کو رخصت کرتے تو اسے بار بار مڑ کر دیکھتے تھے۔ یہ ایک شگون تھا اور اس غرض سے کیا جاتا تھا کہ جانے والا جلد واپس آئے۔ نامرد کو ابن صبح کہتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ اگر عورت صبح کو حاملہ ہو تو بچہ نامرد پیدا ہوتا ہے۔ عربوں کے نزدیک قزح ایک فرشتے کا نام تھا جو بادلوں پر مامور ہے۔ اسی کی کمان کو قوس قزح کہتے تھے۔

غرضکہ عرب کی شاعری کے مطالعہ سے عرب کے متعلق جغرافی آثار تاریخی واقعات اخلاقی و تمدنی مناظر اور ان کے عقاید و توہمات کے متعلق سب کچھہ معلوم ہوسکتا ہے اور یہ جو کچھہ لکھا گیا اسی مطالعہ سے معلوم ہوا ہے۔ اگر مضمون کی طوالت کا اندیشہ نہ ہوتا تو اور بہت کچھہ بیان ہو سکتا تھا۔ تاہم اس قدر بیان سے بھی ناظرین اس مقولہ کی صداقت مان جائیں گے کہ فی الحقیقت عرب کی شاعری عرب کے حالات و خیالات کا دفتر ہے۔

اب آخر مضمون میں مجھے یہ بیان کرنا ہے کہ عرب کی شاعری میں اظہار خیالات کے کیا طریقے تھے۔

خیالات کے سانچے

خیالات کے اظہار کے لئے جو اہم پیرایے عرب کے شعرا نے استعمال کئے ہیں۔ وہ تین ہیں۔ (۱) کنایہ (۲) استعارہ (۳) تشبیہ۔ ذیل میں تینوں طریقوں کی مثالیں لکھی جاتی ہیں۔

عربی شاعری کے کنایے ا پاؤں کا جوتی کے تسمے سے نکل جانا موت سے کنایہ ہے—

اونٹ کا کسی پر اپنی چھاتی ٹیک کر بیٹھنا ہلاک ہونے سے کنایہ ہے—

مادر کرگس یا گدوں کی ماں موت سے کنایہ ہے۔ کیوں کہ موت لوگوں کو ہلاک کرکے گدوں کے لئے خوراک مہیا کرتی ہے—

تبالہ میں اُتر پڑنا مالا مال ہونے سے کنایہ ہے۔ تبالہ یمن کا ایک زر خیز شہر تھا۔ بے دانت کی درانتی تلوار سے کنایہ ہے—

کانوں کا جڑ سے کٹ جانا ذلیل ہونے سے کنایہ ہے—

نامرد کتے والا سخی سے کنایہ ہے۔ کیوں کہ مہمانوں کی کثرت آمد رفت کے سبب کتا بھونکنا چھوڑ دیتا ہے—

دبلے شتر بچے والا بھی سخی سے کنایہ ہے۔ کیوں کہ اونٹنی کا دودھ مہمانوں کو پلایا جاتا ہے اس لئے اُس کا بچہ دبلا ہو جاتا ہے—

بہت راکھ والا بھی سخی سے کنایہ ہے۔ کیوں کی مہمانوں کی کثرت کے سبب اُس کے ہاں کھانا بھی کثرت سے پکتا ہے اور باورچی خانے میں راکھ کا ڈھیر لگ جاتا ہے—

اندراین توڑنا بے اختیار آنسو جاری ہونے سے کنایہ ہے۔ کیوں کہ جب کوئی شخص اندراین کا پھل توڑتا ہے تو اُس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگتے ہیں—

ہونٹوں نے دانتوں کا ساتھ چھوڑ دیا۔ یہ خوف سے کنایہ ہے کیوں کہ خوف کے وقت منہ کھلا کا کھلا رہ جاتا ہے—

چمڑے کے خیمے والے بڑے اور مالدار آدمیوں سے کنایہ ہے۔ کیوں کہ اس کا مقدور امیروں اور بڑے آدمیوں ہی کو تھا—

پنڈلی کھلنا مصیبت سے کنایہ ھے۔ کیوں کہ مصیبت کے وقت پردہ نشین عورتیں گھر سے باھر نکل بھاگتی ھیں—

پریشان ھوا میں چلنا قحط سے کنایہ ھے کیوں کہ عرب میں ھمیشہ ایسی ھواؤں کا چلنا قحط کی علامت خیال کیا جاتا تھا—

سر کی چادر بائیں ھاتھہ میں لینا عورتوں سے خوف زدہ ھونے سے کنایہ ھے۔ کیوں کہ خوف کے وقت وہ اکثر یہی عمل کیا کرتی تھیں—

لونگوں یاسنبل کا سرمہ لگانا رونے سے کنایہ ھے۔ کیوں کہ ایسا کرنے سے آنکھوں سے بے اختیار پانی جاری ھوجاتا ھے—

اُس زمین میں شترمرغ کے انڈے کثرت سے ھیں یاپھیلے پڑے ھیں۔ یہ زمین کے سرسبز ھونے سے کنایہ ھے کیونکہ شترمرغ ایسی ھی زمین میں انڈا دیتے ھیں—

لمبے پرتلے والا، دراز قد انسان سے کنایہ ھے کیوں کہ جس کا پرتلا لمبا ھوگا۔ اس کی تلوار لمبی ھوگی اور جس کی تلوار لمبی ھوگی اس کا قد بھی دراز ھوگا—

ھمارے گھوڑے بنات النعش کی طرف جارھے ھیں۔ یعنی ھم شام کی طرف کوچ کررھے ھیں یہ بھی کنایہ ھے۔ کیونکہ بنات النعش شامی ستارے سمجھے جاتے ھیں

آگ میں لکڑیاں یا ایندھن ڈالنا فتنہ فساد بڑھانے سے کنایہ ھے—

تہبند ڈھیلا ھونا خوف سے کنایہ ھے—

دامن کمر پر باندھنا، مستعدی سے کنایہ ھے—

گرگٹ کا درخت پر دم ھلانا گرمی کے وقت سے کنایہ ھے۔ کیونکہ گرمی کے وقت گرگٹ یہی حرکت کرتا ھے—

عربی شاعری کے استعارے

میں موت کے تھنوں سے اس وقت دودہ نکالتا ھوں جب کہ بڑے بڑے بہادر آدمی بھاگ نکلتے ھیں۔ یہاں موت کا

استعارہ ناقہ سے ہے —

لڑائی کا استعارے اس درندہ سے جو ڈاڑھیں نکالکر اپنے شکار کو ڈراتا ہو۔

نسب کے صاف و خالص ہونے کا استعارہ بارش کے پانی سے —

کمزور اور نامرد کا استعارہ اس گوشت سے ' جو قصائی کے تختے پر رکھا ہو کہ جو چاھتا ھے اُسے خرید کر لے جاتا اور اپنے کام میں لاتا ھے —

ذلیل وخوار آدمی کا استعارہ چھوٹے کان والے شترمرغ سے —

گلے کا ھار بد نامی کا استعارہ ھے —

موت کے قریب ھونے کا استعارہ اس شکاری پرندے سے جو منڈ لاتا اور پر تولکر شکار پر گرنا چاھتا ھو —

ڈولوں میں ڈول ڈالنا اوروں کے ساتھہ خود بھی کوشش کرنے کا استعارہ ھے —

شعریٰ ستارہ کا ڈوب کر نکلنا تنزل کے بعد ترقي حاصل ھونے کا استعارہ ھے —

تنور گرم ھونا لڑائی کی شدت کا استعارہ ھے —

سمندر کی موجوں کا چاروں طرف سے گھر آنا رات کی تاریکی پھیلنے کا استعارہ ھے —

بھوکے بھیڑیوں کا جھپٹنا بہادروں کے حملہ آور ھونے سے استعارہ ھے —

دل کے لئے گھاس چارہ تلاش کرنا دیدار معشوق سے تفریح چاھنے کا استعارہ ھے —

دبی ھوئی چنگاریوں کا سلگ اٹھنا کینوں کے ظاھر ھونے کا استعارہ ھے۔

موتی خاک پر بکھیرنا نصیحت ضایع کرنے کا استعارہ ھے —

صبح کی روشنی میں جاگنا بڑھاپے میں ھوشیار ھونے کا استعارہ ھے —

دل کے کناروں پر ابر چھایا رھنا شک و تردد کی حالت میں مبتلا رھنے کا استعارہ ھے —

یمن کے ریشمی منقش تھانوں کا وادی میں پھیلایا جانا رنگ برنگ کی نباتات کا نمایاں ہونے کا استعارہ ہے—

پردے کے انڈے کنواری پردہ نشین لڑکیوں کے لئے استعارہ ہے—

بچھو کے سوراخ سے کئی بار کاٹا جانا بار بار ایک ہی مصیبت میں مبتلا ہونے کا استعارہ ہے—

بان یا اند کی شاخوں کا لچکنا معشوق کے ساتھ چلنے کا استعارہ ہے—

ریت میں تیرنے والے سفینے اونٹوں کا استعارہ ہے—

اُس کے چہرہ پر خالص کُندن کی اشرفیاں بکھری ہوئی ہیں-یا اُس کے رخسارے پر شعری ستارہ نے طلوع کیا ہے-یا ثریا اُس کی پیشانی سے آویزاں ہے-یہ سب حسن و جمال کے استعارے ہیں—

موت کا ہنستے ہوے گھات سے نکلنا میان سے تلوار کھینچنے کا استعارہ ہے

وادی جواء کی نیل گائیں یا وجیرہ کی سفید ہرنیاں حسین عورتوں کا استعارہ ہے—

لہراتے سانپ لچکتے نیزوں کا استعارہ ہے—

لباس کا داغدار ہونا عزت بگڑنے کا استعارہ ہے—

تلوار کی دھار کُند ہونا جذبۂ شجاعت کے فنا ہونے کا استعارہ ہے—

عربی شاعروں کی تشبیہات

حملہ آور کی تشبیہ غضبناک اور بھوکے شیر سے—

نیزے کے کوچے سے خون تیزی کے ساتھ جاری ہونے کی تشبیہ بھری ہوئی مشک کے دھانے سے، جب کہ مشک کھول دی جاے—

لڑائی کی تشبیہ چکی سے—

سینے میں عداوت کے جوش کی تشبیہ ہانڈی کے جوش سے—

چوکنے آدمی کی تشبیہ شکرے سے—

پہاڑ کی گھاٹی سے تیزی کے ساتھ اُترنے کی تشبیہ شہباز کے جھپٹنے سے

جو اپنے شکار پر آ رہا ہو—

گھوڑوں کے دم اُٹھا کر بھاگنے دوڑنے کی تشبیہ دودھ والی اونٹنی سے جو بچا کُھچا دودھ دھنے سے گھبرا کر دم اُٹھاتی ہے—

تیز نگاہی کی تشبیہ گھوڑے کے بچے کی نگاہ سے جس کی عمر دو سال کی ہو—

لڑائی کے گھوڑوں کی تشبیہ بھوتوں سے جو تیز چلتے ہیں اور جن کے سر گرد آلود ہوتے ہیں—

جنگجو بہادروں کی تشبیہ شری کچھار کے شیروں سے—

زرہ پوش کی تشبیہ چیتے سے—

غصے سے ہلاک کرنے والے کی تشبیہ مقید اُونت سے جو ہری گھاس کو روند ڈالتا ہے—

انبوہ لشکر کی تشبیہ ٹڈی دل سے—

مددگار انسان کی تشبیہ تلوار سے جو وقت پر کام دینے میں کبھی خطا نہیں کرتی—

بری اور موذی اولاد کی تشبیہ وجع القلب (درد دل) سے—

چھوٹی لڑکیوں کی تشبیہ لوے کے بچوں سے—

غلام کی تشبیہ ترکش سے کہ جیسے وہ تیروں کا مخزن ہوتا ہے اسی طرح غلام اسرار کا مخزن ہوتا ہے—

چغل خوروں کی تشبیہ بچھوؤں سے—

دباؤ نہ ماننے کی تشبیہ اونٹنی کی اُس حالت سے جب کہ وہ با وجود پاؤں باندھنے کے دودھ نہ دے—

بہادر آدمی کی تشبیہ شیر کی ناک سے جس نے ذلت کی بو کبھی نہیں سونگھی—

عورت کی تشبیه هرن سے، نیل گاے سے اور پتھر کی مورت سے--

نیزوں کے باهم ٹکرانے کی تشبیهہ بھوکے مینڈکوں کی آواز سے—

لڑائی کے سخت دن کی تشبیهہ ایسے تاریک دن سے جس میں تارے نظر آئیں—

ایسا شخص جو دوسروں کو تکلیف پہنچائے اور اُس کا کوئی کچھه نه بگاڑ سکے، اُس کی تشبیهہ نیلی مکھی سے، جو اونٹ کو کاٹتی هے اور اونٹ کا اُس پر قابو نهیں چلتا—

لڑائی هوتی دیکھکر لڑائی میں شامل هونے والے کی تشبیهہ خارشتی اونٹ سے که اس کے سبب سے تندرست اونٹوں کو بھی خارش هوجاتی هے—

رات کی تاریکی کی تشبیهہ سمندر کی موج سے—

گانے میں درد ناک آواز کی تشبیهہ بچه دار اونٹنیوں کے رونے سے، جن کے بچے ایام بهار میں مرچکے هیں—

نازک اندام عورتوں کی تشبیهہ آکھی یا ارنڈ کے پودوں سے—

ارادے کے پکے انسان کی تشبیهہ سانپ کے سر سے که جهاں چاهتا هے بے تکلف گھس جاتا هے—

اونٹنی کی چال کی تشبیهہ ایسے بادل کی چال سے، جو جنوبی هوا کے ساتھه دوڑتا هو اور پانی سے خالی هو—

گھوڑی کی رفتار کی تشبیهہ پیاسی کبوتری کے اُڑنے سے—

سخی آدمی کی تشبیهہ موسم بهار سے—

گوری پنڈلیوں کی تشبیهہ هاتھی دانت یا سنگ مر مر کے ستونوں سے—

لٹیروں اور حمله آوروں کی تشبیهہ عقاب سے—

شراب کے پینے سے انگلیوں کے پوروں میں جو دوران خون هوتا هے، اُس کی تشبیهہ چینوٹیوں کے رینگنے سے—

نازنین عورتوں کے نزاکت کے ساتھہ چلنے کی تشبیہہ سفید پتلے سانپ کے رینگنے سے، جس کو صبح کی شبنم نے ٹھنڈا کر دیا ہو اور اپنے پورے بل نہ کھول سکتا ہو—

عاشق کے رونے کی تشبیہہ کبوتری کے رونے سے—

آگ کے شعلوں کی تشبیہہ اونٹ کے سرخ پھیپڑوں سے—

نامرد انسان کی تشبیہہ کفتار، خرگوش اور شتر مرغ سے—

آسانی سے مطلب حاصل ہونے کی تشبیہہ خرما کھانے سے—

تکلیفیں برداشت کرنے کی تشبیہہ ایلوا چاٹنے سے—

ذلیل آدمی کی تشبیہہ میدان کی کھمبی سے کہ جو چاہے اُسے توڑ کر لے جائے-

جو لوگ کاہل ہوں اور سفر کے عادی نہ ہوں، اُن کی تشبیہہ بنات النعش سے-کیونکہ وہ قایم ہیں اور دیگر ستاروں کے ساتھہ حرکت نہیں کرتے—

وہ شخص جو کسی کا مطیع و محکوم ہوجائے، اُس کی تشبیہہ خارشتی اونٹ سے، جو روغن قار* ملنے والے کا مطیع ہوجاتا ہے-(خارشتی اونٹوں کے بدن پر روغن قار ملا جاتا تھا اور اس سے ان کی خارش کو سکون حاصل ہوتا تھا)-

اونٹوں کے کوہانوں کی تشبیہہ مٹی کے ان ڈھیروں سے جو چیونٹیوں کے گھروں کے آس پاس جمع ہوتے ہیں—

دانتوں کی تشبیہہ بابونہ کے پھولوں سے—

اونٹنی کی چربی کی تشبیہہ بٹے ہوئے سفید ریشم کی جھالر سے—

---

* ہمارے ہاں روغن قاز ملنا محاورہ ہے-یعنی خوشامد کی باتوں سے کسی کو خوش کرنا-عجب نہیں کہ اِس محاورہ میں روغن قاز کی جگہ روغن قار ہو کیونکہ جس طرح روغن قار ملنے سے خارشتی اونٹ کو سکون حاصل ہوتا ہے اسی طرح خوشامد پسند انسان خوشامد کی باتوں سے خوش ہوتا ہے-اگر کاتبوں نے ر کو ز بنادیا ہو تو کیا تعجب ہے (سلیم)

عورتوں کی تشبیہہ شتر مرغ کے انڈوں سے (یہ تشبیہہ رنگ کے لحاظ سے ہے-شتر مرغ کے انڈے کے رنگ میں سفیدی کے ساتھہ ھلکی زردي ھوتی ہے اور یہ رنگ اھل عرب کے نزدیک پسندیدہ تھا)—

معشوقہ کی گردن کی تشبیہہ گردن آھو سے—

حسین عورتیں کی کمر کی تشبیہہ اونٹ کی مہار سے—

ساق کی تشبیہہ نرکل کی شاداب پوری سے—

گھنے بالوں کی تشبیہہ درخت خرما کے خوشے سے—

نرم و نازک اُنگلیوں کی تشبیہہ موضع ظبی کے اُن کیڑوں سے جو سفید رنگ کے ھوتے ھیں اور جن کے سر لال ھوتے ھیں اور جن کو اسروع کہتے ھیں—

انگلیوں کی تشبیہہ اسحل کی مسواکوں سے (یہ عرب کا ایک درخت ھے جس کی شاخیں پتلی اور نرم اور سیدھی ھوتی ھیں اور اِن شاخوں کی مسواکیں بنائی جاتی ھیں) —

ایسا آدمی جو شریر ھو اور جسے کوئی آدمی پاس بٹھانے کا روادار نہ ھو اس کی تشبیہہ جوے کے اُس تیر سے جس کا کچھ حصہ نہیں ھرتا اور جسے ھر شخص اپنے پاس سے ھٹاتا ھے—

ذلیل آدمی کی تشبیہہ آب پاشی کے اونٹ سے جو چرس کھینچنے کی حالت میں کبھی آگے جاتا اور کبھی پیچھے ھٹتا ھے-یعنی آب پاشی کرنے والے شخص کے اشارے کا تابع ھوتا ھے—

لشکر کی تشبیہہ پھیلے ھوے برسنے والے ابر سے یا سیلاب سے کہ جو کچھہ اُس کے سامنے آتا ھے اُس کو بہا لے جاتا ھے —

جلا قوم شخص کی تشبیہہ خارشتی اونٹ سے جو تندرست اونٹوں سے الگ باندھا جاتا تھا—

زلفوں ی تشبیہہ درخت تنوم کے سانپوں سے جو اُس کے گرد بیٹھے

رهتے هیں —

تند خو آدمی کی تشبیه شیر سے جو اپنے بچوں سے جدا کیا جاے —

تیز رفتار گھوڑے کی تشبیه ایسے شاهین سے جس نے میدان میں خرگوش کو دیکھا هو اور درختوں کے جھنڈ میں اُس کے بھاگ کر چھپ جانے سے پہلے اُس کو آلیا هو —

بے صبر آدمی کی تشبیه چتکبری اونٹنی سے جو دردزہ میں مبتلا هو۔ (خیال تھا که اس رنگ کی اونٹنی صابر نہیں هوتی) —

فریب زدہ اور احمق آدمی کی تشبیه اُس شخص سے جو سراب کی لہروں کو دیکھکر اپنی مشک کا پانی بہادے —

زرہ کی تشبیه ایسی جھیل کی سطح سے جس کے پانی کو باد دبور آهسته آهسته حرکت دے —

نیزوں کے پے درپے پڑنے کی تشبیه جلاهوں کے اُس آله سے جسے برولہ کہتے هیں اور جسے تھان کے ناهموار تاروں کے برابر کرنے کے لئے تھان پر پھیرتے هیں اور وہ تھان کو خوب کھرچتا اور اُس میں گھس جاتا هے —

جنگجو آدمی کی تشبیه زرد رنگ کے پتلے سانپ سے جو زهر اُگلتا رهتا هے —

چالاک اور پھرتیلے آدمی کی تشبیه کفتار کے بچے سے —

شراب کی صراحیوں کی تشبیه بطخوں سے —

حسین عورت کی تشبیه شعری ستارے سے جو کہکشاں سے گزر رها هو —

شہد کی مکھی برابر هاتھه پر هاتھه مارتی هے جس طرح اُنگلی کٹا آدمی آگ نکالنے کے لئے چقماق کے پتھروں کو ایک دوسرے پر مارتا رهتا هے —

و اور هم ایک دوسرے سے اس طرح دور هیں جیسے فرقدین کے ستارے۔

دنیا اُس پر اس طرح تنگ هوگئی جیسے وہ چھوٹا سا گول گڑھا جس پر

صیاد اپنا جال بچھاتا ہے —

اُن کے ہمسایے آفتوں سے اس طرح محفوظ ہیں جیسے پہاڑی بکریاں جنگلی درندوں سے —

دشمن جنگ میں کامیابی حاصل کرنے کے لئے اس طرح زور لگا رہے ہیں جیسے کوئی حاملہ عورت بچہ جننے کے وقت کونتھتی ہے —

سردار کے گرد اُس کے محافظ اس طرح گھومتے تھے جیسے دوار بت کے پرستار اُس کا طواف کرتے ہیں —

محبوبہ میرے ساتھ اس طرح شوق سے چلی جیسے لوا پیاس میں چشمے کی طرف لپکتا ہے —

ناظرین ان کنایوں استعاروں اور تشبیہوں پر بھی اگر غور کی نظر ڈالیں گے تو یہ بات اُن پر روشن ہو جائے گی کہ عرب کے شاعروں نے ان میں بھی اپنی ملکی خصوصیات کا لحاظ رکھا ہے۔غرضکہ عرب کی شاعری اُن تمام خصوصیات کی ترجمان ہے جو عرب اور اہل عرب سے تعلق رکھتی ہیں۔جب تک ہماری زبان کا ادب ہندی شاعری اور عربی شاعری کی طرح ہماری ملکی خصوصیات کا ترجمان نہ ہو گا اُس کو ملکی ادب کہلانے کا کوئی حق نہیں ہے۔ہم نے اپنے قومی اور مذہبی خیالات و روایات کو اپنے ادب میں بھر دیا ہے۔اس کا کوئی مضائقہ نہیں ہے۔لیکن افسوس اس بات کا ہے کہ ہم صدیوں سے جس ملک میں آباد ہیں اُس کی خصوصیات کی جھلک ہماری نظموں اور نثروں میں نہیں ہے۔ہندوستان میں کونسی ایسی دلربا اور شاندار چیز نہیں ہے جو ہندوستان سے باہر کے ملکوں ہی میں پائی جاتی ہے۔یہاں بلند اور شاندار پہاڑ ہیں جن کی چوٹیاں برف سے ڈھکی رہتی ہے۔یہاں گنجان جنگل ہیں جن میں عجیب اور خوفناک درندے آباد ہیں۔یہاں ایسے دلکش سبزہ زار ہیں جن کے منظروں کو دیکھکر انسان اش اش کرتا ہے۔یہاں ایسے

رنگ برنگ کے پھول ھیں جن کی رنگینیاں قوس قزح کو مات کرتی ھیں۔یہاں ایسے خوش الحان طیور ھیں جن کی راگنیاں روحانی جذبات کو زندہ کرتی ھیں۔یہاں ایسے دریا ھیں جن کے پانیوں کی روانی اور دوانی تخیل کی سطح میں ھلکورے پیدا کرتی ھے۔یہاں ایسی نسلیں آباد ھیں جن کے اسلاف تمدن کی شاندار عمارتیں کھڑی کر چکے ھیں۔یہاں قدم قدم پر حسن ھے، عظمت ھے، رنگینی ھے، دلفریبی ھے۔غرضکہ شاعر مزاج افسانوں کے لئے وہ سامان موجود ھے کہ اگر وہ ذرا کروٹ لیں اور غفلت کی آنکھیں کھول دیں، تو ایک شاندار اور جمیل ادب کی بنیاد رکھہ سکتے ھیں۔ھندؤں نے اب سے پہلے فطرت کے ان منظروں پر نگاہ دوڑائی ھے۔اگر ھم بھی اُسی عینک سے کام لیں تو ھمارا ادب اور ان کا ادب ایک ھوجائے گا اور آج نہیں کل ضرور ھم ایک علم کے سایے میں ترقی کے قدم بڑھائینگے۔مگر اُس وقت کے آنے سے پہلے اپنی غلطیوں اور غفلتوں کی تلافی کرنی ضروری ھے—

پیپل

از

(جناب محمد عظمت اللہ خاں صاحب بی اے)

اونچے اونچے پھیلے پھیلے فطرت کے پالے پیپل
سرد و گرم زمانہ دیکھے
جتنے مضبوط اُتنے ہی پرانے گہری جڑوں والے پیپل
جتنا اوپر اُتنا نیچے

-:o:-

لوں کی لپٹیں تجھکوں جھلستیں آندھیاں دیتی ہیں تھپیڑے
اولوں کی چھالیں جاڑوں کے پالے
بادل کی گرج بجلی کی کڑک مینہ کے دھواں دھار دڑیڑے
سب سہتا ہے سینہ نکالے

-:o:-

گرمیاں آئیں تیرے پتے سوکھنے پیلے پڑنے لگے
رت کی سختی کیا جھیلینگے
اے لو! پتے سوکھے سوکھے اپنے آپ ہی جھڑنے لگے
پتوں کے نیچے ڈھیر لگینگے

-:o:-

ننھی ننھائی ننگی لنڈوری ٹھنٹھ ہوئی اک اک ڈالی
پت جھڑ نے ہاتھ یہ پھیرا ہے
ڈراؤنا سا سوکھا ڈھچر ترا خالی خالی
ایک رنڈاپا سا چھایا ہے

نوع نے تیری سختیاں جھیلیں اس کا ہی شاید ہے پھل
جنم نیا تو پھر لیتا ہے
ترت ہی تونے کایا پلٹی پیپلیاں ہیں اور کونپل
قدرت کا ایک تماشا ہے

:o:

کونپلیں تازی سوئیوں جیسی رنگ وہ دھانی ہلکا سا
اس میں جھلک وہ پیاری پیاری
ٹہنی ٹہنی پیپلیاں ہیں جڑے ہوے نگ ہیں گویا
جان کی ہے اک شعبدہ بازی

———:o:———

دو اک دن میں کونپلیں ساری پتے بنی ہیں کھل کھل کر
ننھے ننھے چکنے چمکتے
پیپلیاں بھی ہو چلیں گدری پکشی آتے ہیں تل تل کر
کھاتے پھدکتے اور چہکتے

———:o:———

چند ہی دن میں بڑھ گئے پتے لدی ہوئی ہے ہر ڈالی
جان پڑی ہے رونق ائی

چھاؤں ہے ٹھنڈی روکھہ ہرے ہیں آنکھوں میں گھبتی ہریالی
ایک دلہن سنوری سنورائی

-:o:-

پتے چکنے چکنے ٹھنڈے ہری بھری ٹہنی ٹہنی
تو ہے اک قدرت کا ڈیرا
پکشی بولیاں بولنے والے دن رات کی تیری بستی
دن کا ٹھکانا رین بسیرا

-:o:-

کوئی بڑا سا تیرا پتا بالک کے ہاتھہ آتا ہے
موڑا اینٹھا ماتھے پہ ٹھونکا
گھر پہ ڈنٹھل باندھ پپیہیا اک خاصا بن جاتا ہے
منہ سے پھونکا اور بول اُٹھا

میری ہستی بھی اے پیپل! تیری سی اونچی گہری ہو
گھنی گھنی پھیلی پھیلی ہو
جان کی سوتوں تک اک اک جڑ گہرائیوں میں پہنچی ہو
آندھیاں جھیلی مضبوطی ہو

-:o:-

سوکھے سکھائے آدھ موئے بیدم جھڑ جائیں من کے پتے
آئیں پتے تازے
لے کوئی بیکل روح بسیرا بھٹکا من چھاؤں میں بیٹھے
بچوں کو ہاتھہ آئیں پپیہے

غالب کا فلسفہ

از

جناب مولوی سید ہاشمی صاحب - رکن دارالترجمہ عثمانیہ یونیورسٹی)

مرزا اسد اللہ خان غالب کے حالات زندگی اور شاعری' قریب زمانے کی تاریخ اور اسلامی ہند کی مخلوط تہذیب کا خاصا دلچسپ مرقع ہے - مرزا کے دادا شاہ عالم (ثانی) کی بادشاہی میں سمرقند سے ہندوستان آئے اور اُن کی زبان ترکی تھی - مرزا کی تعلیم فارسی میں ہوئی لیکن مادری زبان اُردو بن گئی! ابتداً اسی زبان میں اُنہوں نے شعر کہنا شروع کیا —

مرزا کے اجداد تلوار کے دھنی' جانباز سپاہی پیشہ لوگ تھے اور شاہ عالم کے آخر زمانے کی لڑائیوں تک ہم انہیں مصروف جنگ و پیکار دیکھتے ہیں - لیکن خود مرزا صاحب کو دیکھئے تو محض ایک ناز پروردہ بزمی امیر زادے ہیں جنہیں میدان رزم کی ہوا بھی نہیں لگی —

اسی طرح مذہبی خیالات اور قومی جذبات میں تغیر نظر آتا ہے کہ مرزا کے بزرگ اور دیگر اہل خاندان تو "ماوراالنہری" سنی ہیں مگر خود اُن پر شیعیت غالب ہے اور کچھہ اپنے نومسلم پارسی اُستاد کے فیض تربیت سے اور غالباً کچھہ فارسی تاریخوں کے نامعتبر قصص و روایات پڑھکر وہ ذوق و مزاج کے اعتبار سے خالص ایرانی بن گئے ہیں اور ترک نژاد ہونے کے باوجود اپنے آپ کو دولت پارسی کا مورث و نوحہ خواں سمجھنے لگے ہیں - جیسا کہ اشعار ذیل سے تراوش ہوتا ہے —

گهر از رایت شاهان عجم بر چیدند به عوض خامۂ گنجینه فشانم دادند
افسر از تارک ترکان پشنگی بردند به سخن ناصیۂ فرکیانم دادند
هرچه از دستگهه پارس به یغما بردند تا بنالم هم از اں جمله زبانم دادند

حالات و خیالات کی یہ نیرنگی اس بات کی دلیل ہو سکتی ھے کہ مرزا غالب کو بہت تغیر پسند طبیعت ملی تھی اور عجب نہیں کہ اسی مزاج کی بدولت ان کے کلام میں وہ بو قلمونی پیدا ہوگئی ہو جس پر غالب کے ہر طالب علم کی نظر پڑتی ھے-یہ خصوصیت دیوان اردو کی نسبت فارسی کلیات میں زیادہ نمایاں ھے اور اس کی غزلیات و قصائد میں کہیں بیدل کی غامض فلسفیت' کہیں عرفی کا شکوہ' حزیں کا تیکھاپن نظر آتا ھے کہیں نظیری کا حکیمانہ حسن بیان اور طالب و ظہوری کی سنجیدہ روانی- بے شبہ جس طرز پر جو کچھ کہا ھے وہ اس رنگ میں نہایت خوب ھے لیکن اسی خصوصیت نے مرزا کے دیوان میں ایک خاص تنوع پیدا کر دیا جو معتقدین کے نزدیک تو ھمیں بہت سے اساتذہ متاخرین کے مطالعہ سے مستغنی کر دیتا ھے مگر نکتہ چینوں کی نگاہ میں شاعر کی یہ رنگا رنگی خامی کی دلیل ھے اور یہی خیال مفتی صدرالدین خاں آرزو نے ایک موقع پر ظاھر کیا تھا*—

مولانا حالی مرحوم نے طرز بیان کے اس اختلاف کی بہت خوبی سے توجیہ کی اور وضاحت سے بتایا ھے کہ ابتدا میں مرزا صاحب نے زمانے کے مقتضی سے بیدل و اسیر کا رنگ اختیار کیا تھا اور یہ اُن کی بڑی ترقی اور سلامتئی طبع بلکہ اجتہاد فکر کی علامت ھے کہ وہ از خود اس راہ کی خرابیوں سے آگاہ ہوے اور اسے چھوڑ کر انہوں نے ظہوری اور نظیری کا تغزل اختیار کیا—

خود مرزا غالب نے اپنے بعض خطوط میں یہی بات لکھی ھے لیکن اس قول

---

* یادگار غالب

کی سب سے اچھی تصدیق اُن کے اردو دیوان، خاص کر "نسخہ حمیدیہ" کے دیکھنے سے ہوتی ہے کہ ابتدائی زمانے کا کلام تو اس درجہ مغلق اور پیچیدہ ہے کہ بعض شعر بالکل معما بن گئے ہیں مگر بخلاف اس کے، آخر زمانے کے اشعار حسن سلاست کا نمونہ ہیں اور مثال کے طور پر، الف و یا کی ردیف میں آخر عہد کی متعدد غزلیں ایسی موجود ہیں جو لطافت و سادگی میں کسی طرح میر و داغ کے منتخب اشعار سے کم نہیں اور یہ اُس شخص کی یقیناً بڑی تعریف ہے جس نے شاعری اس قسم کے شعروں سے شروع کی تھی کہ:—

خود آرا وحشت چشم پری سے شب وہ بدخو تھا
کہ موم آئینہ تمثال کو تعویذ بازو تھا
غم مجنوں عزاداران لیلیٰ کا پرستش گر
خم رنگ سیاہ از حلقہ ہائے چشم آہو تھا

(نسخہ حمدیہ صفحہ ۲۹)

لیکن مرزا غالب کے شعر سادہ ہیں یا پیچیدہ، اس بات کو یاد رکھنا چاہئیے کہ ان کی شخصیت کا نقش ہر جگہ متجلی ہے۔ ہر خیال جو نغمہ و صوت کی صورت میں ملفوظ ہوا شاعر کے اوصاف ذاتی اور جذبات امتیازی کا سراغ ہے۔ یہ وہ خصوصیات طبعی ہیں جن سے مرزا کی زندگی اور شاعری ابنائے ملک میں ممتاز ہوئی۔ یعنی اُن کی بلندخیالی، عالی ظرفی، مہر و صداقت، استغنا و خودداری وغیرہ۔ زندگی ہی میں اُن کی مہر و مسالمت ضرب المثل ہو گئی تھی۔ اُن کی شرافت و راستی کے قصے آج تک زباں زد ہیں وہ نہایت فیاض اور عالی حوصلہ طبیعت رکھتے تھے اور گو عملی دنیا میں انہوں نے کوئی بڑا کام نہیں کیا لیکن عالم خیال میں ان کا ظرف جب کرتا وہ بجلی طلب کرتا جس کی طور کو تاب نہ آئی تھی اور ان کی آنکھ جب چاہتی وہ قطرۂ اشک چاہتی جس نے موتی بننا پسند نہ کیا تھا!—

کلام کی سادگی کے متعلق ایک اور بات بھی قابل گزارش ھے - وہ یہ کہ اگر ھم ان کے اردو کلام کو سامنے رکھیں جس کے تقدم و تاخر کا حال زیادہ یقینی طور پر معلوم ھے تو یہ اندازہ کئے بغیر نہیں رہ سکتے کہ شاعر کی یہ سلاست وسہل گوی سن و سال کے ھمقدم بڑھی ھے اور طرز سخن کے ساتھہ مضامین شعر میں بھی تغیر ھوا ھے - یعنی فلسفیانہ مسائل اور نازک خیالی کے بدلے آخری غزلوں میں زیادہ تر عاشقی اور "معاملہ بندی" کے مضموں آتے ھیں اور نئی ترکیبوں اور عجیب و نادر تشبیہوں کی بجاے عام فہم استعارے اور صرف سادہ اور شستہ الفاظ سے کام لیا گیا ھے - یہ اشعار سلاست کے زیور سے آراستہ ھیں اور سلاست بجاے خود شاعری کی بڑی خوبی ھے - لیکن اسی کے ساتھہ ھم دیکھتے ھیں کہ گو تخیل کی قوت اور بلندپروازی میں کمی نہ آی ھو' اس کے صرف کرنے میں سن رسیدہ شاعر محنت و کاوش سے ضرور پہلوتہی کرنے لگا ھے - اُس کی مثال شاید اس پہلوان کی سی ھے جو فن کشتی کا مشتاق ماھر ھے مگر عمر کے اقتضا سے زور طلب اور گھرے داںو کرنے سے بچتا ھے اور انہی چند داںو پیچ سے کام نکال لیتا ھے جو اُسے خوب رواں اور دیکھنے والوں کو مرغوب ھیں —

اس سلسلے میں مجھے مرزا غالب کے سب سے آخری کلام کا خیال آیا - نواب احمد سعید خاں صاحب طالب مرحوم فرماتے تھے کہ مرزا کی سب سے آخری غزل جس کے چندھی روز بعد وہ مرض الموت میں مبتلا ھوے یہ ھے : —

شب وصال میں مونس گیا ھے بن تکیہ
ھوا ھے موجب آرام جان و تن تکیہ

خراج بادشہ چیں سے کیوں نہ مانگوں آج
کہ بن گیا ھے خم جعد پر شکن تکیہ

بنا ہے تختۂ گلہاے یاسمیں بستر
ہوا ہے دستۂ نسریں و نسترن تکیہ

فروغ حسن سے روشن ہے خواب گاہ تمام
جو رخت خواب ہے پرویں تو ہے پرن تکیہ

مزا ملے کہو کیا خاک ساتھ سونے کا
رکھے جو بیچ میں وہ شوخ سیم تن تکیہ

اگرچہ تھا یہ ارادہ مگر خدا کا شکر
اٹھا سکا نہ نزاکت سے گلبدن تکیہ

ہوا ہے کاٹ کے چادر کو ناگہاں غائب
اگرچہ زانوے فل پر رکھے دمن تکیہ

بضرب تیشہ وہ اس واسطے ہلاک ہوا
کہ ضرب تیشہ پہ رکھا تھا کوہکن تکیہ

یہ رات بھر کا ہے ہنگامہ صبح ہونے تک
رکھو نہ شمع پہ اے اہل انجمن تکیہ

اگرچہ پھینک دیا تم نے دور سے لیکن
اٹھاے کیوں کہ یہ رنجور خستہ تن تکیہ

غش آگیا جو پس از قتل میرے قاتل کو
ہوئی ہے اس کو مری نعش بے کفن تکیہ

شب فراق میں یہ حال ہے اذیت کا
کہ سانپ فرش ہے اور سانپ کا ہے من تکیہ

روا رکھو نہ رکھو تھا جو لفظ "تکیہ کلام"
اب اس کو کہتے ہیں اہل سخن "سخن تکیہ"

هم اور تم " فلک پیر " جس کو کہتے ہیں
فقیر غالب مسکین کا ہے کہن تکیہ *

غزل میں مرزا صاحب کا خاص انداز نمایاں ہے اور شعر لطف سے بھی خالی نہیں مگر ایک تو ردیف سے کلام میں کچھ تکلف پیدا ہوگیا دوسرے دو تین کے سوا باقی سب شعر صرف " قافیہ پیمائی " نظر آتے ہیں حالانکہ مرزا صاحب نے اپنی رائے کو خود کئی جگہ ظاہر کیا ہے کہ شاعری قافیہ پیمائی نہیں، مضمون آفرین کا نام ہے —

-:o:-

مگر یہاں ہمیں کلام غالب کی خصوصیات پر بحث کرنی نہیں ہے - بہترین قلم یہ خدمت انجام دے چکے ہیں اور یادگار غالب میں اگر جس اعتقاد اور غالب پرستی کے عنصر کی یا اسے مغربی شاعری سے ٹکراں کی کمی رہ گئی تھی تو اسے ڈاکٹر بجنوری مرحوم کے لاجواب مضمون نے پورا کر دیا ہے - ہم اس موقع پر ایک مختصر تمہید کے بعد صرف " فلسفۂ غالب " کا مطالعہ کرنا چاہتے ہیں - یعنی غالب کے اردو دیوان کی روز افزوں قبولییت دیکھکر ہمیں اس بات پر غور کرنے کا خیال آیا کہ غالب کی تعلیم کیا ہے ؟ اور کس قسم کے خیالات ہیں جنہیں شاعر اپنے سامعین کے دلنشیں کرنا چاہتا ہے ؟

یہ سچ ہے کہ شاعری حکمت و فلسفہ نہیں مگر حکیمانہ اور فلسفیانہ ضرور ہوسکتی ہے - اسے درس کے نصاب میں داخل نہ کیا جاے لیکن لوگوں کے ذوق اور خیالات پر اس کے اثر سے کوی انکار نہیں کرسکتا - شاعری کی تعریف

---

* یہ غزل کسی مشاعرے کے واسطے لکھی گئی اور غالباً اس کے گل دستے میں چھپی بھی تھی - مگر حال میں اسے طالب مرحوم کی قلمی بیاض سے اڈیٹیر الہلال نے نقل کر کے اپنے اخبار میں شائع کیا اور اس سے مطبع نظامی بداوں نے لے کر اپنے نسخہ دیوان غالب کے آخر میں شامل کر دیا ہے —

کرنے میں اہل فکر نے عجیب عجیب موشگافیاں کی ہیں-انہیں پڑھکر بعض دفعہ مجھے گمان ہوا کہ شاید تعریف کرنے والے سوچتے سوچتے شاعری کی بجاے "بہترین شاعری" کی تعریف کرنے لگے ہیں اور اسی لئے اُن کے بیانات میں سخت اختلاف و بتائن نظر آتا ہے- کیونکہ اچھی شاعری کا تصور ہر شخص کے دماغ میں جداگانہ ہے-ورنہ میری دانست میں نفس شاعری کی ہمہگیری اس تعریف میں سما سکتی ہے کہ "شاعری حسن بیان کا دوسرا نام ہے!" وہ ہر زبان میں الفاظ کے صحیح اور پر تاثیر استعمال کا مستقل فن ہے اور قواعد عروض-موسیقی اور تمثل سب سے بے نیاز و آزاد ہے-یہ چیزیں اس کے لطف و دلکشی میں اضافہ کرتی ہیں مگر اس کا لازمہ نہیں اور اگر ایسا نہ ہو تو قصائد قآنی کا ثنا خواں و ہشت میں اور ٹاگور کی شاعری کا کبھی لطف نہ اٹھاے اور نظیری کا مداح "نہال دمے" سن کر کبھی نہ جھومے—

یہ درست ہے کہ ہر شاعر کی شاعری پر تاثیر و حکیمانہ نہیں ہوتی-اسی طرح جس طرح ہر نام نہاد واعظ، خطیب اور ہر جبہ پوش درویش صاحبدل نہیں ہوجاتا-عروض و موسیقی نے شاعری کو صنعت بنادیا ہے اور اکثر نا اہل شعر کہتے اور شاعر سمجھے جاتے ہیں-یہی رنگ دیکھکر مرزا غالب نے فریاد بلند کی تھی کہ:-

آنکہ صور نالہ در شور نفس موزوں دمید
کاش دیدی کایں نشید شوق، فن خواہد شدن
چشم کور آئینۂ دعوی بکف خواہد گرفت
دست شل مشاطۂ زلف سخن خواہد شدن

لیکن اگر مزکورہ بالا تعریف تسلیم ہو تو تاثیر شعر میں کسی گفتگو کی گنجائش نہیں رہتی-حسن بیان کا جیاد و ہر شخص نے صحبت احباب میں، بازر کی دکان میں، وعظ کی محفل میں، سیاسی جلسوں میں مشاہدہ کیا ہوگا- وہ یونانی

حکیم بھی جس نے شعرا کو اپنے خیالی ملک سے قابل اخراج قرار دیا تاثیر شعرا کا منکر نہ تھا بلکہ اس کے برے اثرات سے خوف کھاتا تھا۔ عالم گیر بادشاہ کی طرح جس نے دیوان حافظ کا درس حکماً موقوف کردیا تھا۔ بیان کرتے ہیں کہ جرمنوں کو دنیا کی نامی گرامی قوم بنانے کے اسباب قوی میں ایک شاعر کا قلم بھی ناگزیر شمار ہے—

———:o:———

یہ کہنا صحیح نہ ہوگا کہ مرزا غالب نے مولوی رومی کی طرح رشد و ہدایت کے لئے شاعری کا پیرایہ اختیار کیا تھا لیکن اس میں بھی کچھ کلام نہیں کہ انہوں نے محض تفنن یا عاشقانہ مضامین لکھنے کے واسطے یہ دردسری نہیں اٹھائی اور اکثر اشعار مسائل زندگی پر اُن کے افکار و آرا کا ایک جامۂ خوشنما ہیں۔ ابتدائی کلام سے اس قسم کے چند نمونے ملاحظہ ہوں:— غزل (۱)

شکوہ و شکر کو ثمر بیم و امید کا سمجھ
خانۂ آگہی خراب— دل نہ سمجھ بلا سمجھ

وحشت درد بے کسی بے اثر اس قدر نہیں
رشتۂ عمر خضر کو نالۂ نارسا سمجھ

اے بہ سراب حسن خلق تشنۂ سعی امتحاں
شوق کو منفعل نہ کر ناز کو التجا سمجھ

گاہ بہ خلد امید وار گہ بہ جحیم بیمناک
گرچہ خدا کی یاد ہے کلفت ما سوا سمجھ

ہے خط عجز ما و تو اول درس آرزو
ہے یہ سیاق گفتگو۔ کچھ نہ سمجھ فنا سمجھ

نغمہ ہے محو ساز رہ۔ نشہ ہے بے نیاز رہ
رند تمام ناز رہ خلق کو پارسا سمجھ

غزل (۱)

قطع سفر ہستی و ارارم فنا ہیچ
رفتار نہیں بیشتر از لغزش پا ہیچ

حیرت ہمہ اسرار پہ مجبور خموشی!
ہستی نہیں جز بستن پیمان وفا ہیچ

تمثال گداز آئینہ ہے عزت بینش
نظارہ تحیر، چمنستان بقا ہیچ

کس بات پہ مغرور ہے اے عجز تمنا
سامان دعا وحشت و تاثیر دعا ہیچ

اسی طرح اس قصیدے کی تشبیب:—

توڑے ہے عجز تنک حوصلہ بر روے زمیں
سجدہ تمثال وہ آئینہ کہیں جس کو " جبیں "

اور یہ پورا قصیدہ: ع:—

جو نہ نقد داغ دل کی کرے شعلہ پاسبانی۔
تو فسردگی نہاں ہے بکمین بے زبانی

جو پہلی مرتبہ بحالت اصلی نسخہ حمیدیہ میں چھپے (صفحہ ۳۰۱، ۳۰۷) فلسفیانہ کلام کا نمونہ ہیں اور انہیں پڑھنے میں بعض وقت معلوم ہوتا ہے کہ گویا شاعر الفاظ کے راگ میں انسانی زندگی پر ایک دلچسپ و عبرت آموز خطبہ گا رہا ہے—

یہی فلسفیت غالب کی قبولیت کا راز ہے۔ فارسی شاعری میں بلند رتبہ فلسفیانہ کلام کے بہت سے نمونے موجود ہیں لیکن ہندوستان کے جدید تعلیم یافتہ جس کی نگاہ سے فارسی ادب محجوب ہوتا جاتا ہے۔ اردو زبان میں

کلام غالب کو نادر و مغتنم شے پاتے ھیں۔ سوقیانہ اور فرسودہ مضامین عاشقی کی بجاے انھیں جا بہ جا مشرقی تغزل کے لباس میں ایسے بلند اور حکیمانہ خیالات نظر آتے ھیں جن سے دماغ میں جودت و تازگی اور تخیل میں رفعت اور پروازکی قوت پیدا ھوتی ھے—

غالب کے فلسفیانہ خیالات کو پرتالنا اس مضمون کا مقصود ھے—

جیسا کہ ھم نے پہلے اشارہ کیا، فلسفہ شعر کو درسی باقاعدگی کی نظر سے جانچنا نہ چاھئے۔ خیال کی دنیا جس میں شاعر مصروف سیر ھے، حقیقی دنیا سے کہیں زیادہ وسیع، کہیں زیادہ حیران ساز ھے اور بلند فکر شعرا میں بہت کم ایسے ھیں جو کسی خاص نقطے کو اپنا مطمح نظر بنا سکے ھوں ورنہ جس طرح دماغ شاعر متضاد افکار و اوھام کا مہبط ھے اسی طرح کلام شاعر میں بھی بالکل مختلف جذبات اور متبائین خیالات نظر آتے ھیں۔ مرزا غالب کی شاعری اس عام قاعدے سے مستغنی نہیں۔ پھر بھی غور کرنے سے اندازہ ھوسکتا ھے کہ مسائل زندگی پر اُن کی راے کیا ھے اور وہ خیال کی کن کن منزلوں سے گزری ھے۔ چنانچہ اگر ھم ان خیالات کو بطور خود چند مدارج میں مرتب کرنا چاھیں تو پہلی منزل کو شوق تماشا سے منسوب کرسکتے ھیں جس میں شاعر نہایت اشتیاق کے ساتھہ صحیفۂ حیات کا مطالعہ کرنے میں مصروف ھے۔ یہ شوق کچھہ عرصے کے بعد تحیر و گم گشتگی سے بدل جاتا ھے اور آخر میں اسے معلوم ھوتا ھے اس دید و تماشا کا حاصل کچھہ نہ تھا۔ یہ گویا سالک راہ کی تیسری منزل تھی اور اس سے آگے بڑھنے میں اس پر ایک خاص قسم کا ھیجان و اضطراب طاری ھوتا ھے کیونکہ اگلی منزل محض یاس و تاریکی کا عالم ھے جہاں شاعر پر دنیا کی بے ثباتی اور زندگی کی بے حقیقتی پوری طرح آشکار ھوجاتی ھے حتی کہ رفتہ رفتہ وہ عالم تسلیم و فنا میں آجاتا ھے جو اگرچہ عشق کی معراج اور نہایت دلکش مقام ھے

لیکن انسان کو جیتے جی مردہ اور معطل کر دیتا ہے۔اسی لئے اہل ہمت یہاں سے بھی ترقی یا رجوع الی البقا کرتے ہیں اور اسی بے بود اور محدود زندگی کو طلب صادق میں گزارنا مقصود حیات سمجھتے ہیں۔ مطلوب حقیقی کی طلب و تلاش کا سب سے آخری مرتبہ وہ ہے جسے صوفیہ کی اصطلاح میں وری الوری کہتے ہیں اور حسن ظن چاہتا ہے کہ غالب کا تصور اس مقام بلند تک پہنچا ہو جہاں طالبان شہود کو عجز ادراک کا ادراک ہوا ہے مگر بہتر ہے کہ اس کا فیصلہ خود ارباب فہم کی رائے پر چھوڑ دیا جائے —

۱ ـ شوق تماشا

دشت و چمن میں طرح طرح کے غنچے کھلتے دیکھکر غالب کو یہ سبق ملا ہے کہ ہر آنکھ، خواہ اس کی صلاحیت کچھ ہی ہو، کھولنے اور دیکھنے کے لئے عطا ہوئی ہے

بخشے ہے جلوۂ گل ذوق تماشا غالب

چشم کو چاہئے ہر رنگ میں وا ہو جانا

پھر، باغبان قدرت نے جو رنگیں بساط دنیا میں بچھائی ہے وہ اس قابل ہے کہ خود مہر و ماہ اس کا تماشا کریں اور گل نرگس دیدۂ بینا بن جائے:—

پھر اس انداز سے بہار آئی — کہ ہوے مہر و ماہ تماشائی

دیکھو اے ساکنان خطۂ خاک — اس کو کہتے ہیں عالم آرائی

کہ زمیں ہوگئی ہے سر تا سر — روکش سطح چرخ مینائی

سبزہ و گل کے دیکھنے کے لئے — چشم نرگس کو دی ہے بینائی

یہ بہار آفرینی اور عالم آرائی جہاں بلبل کے بد نما پر کو لہلہاتا چمن بنا دیتی ہے وہیں شوق دید اور قوت سیر پیدا کر دینا بھی اس کا خاصہ ہے —

فیض سے تیرے ھے اے شمع شبستان بہار
دل پروانہ چراغاں، پر بلبل گلزار

آغوش گل ھے آئینۂ ذرہ ذرہ خاک
عرض بہار، جوھر پرواز ھے مجھے

اور اس ذوق شوق کے طفیل شاعر کو مٹی کا ھر تودہ حسن مجسم اور خاک کا ھر ذرہ نگاہ محبوب کی چمک نظر آتا ھے—

طاوس خاک، حسن نظر باز ھے مجھے
ھر ذرہ چشمک نگۂ ناز ھے مجھے

اپنے شوق کی اتنی ھمہ گیری اور دور رسی پر خود صاحب شوق کو تعجب ھے اور وہ اپنے جذبات کو کسی اور نفس کلی کی کار فرمائی سمجھنے پر مائل ھے—

جام ھر ذرہ ھے سر شار تمنا مجھسے
کس کا دل ھوں کہ دو عالم سے لگایا ھے مجھے

لیکن شوق دید کی خوبی اور صداقت یہ ھے کہ دیکھنے والا غور و تدبر کی صلاحیت پیدا کر کے اس چمن میں آئے جہاں کا ھر پتا صحیفۂ کاینات کا پر معنی ورق ھے—

بے چشم دل نہ کر ھوس سیر لالہ زار
یعنی یہ ھر ورق، ورق انتخاب ھے

اس مضمون کو مرزا نے اور بھی کئی جگھہ بیان کیا ھے کہ اگر انسان غفلت و خود پسندی میں مبتلا نہ رھے تو گھانس کے ھر پتّے میں صنعت ایزدی اور پتھر کے ھر ٹکڑے میں خود صانع کا ظھور جلوہ نما ھے:—

غافل بوھم ناز خود آرا ھے ورنہ یاں
بے شانۂ صبا نہیں طرہ گیاہ کا

اے واے غفلت نگہہ شوق ورنہ یاں
ھر پارہ سنگ، لخت دل کوہ طور تھا

مرزا اس بات سے نا واقف نہیں کہ ارباب شوق کو بعض اوقات اپنے مقصد میں سخت نا کامی ھوئی ھے لیکن وہ اس سے بد دل نہیں ھوتے-اُن کے نزدیک چشم بصیرت کو کُل کا مشاھدہ کرنے کے لئے ایک جزو کا دیکھہ لینا کافی ھے—

کیا فرض ھے کہ سب کو ملے ایک سا جواب
آؤ نہ ھم بھی سیر کریں کوہ طور کی

قطرے میں دجلہ دکھائی نہ دے اور جزو میں کُل
کھیل لڑکوں کا ھوا دیدۂ بینا نہ ھوا

۲۰-عالم تحیر وگم گشتگی

لیکن شوق تماشا جب اس طرح با معنی اور بالمقصد ھو جاے تو پھر سالک کو بہت دن عالم حیرت میں رھنا پڑتا ھے کیونکہ فطرت کے ازلی اور عالمگیر حسن کے رموز سمجھنا کوئی آسان بات نہیں ھے—

ھنوز محرمی حسن کو ترستا ھوں کرے ھے ھر بن مو کام چشم بینا کا

سراغ آوارۂ عرض دو عالم شور محشر ھوں
پر افشاں ھے غبار آنسوے صحراے عدم میرا

یعنی طالب تلاش حقیقت میں بھٹکتے بھٹکتے عدم کے پار پہنچ گیا ھے اور وھاں بھی بصورت غبار ھاتھہ پاؤں مار رھا ھے- یا اُس کی مثال شمع کی سی ھے جو کسی کی جستجو میں ھر طرف رخ کئے کھڑی جل رھی ھے مگر اُسے کہیں نہیں پاتی—

شمع ھوں لیکن بہ پا درَ رفتہ خار جستجو
مدعا گم کردہ ھر سو ھر طرف جلتا ھوں میں

خود حیرت کی مرزا نے لباس جسمانیت میں عجیب و غریب تصویر کھینچی ھے کہ وہ ایک دیوانہ ھے جسے شوق نظارہ نے مقید کر رکھا ھے اور اسی لئے وہ زنجیر جس میں اسے جکڑا ھے چشم تماشائی کے حلقوں سے بنی ھے—

وحشی خو کردۂ نظارہ ھے حیرت جسے حلقۂ زنجیر جز چشم تماشائی نہیں

اس طلسم حیرت میں جہاں حقایق و معارف کی تجلی گردش ساغر کی طرح پیہم و متصل ھے، سالک زندگی کا مقصود ھی حیرانی کو سمجھنے لگتا ھے—

گردش ساغر صد جلوۂ رنگیں تجھسے آئینہ داری یک دیدۂ حیراں مجھسے

یہاں تک کہ تمام کائنات دل مبہوت کی مثل جلوۂ حقیقی کی جستجو میں "آئینۂ حیراں" نظر آنے لگتی ھے-: ع:

از زرہ تابہ مہر دل و دل ھے آئینہ

کس کا سراغ جلوہ ہے حیرت کو اے خدا
آئینہ، فرش ششجہت انتظار ہے

یہ وہ مقام ہے جہاں اہل باطن کے نزدیک اکتساب و کوشش کے پاؤں ٹوٹ جاتے ہیں اور جس سے آگے جانا بجز تائید غیبی اور توفیق الٰہی کے ممکن نہیں۔ یہاں سالک پر ایک قسم کی سراسیمگی اور مایوسی کی کیفیت طاری ہو جاتی ہے —

حیرت حجاب جلوہ و وحشت غبار راہ
پاے نظر بہ دامن صحرا نہ کیجئے

ہستی ہے نہ کچھ عدم ہے غالب آخر تو کیا ہے اے نہیں ہے

یہ اور اسی قبیل کے اشعار جن کی بنا پر بجنوری مرحوم نے غالب کو گروہ مشککین میں شامل کر دیا ہے میری دانست میں اسی عالم حیرت کے واردات ہیں جہاں تمثال تماشا کی فراوانی نے تماشائی کو اس قدر متحیر و مبہوت کر دیا ہے کہ اسے اپنے عجز و شرمندگی کا اظہار کرنے کی بھی قوت باقی نہیں رہی —

تمثال تماشا ہا اقبال تمنا ہا عجز عرق شرم ہے اے آئینہ حیرانی

اور اس عالم سے جب کہ اوپر اُٹھایا جا رہا ہے، اس وقت بھی سالک کی راے تردد و شک سے خالی نہیں ہے —

میں ہوں اور حیرت جاوید، مگر ذوق خیال
بہ فسون نگہ ناز ستاتا ہے مجھے

—:o:—

۳-حاصل بے حاصلی

اس حیرت و پریشانی سے نجات اس وقت ملتی ہے جب یہ ظاہر ہو جا ے کہ دید و تلاش بے سود اور اس کا نتیجہ ہیچ ہے۔لوگ جسے منزل پر پہنچنا سمجھے ہیں اصل میں وہ تھک کر بیٹھ رہنا ہے۔ورنہ منزل مقصود ہی موہوم ہے تو اُس تک کسی کی رسائی کیونکر ہو—

"رسیدن" گُل باغ واماندگی عبث محفل آرا ے رفتار ہیں ہم

ہر قدم دوری منزل ہے نمایاں مجھسے
میری رفتار سے بھاگے ہے بیاباں مجھسے

دوسرے شعر میں اشارہ نکلتا ہے کہ خود وہ منزل مشتبہ ہے جس کی تلاش میں یہ تگ و دو ہو رہی تھی اس لئے اس مقام پر دنیا کی ہر دلکش اور قابل تماشا شے بیکار و بے معنی، بے نظم اور بے تکی نظر آتی ہے۔انسانی ہستی ایک پیچ در پیچ طومار ہے جس کا کوئی مدعا نہیں اور فصل بہار چند عناصر کا مجموعہ ہے جس میں وحشت و پریشانی کے سوا کوئی اتحاد و رابطہ نہیں:—

نہ ہو وحشت کش درس سراب سطر آگاہی
میں گرد راہ ہوں بے مدعا ہے پیچ وخم میرا

ربط یک شیرازۂ وحشت ہیں اجزا ے بہار
سبزہ بیگانہ، صبا آوارہ، گل نا آشنا

خلاصہ یہ کہ ہماری سیروتلاش اور جس شے کی سیروتلاش میں تھے وہ

سب ہیچ اور خواب وخیال ہیں—

تھا خواب میں خیال کو تجھسے معاملہ
جب آنکھ کھل گئی نہ زیاں تھا نہ سود تھا

یہی وہ قیام ہے جہاں پہنچ کر سیر وتماشا جس کا وہ کچھ شوق لےکر چلے تھے، دیوانہ پن معلوم ہونے لگتا ہے اور آنکھ کا کھلنا اور بند ہونا تازیانہ ندامت کا کام دیتا ہے—

زبس کہ مشق تماشا جوں علامت ہے
کشاد وبست مژہ سیلئی ندامت ہے

مرزا صاحب اہل غفلت کے حال پر، جنیں پہلے طعن دیتے تھے اب رشک کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ اُن سے اچھے ہیں جو جو ہوشیار ہوے مگر دنیا کی آگہی سے پریشانی کے سوا کچھ نہ پایا—

رشک ہے آسایش ارباب غفلت پر اسد
پیچ و تاب دل نصیب خاطر آگاہ ہے

اسد، جمیعت دل در کنار بیخودی خوشتر
دوعالم آگہی سامان یک خواب پریشاں ہے!

بے حاصلی کا احساس، یاس و نومیدی کا آغاز ہے - لیکن اس موقع پر شاعر کے دل میں غیریت کا ہیجان پیدا ہوتا ہے کہ کہیں اس مایوسی کو شوق کی کمی، اور اظہار یاس کو اس کی کم ظرفی پر محمول نہ کیا جاے چناچہ جابجا صداقت و افراط شوق کا دعویٰ کرتا ہے اور اپنی قوت ضبط اور عالی

ظرفی کو بار بار جتاتا ہے۔ ان مضامین کو جس جوش کے ساتھ مرزا غالب نے لکھا ہے، اسے یقیناً ہر غالب شناس جانتا ہوگا۔ مختصر طور پر اتنا لکھنا کافی ہے کہ مرزا کا معیار عشق بہت بلند ہے۔ عشاق کی ساری تاریخ میں وہ صرف قیس عامر کو عشق میں کامل اور منتخب سمجھے ہیں ورنہ خضر و موسیٰ علیہاالسلام اور منصور وفرہاد سب کی قابلیت عشق میں انہیں کلام ہے وہ اپنے ظرف کی وسعت اور شوق کی تشنگی کو خلیج ساحل سے تشبیہ دیتے ہیں جس میں بے تکلف سمندر سما جائے —

بقدر ظرف ہے ساقی خمار تشنہ کامی بھی
جو تو دریائے مے ہے تو میں خمیازہ ہوں ساحل کا

انہیں شکایت ہے کہ وہ بجلی جس کی طور کو تاب نہ آئی تھی اُن پر کیوں نہ گری —

گرنی تھی ہم پہ برق تجلی نہ طور پر
دیتے ہیں بادہ ظرف قدح خوار دیکھ کر

لیکن اس عالی ظرفی کے باوجود دل میں شوق کا جو طوفاں برپا ہے وہ ضبط کے پردے میں چھپائے نہیں چھپ سکتا بلکہ جس طرح سمندر کی موجیں ساحل کی گودیوں تک پہنچ کر بے اختیار اُچھل جاتی ہیں اور طوفان کا حال کھل جاتا ہے اسی طرح وہ تلاطم جو سینے کے اندر بپا ہے پھیلتے پھیلتے جسم کی بالائی سطح تک پہنچتا اور "زخم نمایاں" کی صورت میں سامنے آجاتا ہے —

ذوق سرشار سے بے پردہ ہے طوفاں میرا
موج خمیازہ ہے ہر زخم نمایاں میرا

دوسرے، آخر تک ضبط کا قائم رہنا، افراط شوق کے منافی ہے اور وہ گریبان جس کا چاک سلامت رہ گیا، گویا ایک ناشگفتہ پھول ہے جسے

غنچے کی صورت میں مقید و مجبور کر دیا گیا ہو—

چاک گریباں کو ہے ربط تامل ہنوز
غنچے میں دلتنگ ہے حوصلۂ گل ہنوز

غم عشق کی دائمی آتش کو دل جیسی نازک چیز میں چھپانا محال، اور اگر کبھی بتقاضاے بشریت دامن ضبط ہاتھ سے چھوٹ جاے تو یہ خطا قابل معافی ہے—

لپٹنا پرنیاں میں شعلۂ آتش کا آساں ہے
ولے مشکل ہے حکمت دل میں سوز غم چھپانے کی

رونے سے اے ندیم ملامت نہ کر مجھے
آخر کبھی تو عقدۂ دل واکرے کوئی

۴-عالم یاس و ناامیدی

اس عذر معذرت کے بعد کامل یاس کا اظہار شروع ہوتا ہے اور بزم حسن و عشق کی ناپاے داری پر شاعر اس طرح راے زن ہے کہ:-

بزم داغ طرب و باغ کشاد پر رنگ
شمع و گل تا کے و پروانہ و بلبل تا چند

یک نظر بیش نہیں فرصت ہستی غافل
گرمی بزم ہے اک رقص شرر ہونے تک

دنیا کی تمام خوشیاں محض عارضی اور قابل مضحکہ ہیں—

ہے عدم میں غنچہ محو عبرت انجام گل
یک جہان زانو تامل در قفاے خندہ ہے
جاے استہزا ہے عشرت کو شئی ہستی اسد
صبح و شبنم فرصت نشو و نما خندہ ہے

زندگانی نہیں پیش از نفس چند اسد
غفلت آرامی یاراں پہ ہیں خنداں گل و صبح

تنگناے دہر میں خوشدلی کی خفیف سی ہوس فوری خرابی کا سامان ہے۔

برہم ہے بزم غنچہ بہ یک جنبش نشاط
کاشانہ بسکہ تنگ ہے غافل ہوا نہ مانگ

اس مقام پر نفس انسانی کی کمال بے حقیقتی آشکار ہوتی ہے۔ مرزا اپنی ہستی کو صدا سے تشبیہہ دیتے ہیں جو بلند ہوتے ہی فضا میں معدوم ہوجاے۔ پھر یہ صدا بھی گویے کی تان یا رباب کے تار کی آواز نہیں، جس میں فی الجملہ دلکشی پائی جاے بلکہ — فقط ٹوٹنے اور ختم ہونے کی آواز ہے —

نہ گُل نغمہ ہوں نہ پردۂ ساز
میں ہوں اپنی شکست کی آواز

ہستئی مایوس کی مرزا کے تخیل نے جو تصویریں اتاری ہیں، اُن پر سر سری نظر ڈالنے سے بھی آدمی سناٹے میں آجاتا ہے: —

سراپا یک آئینہ دار شکستن
ارادہ ہوں یک عالم افسردگاں کا

همه نا امیدی همه بد گمانی
میں دل هوں فریب وفا خوردگاں کا
بصورت تکلف، بہ معنی تاسف
اسد میں تبسم هوں پژ مردگاں کا

خموشی میں نہاں خوں گشتہ لاکھوں آرزوئیں هیں
چراغ مردہ هوں میں بے زباں گور غریباں کا

آخر غور کرتے شاعر حکماے رواقیہ کے اس نتیجے تک پہنچ جاتا هے کہ هستی کا مقصود هی نیستی هے-یہ کہنا کہ جو چیز وجود میں آی فنا هوگی بیان کی غلطی هے کیوں کہ وجود میں آنا بجاے خود ناقص و نا تمام فعل هے جب کہ اس کا پورا هونا فنا پر موقوف هو-اسی لئے خود زندگی کی سرگرمی دیکھکر مرزا کو یقین هوتا هے کہ یہ فناکی تیاریاں هیں:-

مری تعمیر میں مضمر هے اک صورت خرابی کی
هیولی برق خرمن کا هے خون گرم دهقاں کا

کارگاہ هستی میں لالہ داغ ساماں هے
برق خرمن راحت خون‌گرم دهقاں هے

محیط دهر میں بالیدن، از هستی گزشتن هے
کہ یاں هر اک حباب آسا شکست آمادہ آتا هے

آفرینش کے تمام اجزا زوال پذیر هیں-یہاں تک کہ چشم حقیقت بیں کو سورج کا عظیم کرۂ آتشیں محض ایک ٹمٹاتا دیا نظر آتا هے جو هوا کے جھونکوں

میں بجھنے کے لئے رکھدیا گیا ہو—

ہیں زوال آمادہ اجزا آفرینش کے تمام
مہر گردوں ہے چراغ رہ گزار باد یاں

اسی لئے مرزا صبح کے طلوع کو فقط شام ہونے کے آثار میں شمار کرتے ہیں—

صبح سے معلوم آثار ظہور شام ہے غافلاں! آغاز کار آئینۂ انجام ہے

—:0:—

۵-مقام تسلیم و فنا

طالب حقیقت کے عالم مایوسی سے نکلنے کی عجیب راہ یہ پیدا ہوتی ہے کہ اُن چیزوں کی طرف سے جن کی بے حقیقتی منکشف ہوئی تھی اس کا دل ہی سرد ہو جاتا ہے —

تن به بند ہوس در نہ دادہ رکھتے ہیں
دل زکار جہاں اوفتادہ رکھتے ہیں

اس ”دل افتادگی“ کے طفیل یاس جاوداں کو برداشت کرنے کی مشکل حل ہو جاتی ہے—

به فیض بے دلی نو میدی جاوید آساں ہے
کُشائش کو ہمارا عقدۂ مشکل پسند آیا

اور سالک کو یاس و نا مرادی میں ایسی مستقیم دلجمعی کا لطف آتا ہے جو امید خام کے طوفان میں ممکن نہ تھا کیوں کہ صرف کامل یاس کی حالت میں وہ اپنے آپ کو ساری دنیا سے خوش دل و مطمئن پاتا ہے—

خاک بازئی اُمید کار خانۂ طفلی
یاس کو دو عالم سے لب بخندہ وا پایا

وحشت اگر رسا ہے، بے حاصلی ادا ہے
پیمانۂ ہوا ہے مشت غبار صحرا۔

پس یہاں اگر اسے کوئی خواہش ہوسکتی ہے تو یہ کہ وہ دل ملے جس میں کسی خواہش کا گزر نہ ہو—

گر تجھ کو ہے یقین اجابت دعا نہ مانگ
یعنی بغیر یک دل بے مدعا نہ مانگ

یہ کامل تعطل کا مقام ہے جہاں رفتہ رفتہ امید و نا امیدی کی بحث ختم ہوجاتی ہے اور ہر قسم کی آرزو موجب زحمت و تعب محسوس ہوتی ہے:—

چہ امید و نا امیدی، چہ نگاہ و بے نگاہی
ہمہ عرض نا شکیبی ہمہ ساز جانستانی
اگر آرزو ہے راحت تو عبث بخوں طپیدن
کہ خیال ہو تعب کش بہ ہوائے کامرانی
شر و شور آرزو سے تب و تاب عجز بہتر
نہ کرے اگر ہوس پر غم بے دلی گرانی

بہ پیچ و تاب ہوس سلک عافیت مت توڑ
تجھے کہ عجز سر رشتۂ سلامت ہے

اس حال میں شوق تماشا ایک گناہ معلوم ہوتا ہے اور نہ گریباں آرای کا ذوق باقی رہتا ہے نہ دامن دری کی شکایت:—

تماشاے گلشن، تمناے چیدن
بہار آفرینا! گنہگار ہیں ہم!
نہ ذوق گریباں نہ پرواے داماں
نگہ آشناے گل و خار ہیں ہم

یہاں دل بے مدعا کو غم و عشرت دونوں یکساں مقبول ہیں:—

غم و عشرت قدمبوس دل تسلیم آئیں ہے
دعاے مدعا گم کردگان عشق "آمیں" ہے!

یہ تسلیم اس علم و یقین کی بنا پر ہے کہ وہی مختار حیقیقی جس کے ہاتھہ میں اسباب راحت و کامیابی ہیں، بندہ نامراد کا بھی اصلی مالک و خبر گیراں ہے اور مناسب حال سمجھتا تو اسے کامیابی سے ھمنکار کرنے میں کیا دیر لگتی۔ اس عارفانہ مضمون کو مرزا غالب نے جس بلیغ استعارے میں ادا کردیا وہ شاعری کا اعجاز ہی۔فرماتے ہیں—

اسد سوداے سرسبزی سے ہے تسلیم رنگیں تر
کہ کشت خشک اُس کا ابر بے پروا خرام اُس کا!

پھر یہ کہ جس "ساقی" سے معاملا پڑا ہے اس کی شان اتنی بلند و ارفع ہے کہ جب تک یہ عبد ذلیل بالکیہ اپنے آپ کو اس کے حوالے نہ کردے اس کے ساتھہ کوئی "سودا" ہو نہیں سکتا۔ بہ الفاظ دیگر، کامل تسلیم کے سواے طالب و مطلوب حقیقی عزاسمہ میں اور کوئی سبیل ربط کی ممکن نہیں ہے—

دل و دیں نقد لا ساقی سے گر سودا کیا چاہے
کہ اس بازار میں ساغر، متاع دستگرداں ہے

عالم تسلیم میں عشق مزاجی کا کوئی شائبہ باقی نہیں رہتا لیکن مطلوب سے ملنے کی آرزو شوق فنا پیدا کر دیتی ہے۔ طالب حصول فنا کے لئے بیتاب ہے اور اسے اپنی معراج خیال کرتا ہے—

ڈھونڈے ہے اُس مغنی آتش نفس کو جی
جس کی صدا ہو جلوۂ برق فنا مجھے

ع: عشرت قطرہ ہے دریا میں فنا ہو جانا!

بزرگان صوفیہ نے فنا کو عشق کا ایک مرتبہ شمار کیا ہے اور اس کی جیسی تفصیل وتشریح کی ہے اس کے مقابلے میں مرزا کا بیان ادھورا ہے مگر فنا کی تعریف میں اسے کائنات کے متبائن و منتشر اجزا کا واحد ذریعہ اتحاد قرار دینا، غالباً مرزا کی اپنی تلاش و مضمون آفرینی ہے—

نظر میں ہے ہماری جادۂ راہ فنا غالب
کہ یہ شیرازہ ہے عالم کے اجزائے پریشاں کا!

پھر مرزا کہتے ہیں کہ نقائص طبعی کی پردہ پوشی بغیر فنا کے اور کسی طرح ممکن بھی نہ تھی—

ڈھانپا کفن نے داغ عیوب برہنگی
میں ورنہ ہر لباس میں ننگ وجود تھا

———:O:———

۶- رجوع الی البقا

نہ لای شوخئی اندیشہ تاب رنج نومیدی
کف افسوس ملنا عہد تجدید تمنا ہے!

درجۂ فنا کو جو راہ سلوک میں حاصل ہوتا ہے اگر دوام ہو تو انسان کی زندگی بیکار ومعطل ہو جاے اور ترک دنیا یا رہبانیت اختیار کئے بغیر کوی چارہ نہ رہے حالانکہ اس طرح خود روحانیت کی تکمیل نہیں ہوسکتی کیونکہ زندگی میں روح وجسم کا تعلق خوشبو اور پھول کا سا ہے کہ جب تک قوانین فطرت کے مطابق پھول کو پورا نشوونما اور بالیدگی نہ حاصل ہوگی، اس میں پوری مہک نہ آے گی، اسی لئے آگے چل کر مرزا فنا کو طلب صادق کا وسطی مرحلہ تجویز فرماتے ہیں—

تھی نو آموز فنا ہمت دشوار پسند
سخت مشکل ہے کہ یہ کام بھی آسان نکلا

شعر کے دوسرے مصرعر میں ایک لطیف اشارہ نکلتا ہے کہ "بقا بعد فنا" یا مرتبئہ فنا سے گزرنے کے بعد کی زندگی، عالم فنا سے بھی زیادہ دشوار ہے اور اسی مجبور ومقید زندگی میں، مطلوب اصلی کی دھن میں رہنا عشق، بلکہ ایمان کا کمال ہے جسے لوگ جنون تعبیر کرینگے-شاید اسی حالت کو مرزا ایک عجیب تشبیہ دے کر سمجھاتے ہیں جس سے بہتر خیال میں نہیں آتی—

مثال یہ مری کوشش کی ہے کہ مرغ اسیر
کرے قفس میں فراہم خس آشیاں کے لئے

یہاں یہ حقیقت نہایت صفای سے شاعر کے ذہن نشین ہو جاتی ہے کہ لوگو انسان کی طول طویل کوشش و آرزو کا نتیجہ دنیا میں بہت ہی خفیف و حقیر

میسر آتا ہے یا بالکل نہیں آتا، بایں ہمہ اس کی فطرت صحیح کا مقتضیٰ ہی
یہ ہے کہ تھکے جاے اور کوشش کئے جاے: —

باعث واماندگی ہے عمر فرصت جو مجھے
کر دیا ہے پابہ زنجیر رم آہو مجھے

اسی لئے مرزا تاکید کرتے ہیں کے اگر اصلی حاصل دستیاب نہ ہو تو بھی
مایوس و بے کیف ہو کر انتظار سے ہاتھہ اٹھانا نہ چائیے —

نفس نہ انجمن آرزو سے باہر کھینچ
اگر شراب نہیں انتظار ساغر کھینچ

۷—مقام وری الوری

مرزا غالب وحدت وجود کے قائل ہیں لیکن معلوم ہوتا ہے اسلامی تعلیم
کے اثر سے کبھی کبھی انکا فکر بلند مقام "وری الوری" تک رسا ہو جاتا ہے۔
واضح رہے کہ یہاں بعض بزرگان باخدا کے ان کلمات سکر کا ذکر نہیں ہے جو
کبھی کبھی کمال محویت واستغراق کی حالت میں مجذوبانہ ان کی زبان سے
نکل گئے ہیں اور ان سے اتحاد وعینیت کی بو آتی ہے۔ بلکہ یہاں ہماری مراد
اس نظری فلسفے سے ہے جس کے ماننے والوں میں قدیم ہند ویونان کے حکما،
مصروشام کے مسیحی اور بعد کے مسلمان فلاسفہ، دہری و لاادری، مذہبی اور
ملاحدہ سبھی قسم کے حضرات شامل ہیں اور نئے نئے پیرایوں میں اس مطلب کو
ظاہر کرتے ہیں کہ مخلوقات ذات خالق سبحانہ وتعالےٰ شانہ ہی کی ایک دوسری
صورت یا "شئونات" ہیں۔ یہ سارا فلسفہ عجیب قیاسات و مفروضات نیز
متضاد دلائل پر مبنی ہے جن کی بظاہر نہ کوی معقول توجیہ ہو سکتی ہے نہ
یقینی تصدیق۔ اور اگر طالب علم مصطلحات کے رعب میں نہ آے تو عجیب نہیں

کہ ارباب وحدت وجود کے تصویر خدا اور ہیولیٰ میں کچھ زیادہ فرق نہ رہے۔
نعوذ باللہ من ذالک —

مرزا غالب کے ہاں بھی اس مضمون کے شعر جا بجا آتے ہیں —

ہے مشتمل نمود صور پر وجود بحر
یاں کیا دھرا ہے قطرہ و موج حباب میں

اصل و شہود و شاہد و مشہود ایک ہیں
حیراں ہوں پھر مشاہدہ ہے کس حساب میں

مرزا غالب منصور کے دعوی "اناالحق" کے دل سے قائل ہیں لیکن اس کا اظہار کرنا ان کے نزدیک عالی ظرفی کے خلاف ہے —

قطرہ اپنا بھی حقیقت میں ہے دریا لیکن
ہم کو تقلید تنک ظرفئی منصور نہیں

دل ہر قطرہ ہے ساز اناالبحر
ہم اُس کے ہیں ہمارا پوچھنا کیا؟

اے ندا گوے اناالحق ترا دعوی حق ہے
لیک دستور نہیں قطرے کو دریا کہنا

لیکن جیسا کہ ہم نے لکھا ہے ان کی عقل سلیم بعض اوقات "عجز ادراک" کی انتہائی منزل تک پہنچتی ہے اور وہ مطلوب حقیقی کے ماوراے ادراک ہونے کا صاف صاف اعتراف کرتے ہیں —

ع: ہے پرے سرحد ادراک سے اپنا مسجود

اور جوش میں آکے کہتے ہیں کہ دید کی یہی نارسائی تو تھی جس نے طالب دید کی چشم نظارہ طلب کو جلا دیا —

ناکامئی نگاہ ھے برق نظارہ سوز
تو وہ نہیں کہ تجھکو تماشا کرے کوی!

پس حضرت حق سبحانہ کا جلوہ مطلوب ھے تو اسے ھمیشہ عقل و علم انسانی کے ماوری ڈھونڈنا چاھئے کہ "ھرچہ در دید و دانش مے آید مقید ست و از صرافت اِطلاق متنزل- و مطلوب آنست کہ از جمیع قیود منزہ و مبری باشد- پس ماوراے دید و دانش او را باید جست - ایں معاملہ وراے طور نظر عقل ست چہ عقل ماوراے دید و دانش را جستن محال مے داند راز درون پردہ ز رنداں مست پرس الخ" *—

مرزا نے اس نکتے کو جس شاعرانہ پیراے میں بیان کیا ھے وہ انھی کا حصہ ھے —

خبر، نگہ کو، نگہ، چشم کو عدو جانے
وہ جلوہ کر کہ نہ میں جانوں اور نہ تو جانے!

-:o:-

یہ ایک سرسری تبصرہ تھا مرزا غالب کے فلسفیانہ خیالات کا، جنھیں ھم نے اس عہد کے متصوفانہ عقائد کو مدنظر رکھکر کہ ایک خیالی ترتیب میں مرتب کرنے کی کوشش کی اور کلام کے تقدم و تاخر کا ایک حد تک لحاظ رکھا ھے- مجموعی طور پر دیکھئے تو یہ خیالات قواے عملی کو مضمحل کرنے والے، یاس فزا اور حوصلہ شکن ھیں اور مسلمانوں کے عہدانحطاط کی یاد دلاتے ھیں- اسی بنا پر ھمارے ایک فاضل دوست ایک مرتبہ غالب و حافظ کا محاکمہ کرتے وقت فرماتے ھیں کہ حافظ زندگی کی مصائب و مشکلات کو چٹکیوں میں اُڑاتا ھے مگر غالب ان سے مغلوب ھو گیا ھے! یہ راے غلط نہیں لیکن یاد رکھنا چاھئے کہ غالب

---

* مبدء و معاد- لحضرت مجدد الف ثانی قدس سرہ

کی یہ مغلوبیت کسی نادان وہم پرست یا بزدل پست ہمت کی مغلوبیت نہیں ہے بلکہ ایسے شخص کی جس نے مسائل حیات پر عرصۂ دراز تک غور کیا اور دنیاوی زندگی اور مساعی کو نہایت ناپائدار اور بے حقیقت پایا ہے۔ مزید برآں ماننا پڑے گا کہ شاعر کا طبعی جوش اور زندہ دلی اُس پژمردگی کا، جو اُس کے فلسفیانہ افکار و آرا سے پیدا ہوتی ہے بہت اچھا مصلح ہے۔

اجتماعی یا قومی زندگی کے معاملے میں مرزا غالب کی شاعری صفر ہے انہیں ملک و ملت سے بتقاضاے انسانیت محبت و ہمدردی تھی۔ دلی کی عبرت ناک تاراجی اور نام نہاد بادشاہی کے خاتمے سے بھی یقیناً اُن کو دلی صدمہ ہوا ہوگا لیکن نہ وہ اتنے مذہبی آدمی تھے کہ محض انگریز "کفار" کا استیلا ان کے دل میں جذبۂ جہالت کی گُد گُدی پیدا کرتا۔ نہ ایسے سیاسی مفکر کے اپنے ابناے ملک سے بلند ہو کر کسی قومی اور ملکی حکومت جمہوری کا خواب دیکھتے اور نہ اتنے نادان قدامت پرست کہ اپنے زمانے کی مغلیہ بد نظمی کو انگریزی کمپنی کی باقاعدہ حکومت پر ترجیح دیتے۔ ذاتی طور پر ان کا حال بھی انہی ہندوستانی امرا کا سا تھا جن کی اغراض نے انہیں شروع سے انگریز حکام کے دامن دولت سے وابستہ کر دیا تھا۔ پس جن حضرات نے مرزا کے اشعار میں کسی قومی تعلیم کی جھلک دیکھی یا انہیں کسی وطنی جذبے کی بنا پر اجانب کی حکومت سے برگشتہ و بد دل سمجھا ہے یہ محض ان کا حسن توہم اور بے گناہ مرزا پر اتہام ہے جس کی فی الواقع کوئی بنیاد نہیں فقط

ضمیمہ

جس زمانے میں انجمن ترقی اُردو نے دیوان غالب کا ایک عمدہ نسخہ طبع کرنے کا ارادہ کیا تو راقم الحروف نے مختلف ذرائع سے مرزا غالب کا

غیر مطبوعہ کلام بھی جمع کیا تھا۔اس میں سے بعض اشعار تو بھوپال کے نسخۂ حمیدیہ کے ساتھہ چھپ گئے اور بعض غزلیں اور قطعات بداونی نسخے میں شامل کر لئے گئے ھیں۔لیکن ان کے علاوہ چند قطعے اور غزلیں میرے پاس موجود ھیں جو کسی مطبوعہ دیوان میں ابھی تک مندرج اور شایع نہیں ھوئی ھیں چونکہ اب انجمن کی طرف سے کسی نئے نسخے کے طبع کرنے کی ضرورت نہیں معلوم ھوتی اس لئے میں نے مناسب سمجھا کہ اب اس باقی ساقی کلام کو انجمن کے رسالے میں چھاپ دیا جاے تاکہ آئندہ جو صاحب دیوان طبع کریں وہ اگر چاھیں تو اس کلام کو بھی شامل کر لیں جو غالباً مرزا صاحب کے آخری زمانہ کی یادگار ھے اور اسی لئے ان کے مطبوعہ دیوان میں چھپنے سے رہ گیا—

غزل (۱)

آپ نے "مسّنی الضر" کہا ھے تو سہی
یہ بھی یا حضرت ایوب گلہ ھے تو سہی

رنج طاقت سے سوا ھو تو نہ بیٹھوں کیوں کر
ذھن میں خوبی تسلیم و رضا ھے تو سہی

ھے غنیمت کہ بہ اُمید گذر جاے گی عمر
نہ ملے داد مگر روز جزا ھے تو سہی

دوست ھی کوئی نہیں ھے جو کرے چارہ گری
نہ سہی لیک تمناے دوا ھے تو سہی

غیر سے دیکھئے کیا خوب نباھی اس نے
نہ سہی ھم سے، پر اس بت میں وفا ھے تو سہی

نقل کرتا ھوں اسے نامۂ اعمال میں میں
کچھہ نہ کچھہ روز ازل تم نے لکھا ھے تو سہی

کبھی آجائے گی کیوں کرتے ہو جلدی غالب
شہرۂ تیزیِ شمشیر قضا ہے تو سہی

(اس زمین میں دو غزلہ نسخہ حمیدیہ میں پہلی مرتبہ چھپا ہے لیکن ذیل کی غزل ان دونوں کے علاوہ ہے)

غزل (۲)

ممکن نہیں کہ بھول کے بھی آرمیدہ ہوں
میں دشت غم میں آہوے صیاد دیدہ ہوں

ہوں دردمند، جبر ہو یا اختیار ہو
گہ نالۂ کشیدہ گہ اشک چکیدہ ہوں

جاں لب پہ آئی تو بھی نہ شیریں ہوا دہن
از بس کہ تلخیِ غم ہجراں چشیدہ ہوں

نے سبحہ سے علاقہ نہ ساغر سے واسطہ
میں معرض مثال میں دست بریدہ ہوں

ہوں خاکسار پر نہ کسی سے ہے مجھکو لاگ
نے دانۂ فتادہ ہوں نے دام چیدہ ہوں

جو چاہئے نہیں وہ مری قدر و منزلت
میں یوسف بقیمت اول خریدہ ہوں

ہر گز کسی کے دل میں نہیں ہے مری جگہ
ہوں میں کلام نغز و لئے نا شنیدہ ہوں

اہل ورع کے حلقے میں ہر چند ہوں ذلیل
پر عاصیوں کے زمرے میں میں برگزیدہ ہوں

پانی سے سگ گزیدہ ڈرے جس طرح اسد
ڈرتا ہوں آئینہ سے کہ مردم گزیدہ ہوں*

———:o:———

۳- قصیدہ تہنیت بتقریب سالگرہ مہاراجہ الور

گنتی ہیں سال کے رشتے میں بیس بار گرہ
ابھی حساب میں باقی ہیں سو ہزار گرہ

گرہ کی ہے یہی گنتی کہ تا بروز شمار
ہوا کرے گی ہر اک سال آشکار گرہ

یقین جان برس گانٹھہ کا جو تاگا ہے
یہ کہکشاں ہے کہ ہیں اس میں بے شمار گرہ

گرہ سے اور گرہ کی اُمید کیوں نہ بڑھے
کہ ہر گرہ کی گرہ میں ہیں تین چار گرہ

دکھا کے رشتہ کسی جوتشی سے پوچھا تھا
کہ دیکھہ کتنی اُٹھا لائے گا یہ تار گرہ

کہا کہ چرخ پہ ہم نے گنی ہیں نو گرہیں
جو یاں گنیں گے تو پائیں گے نو ہزار گرہ

خود آسماں ہے مہاراجہ راو پر صدقے
کرے گا سینکڑوں اس تار پر نثار گرہ

وہ راجہ راو بہادر کہ حکم سے جن کے
رواں ہو تار پہ فی‌الفور دانہ وار گرہ

---

* یہ صائب کے مشہور شعر کا گویا اُردو ترجمہ ہے—
چوں سگ گزیدۂ کہ نخواہد کہ آب دید
آئینہ می گزد من مردم گزیدہ را

انھی کی سالگرہ کے لئے ہے سال بہ سال
کہ لاے غیب سے غنچوں کی نو بہار گرہ

انھی کی سالگرہ کے لئے بناتا ہے
ہوا میں بوند کو ابرتگرگ بار گرہ

انھی کی سالگرہ کی یہ شادمانی ہے
کہ ہو گئے ہیں گہر ہاے شاہوار گرہ

انھی کی سالگرہ کے لئے ہے یہ توقیر
کہ بن گئے ہیں ثمر ہاے شاخسار، گرہ

سن اے ندیم برس گانٹھہ کے یہ تاگے نے
تجھے بتاؤں کہ کیوں کی ہے اختیار گرہ

پئے دعاے بقاے جناب فیض مآب
لگیگی اس میں ثوابت کی استوار گرہ

ہزار دانہ کی تسبیح چاہتا ہے بنے
بلا مبالغـــہ درکار ہے ہزار گرہ

عطا کیا ہے خـدا نے وہ جاذبـــہ اس کو
کہ چھوڑتا ہی نہیں رشتہ زینہار گرہ

کشادہ رخ نہ پھرے کیوں جب اس زمانے میں
بچے نہ از پئے بند نقاب یار گرہ ۔

متاع عیش کا ہے قافلـــہ چـــلا آتا
کہ جادہ رشتہ ہے اور ہے شتر قطار گرہ

خدا نے دی ہے وہ غالب کو دستگاہ سخن
کروروں ڈھونڈ کے لا تا یہ خاکسار گرہ

کہاں مجال سخن سانس لے نہیں سکتا
پڑی ہے غم کی مرے دل میں پیچدار گرہ

گرہ کا نام لیا پر نہ کر سکا کچھہ بات
زباں تک آکے ہوی اور استوار گرہ

کھلے یہ گانٹھہ تو البتہ دم نکل جاے
بری طرح سے ہوی ہے گلے کا ہار گرہ

ادھر نہ ہوگی توجہ حضور کی جب تک
کبھی کسی سے کھلیگی نہ زینہار گرہ

دعا یہ ہے کہ مخالف کے دل میں از رہ بغض
پڑی ہے یہ جو بہت سخت نا بکار گرہ

دل اس کا پھوڑ کے نکلے بشکل پھوڑے کے
خدا کرے کہ کرے اس طرح ابھار گرہ

-:o:-

۴- نامہ منظوم- بخدمت لفٹنٹ گورنر پنجاب

کرتا ہے چرخ روز بصد گونہ احترام
فرماں رواے کشور پنجاب کو سلام

حق گو و حق پرست و حق اندیش حق شناس
نواب مستطاب امیر شہ احتشام

جم رتبہ میکلوڈ بہادر کہ وقت رزم
ترک فلک کے ہاتھہ سے وہ چھین لیں حسام

جس بزم میں کہ ہو انہیں آہنگ میکشی
واں آسمان شیشہ بنے، آفتاب، جام

چاھا تھا میں نے تم کو سہ چاردہ لکھوں
دل نے کہا کہ یہ بھی ہے تیرا خیال خام

دو رات میں تمام ہے ھنگامہ ماہ کا
حضرت کا عزو جاہ رہے گا علی الدوام

سچ ہے تم آفتاب ھو جس کے فروغ سے
دریاے نور ہے فلک آبگینہ فام

میری سنو کہ آج تم اس سر زمین پر
حق کے تفضلات سے ھو مرجع انام

اخبار لودھیانہ میں میری نظر پڑی
تحریر ایک جس سے ھوا بندہ تلخ کام

ٹکڑے ھوا ہے دیکھہ کے تحریر کو جگر
کاتب کی آستیں ہے مگر تیغ بے نیام

وہ فرد جس میں نام ہے میرا غلط لکھا
جب یاد آگئی ہے لیا ہے کلیجہ تھام

سب صورتیں بدل گئیں ناگاہ یک قلم
نمبر رھا نہ نذر نہ خلعت کا انتظام

ستر برس کی عمر میں یہ داغ جاں گداز
جس نے جلا کے راکھہ مجھے کر دیا تمام

تھی جنوری مہینے کی تاریخ تیرھویں
استادہ ھوگئے لب دریا پہ جو خیام

اس بزم پر فروغ میں اس تیرہ بخت کو
نمبر ملا نشست میں از روے اھتمام

سمجھا اسے گراب ہوا پاش پاش دل
دربار میں جو مجھپہ چلی چشمک عوام

عزت پہ اہل نام کی ہستی کی ہے بنا
عزت جہاں گئی تو نہ ہستی رہی نہ نام

تھا ایک گونہ ناز جو اپنے کمال پر
اس ناز کا فلک نے لیا مجھسے انتقام

آیا تھا وقت ریل کے کھلنے کا بھی قریب
تھا بارگاہ خاص میں خلقت کا اژدہام

اس کشمکش میں آپ کا مداح نامور
آقاے نامور سے نہ کچھہ کر سکا کلام

جوواں نہ کہہ سکا وہ لکھا ہے حضور کو
دیں آپ میری داد کہ ہوں فایزالمرام

ملک وسپہ نہ ہو تو نہو کچھہ ضرر نہیں
سلطان بروبحر کے در کا ہوں میں غلام

وکٹوریہ کا دہر میں جو مدح خوان ہو
شاہان عصر چاہئیے عزت لیں اس سے وام

خود ہے تدارک اس کا گورنمنت کو ضرور
بیوجہ کیوں ذلیل ہو غالب ہے جس کا نام

امر جدید کا تو نہیں ہے مجھے سوال
بارے قدیم قاعدے کا چاہئیے قیام

ہے بندے کو اعادۂ عزت کی آرزو
چاہیں اگر حضور تو مشکل نہیں یہ کام

دستور فن شعر یہی ہے قدیم سے
یعنی دعا پہ مدح کا کرتے ہیں اختتام

ہے یہ دعا کہ زیرنگیں آپ کے رہے
اقلیم ہند و سندھ سے تا ملک روم و شام

---o:---

۵-رقعہ منظور بنام علائی (رئیس لوہارو) *

خوشی ہے یہ آنے کی برسات کی
پئیں بادۂ ناب اور آم کھائیں

سر آغاز موسم میں اندھے ہیں ہم
کہ دلی کو چھوڑیں لوہارو کو جائیں

سوا "ناج" کے جو ہے مقلوب جاں
نہ واں آم پائیں نہ انگور پائیں

ہوا حکم باورچیوں کو کہ ہاں
ابھی جا کے پوچھو کہ کل کیا پکائیں

وہ کہتے کہاں پائیں املی کے پھول
وہ کڑوے کریلے کہاں سے منگائیں؟

فقط گوشت، سو بھیڑ کا ریشہ دار
کہو اس کو کیا کھا کے ہم حظ اٹھائیں

---

* پہلی دو غزلیں اور دو قطعے نواب احمد سعید خاں صاحب طالب مرحوم کے قلمی کلیات غالب (اردو) سے مجھے ملے اور یہ منظوم رقعہ جو نواب علاالدین احمد خاں مرحوم کو لوہارو بلانے کے جواب میں بھیجا گیا تھا، نواب صاحب موصوف کے بیاض سے دستیاب ہوا ہے:—(ہاشمی)

قطعه

خوانی بسوے خویش وندانی که مردہ ام
دانی که مردہ رہ را ورسم خرام نیست
نے شیخ سدو ام نه اله بخش مرگ من
از عالم جنابت ومرگ حرام نیست

آئندہ کا خواب

از
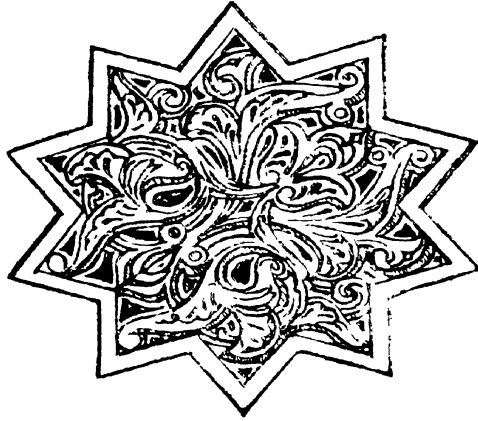
(جناب مولانا وحید الدین صاحب سلیم)

یورپ کے بعض مدبرین کا خیال ہے کہ ایک اور عظیم الشان جنگ ظہور میں آئے گی اور حب وطن اور حب قوم نے جو ہنگامے برپا کر رکھے ہیں، وہ اس جنگ کے بعد فرو ہو جائیں گے اور دنیا حب انسان کا سبق سیکھے گی۔ آیندہ مختلف قوموں، ملکوں اور مذہبوں کے انسان روا داری، انصاف اور مساوات کا برتاؤ باہم کریں گے۔ آئندہ کے متعلق یہ دلکش خواب ذیل کی نظم میں بیان کیا گیا ہے —

روز آئندہ کے عریاں نظر آتے ہیں مجھے
پھر نئی جنگ کے ساماں نظر آتے ہیں مجھے

کئی قوموں کا چھلکنے کو ہے پیمانۂ عمر
ٹوٹتے شاہوں کے پیماں نظر آتے ہیں مجھے

آنے والے ہیں جو ہنگامے قیامت انگیز
پردۂ غیب میں پنہاں نظر آتے ہیں مجھے

پھر اُفق پر نظر آتی ہے کدورت کی گھٹا
اُٹھتے پھر غیظ کے طوفاں نظر آتے ہیں مجھے

اُٹھ گئے مہر کے جذبات دلوں سے اک بار
نازل اب قہر کے فرماں نظر آتے ہیں مجھے
نظر آتے نہیں ارام و سکوں کے آثار
لرزہ میں دھر کے ارکاں نظر آتے ہیں مجھے
سر کشی دیکھہ کے افراد بشر کی پیہم
ملک انگشت بدنداں نظر آتے ہیں مجھے
عقلیں اب امن کی تدبیر سے عاجز ہیں تمام
فلسفے سر بگریباں نظر آتے ہیں مجھے

ھے یہ اُس جنگ کا آغاز جسے دیکھہ کے اب
دیوتا جنگ کے حیراں نظر آتے ہیں مجھے
کرتے ایجاد ھیں اس کے لئے سامان نئے
اپنی عقلوں پہ جو نازاں نظر آتے ہیں مجھے
آگ اُگلنے کو تفنگوں نے دھن کھول دیے
خوں فشاں خنجر براں نظر آتے ہیں مجھے
قتل انساں کے لئے دوڑتی ھے برق کی رو
گیس کے بقے پریشاں نظر آتے ہیں مجھے
منہ ھیں توپوں کے کھلے چرخ بریں کی جانب
صاعقے ابر میں رقصاں نظر آتے ہیں مجھے
غول طیاروں کے افلاک کی جانب ھیں رواں
گرتے اب قلعہ و ایواں نظر آتے ہیں مجھے
بم پہ بم گرتے ھیں ھیبت ھے جہاں پر طاری
درو دیوار بھی لرزاں نظر آتے ہیں مجھے

بال و پر طایروں کے اوج ہوا پر ہیں کباب
لوٹتے خاک پہ انساں نظر آتے ہیں مجھے

آگ ہی آگ ہے پھیلی - جدھر اُٹھتی ہے نظر
شعلہ زن شہر و بیاباں نظر آتے ہیں مجھے

لہلہاتے ہوے جو کھیت تھے جنگل میں کھڑے
آتش جنگ میں سوزاں نظر آتے ہیں مجھے

محفلیں عیش و طرب کی ہوئیں برہم ساری
خاک کے ڈھیر شبستاں نظر آتے ہیں مجھے

باغ جنت نظر آتے تھے مسافر کو جہاں
اب وہ سب مرحلے ویراں نظر آتے ہیں مجھے

جن مکانوں میں بھرے عیش کے ساماں تھے تمام
اب وہ سب بے سرو ساماں نظر آتے ہیں مجھے

زیب تن جو کبھی کرتے تھے سنہری پوشاک
بچے ان شاہوں کے عریاں نظر آتے ہیں مجھے

سرخ چہرے کبھی تھے غیظ و غضب میں جن کے
اب وہی خون میں غلطاں نظر آتے ہیں مجھے

جن مقامات میں جمگھٹ تھے امیروں کے کبھی
اب وہ سب گور غریباں نظر آتے ہیں مجھے

جن کو ارباب حشم نے کبھی ٹھکرایا تھا
محتشم اب وہی دہقاں نظر آتے ہیں مجھے

خال خال اب کہیں باقی ہیں ستمگار اگر
ظلم سے اپنے پشیماں نظر آتے ہیں مجھے

فتنہ پروازیاں تھیں جن کی جبلت میں بھری
اب وهی امن کے خواهاں نظر آتے هیں

جس مساوات کی کرتے تھے تمنا اسلاف
اُس کے آثار نمایاں نظر آتے هیں مجھے

خود پرستی کے جہاں دوڑتے رهتے تھے سمند
حریت کے وهی میداں نظر آتے هیں مجھے

اپنی قوت پہ جو مغرور تھے بیداد سے خوش
اب وهی حق کے نگہباں نظرآتے هیں مجھے

حب اِنساں کی ضیا جن کے دلوں میں هے بھری
چہرے اُس قوم کے تاباں نظر آتے هیں مجھے

مہر والفت کا جو هے نور جہاں میں پھیلا
اُس سے آفاق درخشاں نظرآتے هیں مجھے

عدل و انصاف کی دنیامیں پھرآتی هے بہار
جس سے معمورے گلستاں نظر آتے هیں مجھے

حال پر جن کے بہاتی رهی شبنم آنسو
اب شگوفے وهی خنداں نظرآتے هیں مجھے

وہ چمن جن پہ خزاں پھیر چکی تھی پانی
اب سراپا گل و ریحاں نظر آتے هیں مجھے

بیٹھتے تھے کبھی کوے بھی نہ جن شاخوں پر
اُن پر مرغان خوش الحاں نظر آتے هیں مجھے

جو مقامات کہ اس جنگ میں دوزخ تھے بنے
اب وهی گلشن اخواں نظر آتے هیں مجھے

دوڑتی ضو ہے محبت کی جو بجلی کی طرح
سینے اِس ضو سے فروزاں نظر آتے ہیں مجھے

مختلف مذہب و ملت کے جوانان حسین
سبزہ زاروں میں خراماں نظر آتے ہیں مجھے

یہ سماں نور کا آیا جو تصور میں نظر
دیدہ و دل بھی چراغاں نظر آتے ہیں مجھے

متروکات

از

(جناب پنڈت برجموھن دتا تریہ صاحب کیفی دھلوی اسسٹنٹ

فارن سکریٹری کشمیر (جموں)

طب کی کتابوں میں لکھا ھے کہ چند برسوں کے بعد انسان کا گوشت اور پوست بالکل نیا بن جاتا ھے۔زیادہ تر اس وجہ سے کہ وہ اپنی غذا کے لئے بے شمار بیرونی اشیاء کا محتاج ھے اس پر بھی جراح نے جو کبھی کسی انسان کے جسم پر نشتر چلایا تھا اس کا نشان مرتے دم تک باقی رھتا ھے۔یہی حال دنیا کی نئی اور غیر صرفی زبانوں کا ھے یعنی اخذ اور ترک اُن میں برابر جاری رھتا ھے۔لیکن ان کے جگری نشان اور جوھر جوں کے توں رھتے ھیں—

حضرت ولی کو اُردو کا پہلا صاحب دیوان شاعر مان کر اُردو کی عمر دو سو برس سے کچھہ اوپر ٹھہرتی ھے۔ولی مرحوم محمد شاہ گورکانی کے عہد میں دکن سے دھلی آے۔اس بادشاہ کی حکومت کا زمانہ سنہ ۱۷۱۹ ع سے سنہ ۱۷۴۹ ع تک شمار کیا جاتا ھے۔زبان کے باب میں یہ تھوڑی سی مدت بھی کچھہ حقیقت رکھتی ھے؟ بلا مبالغہ کہنا پڑتا ھے کہ اُردو والوں کا اخذ اور ترک ان دو صدیوں کی قلیل مدت میں تعجب خیز اور تحسین انگیز ھے۔ میرا روے سخن متروکات سے ھے۔اس لئے ماخوذات سے سروکار نہیں رکھا جاے گا—

شروع شروع میں جو لفظ یا ترکیبیں متروک قرار دی گئیں اُن کی بنیاد اس اُصول پر ہو گی کہ ریختہ یا اُردو زبان کا ذاتی تشخص اور اپنی جگہ اس کی ایک مستقل ہستی قائم کی جاے۔پھر لطافت اور نغزیت، ترنم اور سلاست کا نظریہ ترک کا معیار ٹھیرا ہو گا۔متقدمین اور متوسطین غالباً اسی اُصول پر کاربند رہے ہوں گے۔ہاں کہیں یہ بھی ہوا کہ اُردو کی دنیا میں اپنی ایک خود مختار حیثیت تسلیم کرانے کی غرض سے زبان کی گردن پر ترک کی کُند چھری ریت کر ایک امر مابہ‌الامتیاز قائم کیا گیا۔یہاں سے اُردو میں بدعت کی بنیاد پڑی —

زبان مانجھنے اور معقولیت کی بنا پر اخذ اور ترک کا سہرا شاہ حاتم کے سر ہے۔شاہ صاحب محمد شاہی عہد کے شاعر اور ولی کے ہم عصر تھے۔یہ تحقیق کرنا مشکل ہے کہ اُن کا زمانہ کتنی دور تک اِن کے زمانہ کا ہم ردیف ہے۔شاہ حاتم نے بہت سے ہندی اور دکنی الفاظ جو ولی کے کلام کی زینت تھے ترک کر کے اُن کی جگہ فارسی کے ایسے الفاظ زبان میں داخل کئے جو غیر مانوس نہ تھے۔بلکہ اُنھوں نے زبان کی اصلاح میں یہاں تک کیا کہ اپنے ابتدائی کلام میں جہاں رکیک لفظ نظر آے اس حصہ کو ہی اپنے کلیات سے خارج کر کے اپنے کئی دیوانوں سے غزلوں اور غزلوں سے شعروں کا انتخاب کر کے ایک منتخب دیوان ترتیب دیا جس کا نام دیوان زادہ رکھا۔اس کے شروع میں ایک دیباچہ لکھا اور اس میں اپنے تمام متروکات کی فہرست دے دی۔غرض کہ شاہ حاتم دہلوی کی ذات سے زبان کی خراش تراش اور اس میں کاٹ چھانٹ کی بنیاد پڑی۔زبان کی اس خدمت کے اعتبار سے آزاد مرحوم نے شاہ صاحب کو پہلے دور سے نکال کر جہاں ان کی جگہ تھی دوسرے دور کے شعرا میں رکھ دیا ہے —

میں یہاں متروکات کی تاریخ نہیں لکھ رہا ہوں ورنہ میر تقی۔مرزا

رفیع السودا، مظہر، درد، جرات، سوز، مصحفی، انشا، نصیر اور اساتذہ ثلاثہ یعنی مومن، ذوق اور غالب اور ناسخ اور آتش کے متروکات کی عہد بہ عہد کی تفصیل وار تاریخ پیش کرتا۔مرزا غالب کا اُردو دیوان تیسری بار سنہ ۱۲۷۸ ہجری میں چھپا۔اس کے خاتمہ کی عبارت میں مرزا صاحب لکھتے ہیں:—

"ایک لفظ سو بار چھاپا گیا ہے کہاں تک بدلتا۔ناچار جا بجا یوں ہی چھوڑ دیا۔یعنی کسو۔میں یہ نہیں کہتا کہ یہ لفظ صحیح نہیں۔البتہ فصیح نہیں۔قافیہ کی رعایت سے اگر لکھا جائے تو عیب نہیں ورنہ فصیح بلکہ افصح کسی ہے"—

اسی طرح ذوق کے ہاں کبھو قافیہ کی رعایت سے ایک دو جگہ ہی آیا ہے۔ مومن خاں نے بھی بہت سے الفاظ ترک کئے لیکن چونکہ ذاتی تشخص قایم کرنے کی ضرورت نہ تھی میر علی اوسط رشک کی طرح ان کی ایک فہرست مرتب کرکے تالے کنجی میں نہیں رکھی۔جناب شوق لکھتے ہیں:۔

"اس لفظ سے اس امر کا اظہار مقصود ہے کہ ناسخ کے ساتھہ اور شعرا بھی زبان کی اصلاح میں شریک ہیں۔ جب مومن و آتش وغیرہ کا کلام بہت سے رکیک مستعملات سے پاک ہے تو میں ان لوگوں کے مصلح زبان ہونے سے کیونکر انکار کرسکتا ہوں*"—

کہا جاتا ہے کہ حضرت ناسخ کے شاگرد میر علی اوسط رشک نے چالیس پینتالیس کے قریب الفاظ متروک قرار دئیے تھے جن سے ان کا تیسرا دیوان پاک

---

* اصلاح مع ایضاح — مصنفہ مولانا ظہیر احسن شوق نیموی صفحہ ۱۰

تھا-لیکن وہ دیوان افسوس ہے کہ چھپا ھی نہیں-رشک مرحوم ان متروکات کے دفتر کو ہمیشہ مقفل رکھتے تھے اور اپنے خاص شاگردوں کے سوا کسی کو اس سے مستفیض نہ ہونے دیتے تھے-ان صورتوں میں وثوق سے نہیں کہا جا سکتا کہ متروکات کی اس فہرست میں کون کون سے لفظ داخل تھے-وہ متروکات کس اصول پر مبنی تھے اس کا اندازہ ان کے کلام سے کیا جاے تو ان کے اجتہاد کے خلاف شبہات کی بڑی گنجایش ہے نمونہ ملاحظہ ہو —

چاول الماس گوشت لخت جگر فرقت یار میں پلاؤ نہیں
میرے کھانے سے کیوں فلک ہے کباب پاؤ روٹی ہے نان پاؤ نہیں

دیکھو نزاکت آپ کی دھرواکے آئینہ لگواتے ہیں ضماد مہاسے کے عکس پر

رشک مرحوم کے سینہ بسینہ متروکات سے قطع نظر کرکے اس بحث میں یہ کتابیں اور رسالے ذکر کے قابل ہیں :-

۱- آب حیات-مصنفہ آزاد مرحوم

۲-اصلاح معہ ایضاح شرح اصلاح-مصنفہ جناب مولانا محمد ظہیر احسن صاحب شوق نیموی-مطبوعہ قومی پریس لکھنؤ سنہ ۱۸۸۷ ع—

۳-تسہیل البلاغت-مصنفہ جناب محمد سجاد مرزا بیگ صاحب دہلوی سنہ ۱۳۳۹ ہجری—

۴-قرارالمحاورات و قرارالمتروکات-مولفہ جناب سید تصدق حسین صاحب قرار شاہجہان پوری-مقیم لکھنؤ—

۵-اصلاح زبان اردو-مصنفہ جناب خواجہ عبدالرؤف صاحب عشرت لکھنوی سنہ ۱۹۱۹ ع—

۶-نوراللغات (دیباچہ) مولفہ جناب مولوی نورالحسن صاجب نیر کاکوروی سنہ ۱۹۲۴ ع—

۱- آب حیات میں خاص خاص شعرا کے حال میں' کبھی ایک دور کے شروع یا آخر میں اس کے متروکات کا ذکر آیا ھے' مگر وضاحت اور ترک کی وجہ مفقود ھے —

۲- حضرت شوق نے پہلے پہل اپنی کتاب سنه ۱۸۸۷ ع میں لکھنؤ سے شایع کی اس کا پچھلا اڈیشن کئی برس بعد جناب حسرت موھانی نے معدا زا حتہ الاغلاط اپنے اردو پریس علی گڈہ سے شایع کیا - حضرت شوق لکھتے ھیں :-

"جس طرح مہر و مرزا نے ولی و حاتم کے اکثر مستعملہ الفاظ ترک کردیے تھے اسی طرح مومن و غالب و ناسخ و آتش وغیرہ نے میر و مرزا کے بہت سے لفظ متروک کر دئے - جیسے اودھر - ایدھر - بگانہ بجائے بیگانہ - دوانہ بجاے دیوانہ - پیار - و پیاس با شباع یاء - تئیں کو کے معنی میں - تلک - تک - ذرا کے معنی میں - سکی - سوں - سجن - کنے - کسو - لوھو - مکھہ - نت - نوں - منجھہ پاس - کرے ھے - آئیاں - جائیاں - ان میں سے اکثر الفاظ تو وجوباً ترک کر دئے اور بعض الفاظ ایسے ھیں کہ کسی نے کہیں کہیں استعمال بھی کئے ھوں - اس کے بعد ان کے تلامذہ کا دورہ ھوا - انھوں نے بھی کچھہ لفظ ترک کئے" —

۳- جناب سجاد مرزا صاحب کی تسہیل البلاغت کے صفحہ ۴۹ سے متروک الفاظ کا ذکر شروع ھوتا ھے - اس میں واچھڑے - بہتایت - سرس (زیادہ بہتر) نپٹ وغیرہ الفاظ بھی موجود ھیں - ان میں سے کئی الفاظ شاہ حاتم متروک ٹھرا چکے تھے - یہی حال زور - بل بے - خوباں اور عزیزاں کا ھے - ایسی فہرستوں سے کچھہ فائدہ مترتب نہیں ھوتا - پڑھنے والا سوچتا ھے کہ جب امیر اور داغ جن کو ھم نے کل دیکھا اور سنا تھا تلک اور بل بے لکھہ گئے تو ضرورت کے وقت ھم بھی

کیوں نہ وہ لفظ استعمال کریں —

۴ - جناب قرار کی کتاب کے خاتمہ پر چودہ صفحہ متروکات کے موضوع دئے گئے ہیں-شروع میں جو لکھا ہے اس میں بہت کچھہ عیوب ترکیب وغیرہ کی ذیل میں آتا ہے جس کا تعلق ٹھیٹھہ متروکات سے ھرگز نہیں- مثلاً (صفحہ ۴۲) ایک جنس کے دو حروفوں کا قریب قریب آنا-کلام کا یہ نقص عام معانی میں تنافر حروف کی ذیل میں آتا ہے-اگر متروکات کی فہرست کو اس طرح طوالت دی جاے تو کلام کے تمام نقایص جس کا ذکر علم معانی اور علم بیان وغیرہ میں آیا ہے اس میں داخل ھو جائیں گے-اخیر میں ایک فہرست بھی دی گئی ہے-اس میں وہ الفاظ مثالوں کے ساتھہ لکھے ہیں جو میر، سودا اور مصحفی وغیرہ متقدمین نے استعمال کئے، مگر اب متروک ہیں-امیر-داغ اور جلال بھی اس فہرست میں آجاتے ہیں-یعنی بقول مولف ان کے بھی بعض مستعملہ الفاظ اب متروک ہیں-اس اقتباس میں زمانہ وغیرہ کسی ترتیب کا لحاظ نہیں رکھا گیا-چنانچہ اخیری متروک لفظ " ہے گی " ہے اور اس کے لئے سودا کا شعر نقل کیا ہے-اس فہرست کے تین خانے ہیں، اول خانہ میں جائز الفاظ ردیف وار درج نہیں دوسرے میں متروک تیسرے میں مثال کے شعر-چاہئے یہ تھا کہ اول خانہ میں متروک الفاظ کو لاتے —

۵ - اصلاح زبان اردو-کہتے ہیں لکھنؤ میں ایک انجمن اصلاح سخن تھی وہ ایک رسالہ گلچیں نکالا کرتی تھی-اس کے ممبروں نے زبان کے کچھہ قواعد مرتب کئے-غالباً انہیں قواعد کی بنا پر یہ رسالہ ترتیب دیا گیا-راقم اس انجمن-اس کے ممبروں اور رسالہ سے قطعاً نا واقف ہے-اگر یہ انجمن ایک دوسری جماعت، انجمن دایرہ کی . ذوعیت رکھتی تھی حس کا ذکر نومبر سنہ ۱۹۰۸ ع کے معیار میں آیا ہے تو اُس کے معتبر ھونے میں شبہ کی بہت گنجایش ہے-یہ چھوٹی تقطیع کا رسالہ ۴۸ صفحوں میں اردو کی اصلاح اور متروکات کو

نبٹنا دیتا ھے—

۶ - نوراللغات کے دیباچہ پر نومبر سنہ ۱۹۲۴ ع درج ھے اس لئے اس بحث سے متعلق یہ تازہ ترین کتاب ھے-فاضل مولف نے دیباچہ میں ۲۹۷ متروکات کی فہرست دی ھے-یہ فہرست مولف کے خیال میں ساری فہرستوں سے بڑی ھے اس میں ایسے تمام لفظ آجاتے ھیں جنھیں اردو شعرا نے اول سے آج تک مولف کے قول کے مطابق متروک قرار دیا ھے-میں محض اسے فضول طوالت اور تحصیل حاصل کہوں گا-گھر جانا'گھر ویران ھونا کی جگھہ-گھنا'پکڑنا کے بدلے سوں' سیتی' سیں' سے کی جگھہ اب کون لکھتا ھے یا اب سے پچاس برس پہلے کون نظم میں لاتا تھا جو یہ بھی اس فہرست میں داخل کردے گئے ھیں-متعلم کو اس فہرست سے کچھہ فایدہ نہیں ھوسکتا-چاھئے یہ تھا کہ داغ اور امیر کے متروک الفاظ اور ان کی وفات سے آج تک جو الفاظ ترک کئے گئے ان کی فہرست دے دیتے-یا زمانہ اور دور کا تعین کرکے ایک مسلسل مکمل فہرست پیش کرتے-مولف نے اس طویل فہرست کے بعد چند اصول بھی متروکات کی بحث میں قلم بند کئے ھیں جن کی تعداد ۴۹ تک پہنچتی ھے-ان میں صرف ھدایتیں ھیں-وجہ اور علت کا ذکر کہیں نہیں آیا کہ کیوں فلاں لفظ متروک سمجھا جاے؟ کیوں ایسا ایسا کرنا معیوب ھے؟

ان چھئوں مطبوعات میں سے کئی ایسے ھیں کہ محض تجارتی مفاد پر نظر رکھکر شائع کئے گئے ھیں-کئی ایسے بھی ھیں جنھیں سندی حیثیت دینا انصاف کے قریں نہ ھوگا کیوں کہ ان کی مندرجات مقامی پاس داری سے مبرا نہیں-اس کی تفصیل یہ ھے-لکھنؤ والے نے جو کچھہ لکھا اس میں اس نے وہ الفاظ متروکات کی ذیل میں درج کر دئے جن کو لکھنؤ والوں نے استعمال ھی نہیں کیا اور ان میں اکثر ھندی کے مانوس الاستعمال الفاظ ھیں-جاننا چاھئے کہ ترک'اخذ یا استعمال کے وجود کو ممکن ھی نہیں لازم ٹھراتا ھے-جب ایک لفظ

کبھی آپ کے استعمال آیا ھی نہیں تو آپ کا اس کو ترک کرنا کیا معنی رکھتا ھے؟ اس قبیل سے ایک لفظ سندیسا ھے * یہ لفظ لکھنؤ کے مشاھیر شعرا نے استعمال نہیں کیا۔ مگر دھلی میں استعمال ھوتا رھا ھے۔ یہاں تک کہ مہتاب داغ میں آیا ھے پھر اسے متروکات کی فہرست میں شامل کرکے داغ کا شعر لکھ دینا معقولیت سے خارج ھے۔ اگر یہ فرض بھی کرلیں کہ یہ لفظ کسی شاعر نے سوائے داغ کے استعمال کیا ھی نہیں، تو اس کے خلاف یہ کہا جا سکتا ھے کہ ناسخ وغیرہ نے ایسے بہت سے الفاظ استعمال کئے ھیں جو ان کے سوا اور کسی شاعر نے استعمال کئے ھی نہیں، خواہ وہ کہیں کا رھنے والا اور زبان کے کسی مرکز کا متبع تھا۔ مثلاً سپرغم، جریدتین، خالق الاصباح، سباح وغیرہ۔ تو کیوں نہ انہیں بھی متروکات کی فہرست میں درج کیا جاے۔ ان اصحاب نے یہ بھی کیا ھے کہ عام متروکات کی تمثیل میں چن چن کر دلی والوں کے اشعار اقتباس کئے ھین اور لکھنؤ والوں کے کلام سے مجبوری کی حالت میں استفادہ کیا ھے۔ غالباً وہ روش اسی وتیرہ کا جواب ھوگی جو جناب سجاد مرزا بیگ صاحب نے اپنی تسہیل البلاغت میں اختیار کی۔ راقم کے اعتقاد میں ادیب اور نقاد کا مسلک ان دونوں رستوں سے پرے پرے ھونا چاھئے۔ جناب شوق کے ھاں یہ افراط تفریط نام کو نہیں —

تاریخی کوایف کہئے یا مبادیات ان کے بعد چند امور ناظرین کی خدمت میں پیش کئے جاتے ھیں۔ پھر بعض الفاظ کے متروک قرار دینے کے متعلق بحث کی جاے گی۔ سب سے اول جو سوال ذھن میں اٹھتے ھیں یہ ھیں کہ

(۱) ایک لفظ مدت سے اردو میں مستعمل ھے اب جو اُسے ترک کیا جاتا ھے تو کس بنا پر؟ اس کے خلاف کونسی نئی باتیں پیدا ھوگئیں اور اسی معنی اور

---

* اس کا مفصل ذکر آگے آیگا

موقعہ کا کونسا نیا اور بہتر لغت مل گیا ہے جو اسے متروک الاستعمل قرار دیا جاتا ہے؟—

(۲) وہ کون شخص یا اشخاص ہیں جو الفاظ کو متروک قرار دینے کے اہل ہیں؟—

(۳) جو الفاظ وغیرہ متروک بتائے جاتے ہیں آیا وہ اردو زبان سے نکالدئیے گئے ہیں یا صرف اردو کی نظم سے؟ اگر صرف نظم سے خارج کئے گئے ہیں تو اس اخراج کا اطلاق محض غزل اور عاشقانہ شاعری پر ہے یا نئے طرز کی شاعری پر بھی جسے بوجہ اختصار نیچرل شاعری کہا جائے گا؟—

اس ضمن میں اور بھی بہت سے امور تنقیح ہیں لیکن طوالت کے خوف سے انہیں تین امور کا ذکر کیا جاتا ہے—

(۱) جن الفاظ یا ترکیبوں کو ہم سب اردو میں ترک کر بیٹھے ہیں ان میں سے کسی ایک کی نسبت بھی کبھی یہ سننے میں نہ آیا کہ ان وجوہ سے یا اس اصول کے تحت میں یہ لفظ ترک کیا گیا۔ ابتدا سے اب تک یہ بد عنوانی چلی آئی ہے اس سے بدعت اور طوایف الملوکی کا ہنگامہ گرم ہوگیا۔ جو جس کے جی میں آیا کر گزرا۔ متروکات کی فہرست پر جب غور کی نظر ڈالی جاتی ہے تو ثابت ہوتا ہے کہ چھانت چھانت کر ٹھیٹھ اردو الفاظ جو زبان میں مدتوں سے رچے پچے تھے کان پکڑ کر اردو کی سبھا سے باہر کئے جاتے ہیں۔ اور اردو کو عربی، فارسی لغات سے گرانبار کیا جاتا ہے۔ میں اس ضمن میں اُن کا ذکر نہیں کرونگا جو دوسری طرف سنسکرت لغات کی بھر مار کررہے ہیں۔ کیونکہ وہ تعداد اور اثر میں کم ہیں۔ اردو کے کسی ہندو شاعر یا ادیب کو جس کی ادبی حیثیت مسلمہ ہو یہ الزام نہیں دیا گیا کہ وہ زبان میں اس طرح ثقالت پیدا کر رہا ہے۔ مختصر یہ کہ کیا ہندو اور کیا مسلمان اردو لکھنے والے سب ہی ارادی یا غیرارادی متروکات کے باب میں برابر ہیں—

میں اس جگہ ہندوستانی کے دو لفظ لکھتا ہوں-سندیسا اور-بتھا-یہ دونوں لفظ اردو لغات میں موجود ہیں-ان میں سے سندیسا نوراللغات کی متروکی فہرست میں داخل ہے-دوسرا لفظ بتھا اس میں نہیں آیا-شاید کسی نے استعمال بھی نہیں کیا-راقم نے ایک جگہ استعمال کیا ہے اب ذرا ان دونوں لفظوں کے معنی کو دیکھئے-سندیسا کے معنی ہیں، راضی خوشی کا پیغام-خیریت کی خبر-عربی فارسی کا کوئی لغت جو اس معنی کا حامل ہو ابتک اردو کے علم سے باہر ہے-اُن زبانوں میں اس کا کوئی مترادف ہوگا بھی تو وہ لغات کے محبس میں قید ہوگا-مژدہ یا نوید سندیسا کے مترادف نہیں ہوسکتے کیونکہ وہ ایک خاص مسرت آمود واقعہ کی خبر دیتی ہیں-پیغام بری بھلی دونوں قسم کی خبر پر محتوی ہوتا ہے-صلح کا پیغام بھی ہوتا ہے اور جنگ کا بھی-نوراللغات کے جامع سے پوچھنا چاہئے کہ یہ لفظ کس وجہ سے متروکات کی فہرست میں شامل کیا گیا-اور یہ کہ سندیسا کا مترادف لفظ پیغام انہوں نے کس تحقیقات کی بنا پر لکھدیا ہے-وہ اس میں غلطی پر ہیں-اگر پیغام سندیسا کا مترادف ہوسکتا ہے تو سنانی کو بھی کیوں نہ ایسا مانا جائے-آپ کا کوری کے رہنے والے ہیں جو قصبہ زبان کے اعتبار لکھنؤ کا متبع ہے-اگر لکھنؤ نے اس لفظ کو ترک کردیا تو میں پوچھنا چاہتا ہوں کہ اس نے اس لفظ کو استعمال کب کیا تھا-اخذ، اختیار یا استعمال کئے بغیر ایک شے ترک نہیں کی جا سکتی ہے - کسی ہندو کا یہ کہنا کہ ختنے کا ترک کیا جائے یا کسی مسلمان کا یہ کہنا کہ مردے کو جلانا متروک ہے ایسا ہی لایعنی ہے جیسے یہ کہنا کہ سندیسا اردو میں متروک ہے - غلط ہے - کیون کہ یہ لفظ لکھنو نے کبھی استعمال ہی نہیں کیا- بہر حال انہیں چاہئے تھا کہ لکھنو کے متروکات کی اور ان

● دیکھو فرہنگ آصفیہ-مولفہ شمس العلما سید احمد صاحب دہلوی

ان الفاظ کی جنہیں اور مقاموں کے برخلاف لکھنو نے استعمال نہیں کیا ایک ایک علحدہ فہرست مرتب کرتے تا کہ پڑھنے والے کو دھوکا نہوتا - متروک الفاظ کی مثالوں میں انہوں نے جابجا دھلی اورلکھنو اور سب مقاموں کے شاعروں کے کلام نقل کر دئے ھیں - اس سے یہ شبہ ھوتاھے کہ ان کی یہ فہرست کل اردو دنیا کی مسلمہ ھے - مگر جہاں تک اس لفظ کا تعلق ھے یہ ادعا درست نہیں - داغ کے ھاں یہ لفظ مہتاب میں آیا ھے—

سنکے وہ حال مرا غیر سے فرماتے ھیں
آئے ھیں آپ محبت کا سندیسا لیکر

میری رائے میں ھمارے پاس کوئی وجہ موجود نہیں کہ اس لفظ کو متروکات میں داخل کیا جائے - دوسرا لفظ جسکا ذکر آگے آیا بتھا ھے - اسکے معنی ھیں تکلیفوں یا مصیبتوں کی روداد یاداستان غم - میرے علم میں مختلف زبانوں کے ان لغات میں سے جنسے اردو کو شناسائی ھے ایسا پر معنی مفرد لفظ کوئی نہیں دکھائی دیتا - پھر کیوں نہ اسے رواج دیاجائے - ابتک ھم یہی سنتے آئے ھیں کہ فلاں لفظ فلاں ترکیب فصحا یا اکثر فصحانے ترک کردی - کوئی پوچھے کہ حضرت آخر اس ترک کی وجہ - اسکا موجب؟ تو جواب ندارد - یہ کبھی ظاھر نہ ھوا کہ فصاحت اور فصیح کی تعریف کیا قرار دی گئی ھے - اسکا معیار کیا ھے؟ اس کے موازنے کے کیا اصول ھیں - مزاج کی سودائیت نے ایک حساسی کیفیت پیدا کرکے قوت ممیزہ کو ماؤف کردیاھے - نتیجہ یہ ھوا کہ ھرشے میں "آدم بو" کا مضموں صورت پذیر ھو گیا - نہ لفظ کی صرفی ماھیت پرنظر کی گئی، نہ اس کی معنوی اھمیت کا لحاظ ھوا اور خرج یخرج ترک یترک کی گردان شروع ھو گئی - یہ دیکھہ کر بڑا اچنبھا ھوتاھے کہ اس اچھوت سدھار دلت اودھار، تبلیغ اور مساوات کے زمانے میں جب ھرایک دوسرے کو اپنے میں لینے کو لپکتا ھے اردو میں "نکالو! باھرکرو!" کے سوا اور کوئی صدا

سننے میں نہیں آتی- یہ بیوقت کا راگ ہے- اردو والے یادرکھیں اور خوب یاد رکھیں کہ اگر اُن کے متروک الاستعمال کی لے اسیطرح بڑھتی گئی تو ان کی وہی گت ہوگی جو "خارج از برادری" کی لے نے ہندؤں کی بنائی- خوف ہے کہ کہیں اردو ادب کو ان "تارکان ادب" کے ہاتھوں وہی دن دیکھنا نصیب نہو جو چھوت چھات اور سوچم کی مریضانہ حساسی نے ہندؤں کے قومی ادبار کا منہتے ثابت کیا- کوڑھی کے ساتھہ کوئی کھانا نہیں کھاتا- کھجلی والے سے سب الگ رہتے ہیں- ہیضہ اور پلیگ کے مریض سے سب ہی بچنا چاہتے ہیں یہاں تک تو احتیاط کرنا درست - اس سے زیادہ بیماری ہے خواہ وہ سوشل معاملہ میں ہو یا ادبی میں —

(۲-۳) اب یہ سوال اٹھتا ہے کہ اگر داغ اور امیر نے یا غالب اور مومن نے- میں کہتا ہوں شاہ نصیر اور ناسخ نے کچھہ الفاظ اردو کی برادری سے خارج کئے تو کیا وہ اب پھر اس میں داخل نہیں ہوسکتے ؟ ہم دیکھتے ہیں کہ سو کوئی تیس چالیس برس متروک رہنے کے بعد اب اردو میں واپس آیا ہے ان سب باتوں سے قطع نظر دیکھنا تو یہ ہے کہ متاخرین اور معاصرین شاہ نصیر سے لیکر داغ تک اور داغ سے لیکر آج تک - جن شاعروں نے نظم کے فن کے قاعدے وضع کئے اور خاص خاص لفظوں یا ترکیبوں کو متروک قرار دیا ان کی حیثیت اردو نظم کے باب میں کیاتھی بلحاظ اس کے مختلف اصناف اور موضوع کے تنوع کے-متقدمین سے قطع نظر کرکے شاہ نصیر سے لیکر مرزا داغ تک کیا لکھا کرتے تھے- ان کے کلام کی نوعیت کیا تھی-اس کا میدان کتنا وسیع تھا؟ "نام نیک رفتگاں" کو ضایع کرنا اپنا شیوہ نہیں-یہ اور دوسرے بزرگ نہ صرف ہمارے لئے بلکہ تمام اردو دنیا کے لئے ہمیشہ واجب التعظیم رہینگے-لیکن سچ کنے سے چارہ نہیں- کہنا پڑتا ہے کہ غزل اور کبھی کبھی قصیدہ کے سوا اور صنف میں یا کسی مفید اور کار آمد موضوع پر انہوں نے کبھی فکر نہیں کی-وہ جس صنف میں بھی

لکھتے اس پر وھی مجاز کا رنگ حاوی تھا- لیکن اس سے ان پر کوئی الزام عاید نہیں ھوسکتا- اس زمانہ کی چال یہی تھی اور ملک کا مذاق ھی ایسا تھا- آزاد مرحوم نے بیشک چھاتی پر سل رکھہ کر یہ سطریں لکھی ھونگی:-

"......... دوسرے وہ عالی دماغ جو فکر کے دخان سے
ایجاد کی ھوائیں اڑائینگے اور برج آتشبازی کی طرح
اس سے رتبۂ عالی پائینگے- انھوں نے اس ھوا سے بڑے
کام لئے مگر یہ غضب کیا کہ گرد و پیش جو وسعت
بے انتہا پڑی تھی اس میں سے کسی جانب میں نہ گئے-
بالاخانوں میں سے بالا بالا اڑ گئے" * —

جس شاعری کی یہ بساط ھو کہ مخفی خیال بندی اور قافیہ پیمائی سے شروع ھو کر اسی پر اس کا خاتمہ ھوجاے- یعنی غزل- اور غزل کی ھر بیت بجاے خود ایک قایم بالذات نظم- مطلع میں رستم سے کشتی لڑ رھے ھیں- حسن مطلع میں موت کا فرشتہ شاعر کی روح قبض کرنے آتا ھے لیکن آپ اتنے نحیف اور ضعیف ھیں کہ اسے دکھائی ھی نہیں دیتے اور وہ خالی کا خالی چلا جاتا ھے- اگلے شعر میں آپ کا جنازہ اٹھتا ھے اور آپ شرمسار ھیں کہ نازنین معشوق کو چالیس قدم ساتھہ چلنے کی اذیت ھوئی- اُس سے اگلے شعر میں آپ ساغر اور پیمانہ پٹک کر مٹکا ھی منہہ سے لگاکر شراب پی رھے ھیں- اور آگے چل کر آپ کا اپنے محبوب سے اختلاط ھو رھا ھے.. مقطع میں آپ میں اور آپ کے خدا میں نام کو فرق اور امتیاز نہ رھا- یہ گڑ بڑ جھالا ایران سے ھندوستان میں آئی اور یہاں اسے اور بھی بگاڑ دیا گیا- مختصر یہ کہ غزل کیا ھے؟ چند قوافی کا خوش اسلوبی سے نباہ- قصیدہ کیا ھے؟ مبالغہ کا قطب مینار- جس شعر گوئی کی یہ کائینات اور

* آب حیات- پانچویں دور کی تمہید

غرض و غایت ہو اُسے شاعری کہنا ہی معقولیت سے خارج ہے اول تو انھوں نے یا کسی اچھے شاعر نے کوئی قاعدے شعر کے فن یا متروکات کو کبھی وضع کئے ہی نہیں۔یہاں یہ ذکر کرنا بر محل ہوگا کہ کسی زبان میں بھی اچھے شاعروں نے شاعری کے قاعدے نہیں باندھے۔اور اگر کہیں اس کے خلاف ہوا ہے تو النادر کالمعدوم کی مصداق ہے۔خیر' اردو کے ان استادوں کے کلام یا ان کی اصلاحوں سے لوگوں نے بالواسطہ کچھہ باتیں استنباط کر کے ان کا نام قاعدہ اور ضابطہ رکھہ لیا۔بہر حال آج کل کے زمانہ اور موجودہ صورتوں میں نہ وہ قاعدے جوں کے توں واجب التعمیل ہیں اور نہ ان کے وضع کرنے والے یہ اہلیت رکھتے تھے۔ان کا اطلاق زیادہ سے زیادہ پرانی چال کی عاشقانہ شاعری پر ہوسکتا ہے۔ دوسروں پر۔کہئے نیچرل شاعری پر لازم نہیں آتا کہ وہ بھی ان الفاظ اور ترکیبوں کے استعمال سے محترز رہیں محض اس بنا پر کہ فلاں استاد نے ایسا کیا۔وہ دہلی کی سادہ کاری ہو یا لکھنؤ کی مرصع سازی۔یا پنجاب کی ہر ہفت پردازی غزل کی شاعری کے متعلق متروکات کی لے جتنی جی چاہے بڑھاتے جائیے لیکن یہ قیدیں نیچرل شاعری پر عاید نہیں ہوسکتیں۔حالی مرحوم کا تقریباً وہ تمام کلام جو مسدس کی تصنیف کے بعد موزوں ہوا۔حضرات صفی۔چکبست۔سرور مرحوم اور اقبال کی اکثر اور بیشتر نظمیں اور اسی قبیل سے اردو کے اکثر اچھے شعرا کا کلام " تنگنائے غزل " سے پرے پرے جاتا ہے۔جب آپ معشوق سے باتیں کرینگے یا اس کا ذکر۔تو بیشک چھوٹے چھوٹے سہانے لفظ۔نازک اسلوب اور میٹھی بولی میں گفتگو ہوگی۔لیکن جب زندگی کے جید مسایل یا حقیقت اور انسانی جذبات کے شدید موضوعات پر لکھنے بیٹھینگے تو سخن کا طرز اور ہوگا۔ غرض کہ خیال کی شاعری کام کی شاعری سے جداگانہ ہے۔اس کے قاعدے اور ضابطے بھی جداگانہ ہونے چاہئیں اور ان کے وضع کرنے والے بھی۔ان وجوہ سے میں یہ عرض کرنے کی جرات کرتا ہوں کہ وہ قاعدے جو اب تک نظم کے لئے

باندھے گئے ھیں اور وہ الفاظ اور ترکیبیں جنھیں ترک کردیا گیا ھے ان سب کی نظر ثانی اور ترمیم کی ضرورت ھے-جبھی تو ھم دیکھتے ھیں کہ کئی لفظ تیس چالیس سال متروک رھنے کے بعد اب پھر زبان میں داخل ھو گئے ھیں جیسے سو، خیر یہ بات تو دور کی ھے نہ اب تک کسی کے ذھن میں آئی نہ اب سے پہلے کبھی اس سے بحث ھوئی-غزل کو ھی لیں تو ظاھر ھو گا کہ جو الفاظ وجوباً یا ترجیحاً متروک بتاے جاتے ھیں ان کے ساتھہ غزل کے نامی شاعر اور دوسرے شعرا کا کیا عمل ھے؟—

آیندہ مندرجات کے متعلق راقم نے یہ التزام کیا ھے کہ داغ اور امیر کو ایک حد قایم کرکے دکھایا گیا ھے کہ آیا انھوں نے ایک لفظ جسے متروک کہا جاتا ھے استعمال کیا یا نہیں اور یہ کہ ان کی وفات سے آج تک مشاھیر شعرا کا کیا سلوک اس لفظ کے ساتھہ رھا ھے اس زمرہ کے اکثر شعرا اس وقت موجود ھیں اور اردو دنیا میں عزت کی نگاہ سے دیکھے جاتے ھیں—

اب میں چند ایسے الفاظ سے بحث کرونگا جنھیں متروک ٹھرایا جاتا ھے-استعمال کے ثبوت میں اساتذہ اور مشاھیر شعرا کے تازہ ترین کلام سے جو دستیاب ھوسکا اشعار نقل کئے گئے ھیں-داغ کے تمام اشعار مہتاب سے-امیر کے صنمخانہ سے-جلال کے نظم نگارین سے اور جلیل کے جان سخن اور تاج سخن سے لئے گئے ھیں-میری علم میں ان اصحاب کے یہ سب سے اخیری مطبوعہ دیوان ھیں-اور حضرت جلیل کے دونوں دیوانوں کی عمر دس بارہ برس سے زیادہ نہیں-ان شعرا کے کلام کی طرف اس مضمون میں جہاں کہیں اشارہ کیا گیا ھے وھاں ان کی انھیں کتابوں سے مطلب ھے جنکا ذکر ابھی کیا گیا-دوسرے شاعروں کا کلام جہانتک ممکن ھوا ھے معتبر رسالوں اور کتابوں سے لیا گیا ھے-ناظرین کی آسانی کے لئے ان کی ایک فہرست ذیل میں درج کی جاتی ھے—

ابر مرحوم-آنیربل پنڈت بشن نراین در صاحب لکھنوی-بیرسٹرایٹ لا—

ابر ـ مقلد میر و غالب جناب حکیم سید علی حسن صاحب لکھنوی —

اقبال ـ ڈاکٹر سر شیخ محمد اقبال ـ ایم اے ـ پی ـ ایچ ڈی ـ بیرسٹر ایٹ لاء سیالکوٹی —

اکبر ـ جناب سید اکبر حسین صاحب الہ آبادی ـ مرحوم —

امیر ـ جناب منشی امیر احمد صاحب مینائی ـ لکھنوی ـ مرحوم —

باسط ـ جناب سید محمد باسط علی صاحب بسوانی —

برق ـ جناب منشی جوالا پرشاد صاحب بی ـ اے لکھنوی ـ سشن جج اودھ مرحوم —

برق ـ جناب منشی مہاراج بہادر صاحب دہلوی ـ منشی فاضل —

برہم ـ جناب حکیم عبدالکریم صاحب گورکھپوری ـ اڈیٹر مشرق و فتنہ وغیرہ ـ

بلیغ ـ جناب نواب سید عسکری مرزا صاحب لکھنوی —

بیخود ـ جناب منشی سید وحید الدین صاحب ـ دہلوی —

جلال ـ جناب حکیم سید ضامن علی صاحب لکھنوی ـ مرحوم —

جلیل ـ جلیل القدر فصاحت جنگ جناب حافظ جلیل حسن صاحب مانکپوری —

چکبست ـ جناب پنڈت برجنرائن صاحب چکبست بی ـ اے ـ ایل ـ ایل ـ بی ـ وکیل ہائی کورٹ ـ لکھنوی * —

حسرت ـ جناب مولانا سید فضل الحسن صاحب موہانی ـ بی ـ اے ـ اڈیٹر اردوے معلے —

داغ ـ فصیح الملک دبیر الدولہ ناظم یار جنگ جناب نواب مرزا خاں صاحب دہلوی ـ مرحوم —

---

* آپ نے کوئی تخلص ہی نہیں رکھا چکبست آپکا خاندانی عرف ہے آپ چونکہ اسی نام سے معروف ہیں اس لئے خمخانۂ جاوید کے اتباع میں عنوان آپ کے نام کے لئے اختیار کیا گیا —

راسخ - جناب مولوي سيد عبدالرحمن صاحب دهلوی - مرحوم —
ریاض - جناب سید ریاض احمد صاحب خیرآبادی —
زکی - جناب مولانا سید زکریا خاں صاحب دهلوی - مرحوم —
سایل - جناب نواب سراج الدین احمد خاں صاحب - دهلوی —
سرور - جناب منشی درگا سہائے صاحب جہان آبادی - مرحوم —
سلیم - جناب مولانا وحیدالدین صاحب پانی پتی - پروفیسر عثمانیه یونیورسٹی —
شاد - یمین الملک سر مہاراجه کشن پرشاد صاحب - حیدرآبادی —
شاد - خاں بہادر جناب مولوی سید علی محمد صاحب عظیم آبادی —
شاعر - افسرالشعرا جناب آغا شاعر صاحب دهلوي شاعر دربار جهالاوار
شوق - جناب منشی احمد علی صاحب قدوائی - لکھنوی مرحوم —
صفدر - جناب مولوی صفدر علی صاحب مرزا پوری —
صفي - جناب مولانا سید علي نقي صاحب لکھنوی —
ضامن - جناب مولوی سید ضامن علي صاحب کنتوری —
ظہیر - جناب مولانا سید ظہیرالدین حسین صاحب - دهلوی - مرحوم —
عزیز - جناب مولوی مرزا محمد هادی صاحب بي اے لکھنوی - پروفیسر عثمانیه یونیورسٹی —
محروم - جناب منشی تلوک چند صاحب - ڈیرہ اسمعیل خاني —
مضطر - جناب حکیم اسد علیخان صاحب دهلوی —
نادر - جناب مولوی نادر علیخان صاحب کاکوری مرحوم —
نظر - جناب منشی نوبت رائے صاحب لکھنوی مرحوم —
نظم - نواب حیدر یار جنگ جناب مولانا علي حیدر صاحب طباطبائي لکھنوی —

وحشت - جناب سید رضا علي صاحب کلکتوی —

یاس - جناب مرزا واجو حسین صاحب عظیم آبادی —

پہ - بمعني پر | حضرت شوق نے اسے اپنی متروکات کی فہرست میں نہیں شامل کیا حضرت عشرت لکھنوی نے اس کا ذکر کیا ھے - فرماتے ھیں:-

پہ کا استعمال اب اکثر فصحا نے ترک کردیا ھے - اس کے بدلے (پر) بولتے ھیں- آخر میں داغ و جلال نے بھي ترک کردیا" صاحب نوراللغات اس لفظ کي نسبت یہ لکھتے ھیں:- "یعنی فصحانے اس کا استعمال نثر اور بول چال میں ترک کردیا ھے" اس باب میں راقم کے خیال میں حضرت عشرت کے مقابلے میں نوراللغات کا قول زیادہ معتبر ھے - اس سے ظاھر ھےکہ نظم میں یہ کلمہ متروک نہیں - اکثر شعرا کے کلام سے بھي ایسا ھي پایا جاتا ھے - خود داغ اور جلال کے ھاں یہ لفظ موجود ھے —

داغ

کاش تو گور غریباں پہ نہ مضطر پھرتا
صبر سے ناز سے تمکین سے ٹھہرکر پھرتا

دیکھو دیکھو مجھہ پہ برساتے رھو تیر نگاہ
صید جس دم آنکھہ سے اوجھل ھوا جاتا رھا

دل کو لے لیتے ھیں در پردہ وہ عیاری سے
چار غیروں پہ جو کھلجائے تو پھر گھات ھی کیا

امیر

کیوں مرے سر پہ نہو لغزش پا کا احساں
ھاتھہ پڑجائے جو بیساختہ اس شانے پر

درکار ھے بہانہ پئے مغفرت امیر
نقوے پہ منحصر ھے نہ صوم صلوت پر

ظہیر

کس کو غرض کہ دل کی مصیبت میں جی جلائے
اپنی خوشی کی کسی پہ اگر آئے آئے دل

شاد عظیم آبادی

ان محنتوں پہ بھی یہ مرا ہورہا تھا حال
لڑکوں کی بھی سند تھی پہ میں غیر مستند

نظم

کیوں تن آسانی پہ مایل ہو گئے
جو فضایل تھے رذایل ہو گئے
دامن ہستی پہ تھیں داغ سیاہ
مٹ گئیں اس طرح جیسے دھو گئیں

جلیل

میرے زخموں پہ چھڑک کر وہ نمک کہتے ہیں
وہ تھا تلوار کا جوہر یہ ہے جوہر اپنا

بیخود

کیوں اُلجھتے ہو ہر اک بات پہ بیخود ان سے
تم بھی نادان بنے جاتے ہو ناداں کے ساتھ

حصر کعبہ پہ کیا ہے دیر سہی   حج کا موسم نہیں تو سیر سہی

سایل

منہ پہ ملتا ہوں تری خاک قدم رو رو کر
کرنا پڑتا ہے وضو کر کے تیمم مجھ کو

برق لکھنؤ

گھونگٹ اک ناز سے نکالے
سہرا پھولوں کا منہ پہ ڈالے

چرخ چہارم پہ ہے نمایاں
فیاض زماں مسیح دوراں

ابر

غور سے جب کسی دیوانہ کی حالت دیکھی
دل پہ اک چوٹ لگی ہائے میں وحشی نہ ہوا

صفی

حسن رسوا ہو دل اس بات پہ راضی نہ ہوا
اک نظر دیکھ لیا اس کو جو کوئی نہ ہوا

عزیز

طبقۂ گور گریباں پہ ذرا یوں نہ چلو
اک قیامت ہوئی یہ زور جوانی نہ ہوا
میں نے مجموعۂ جذبات پہ کی جب کہ نظر
تیری تاثیر تھی اے جلوۂ جاناں نہ جدا

وحشت

تیری رعنائی قامت کا بھلا کیا کہنا
ایسے مصرع پہ تو استاد ازل صاد کرے

چکبست

موت کے رنگ سے مٹتا ہے کہیں رنگ شباب
سرد ہونٹوں پہ جوانی کی ہنسی آتی ہے

سرور

جس پہ اتراتی ہے اب تک آہ تیری خاک پاک
دفن ہے زیر زمیں پہ کون فخر روز گار

مضطر

تیرے وعدہ پہ مرتا ہوں قیامت کے لئے ظالم
کوئی تہمت لگا مجھ پر کوئی طوفان پیدا کر

برق دہلوی

گر مجھ سے تیرا دل نہیں ملتا نہیں سہی
تو جس پہ جان دیتا ہے کر اس کی دلدہی

باسط

آئینہ زانو پہ رکھا جب وفور جوش میں
ماہ کامل کو لئے بیٹھا تھا میں آغوش میں

سلیم

ہیں تیری شمع حسن پہ پروانہ اس لئے
شعلوں سے کھیلتے ہیں تری انجمن میں ہم

راسخ

اس پہ عاشق ہیں نگہ باز ہیں راسخ ہم بھی
دیکھ لیں گے نہ دکھاے رخ روشن سہرا

میں نہیں جانتا وہ کون سے فصحا ہیں اور کہاں رہتے ہیں جنہوں نے بقول جناب عشرت پہ بمعنی پر اب ترک کردیا ہے-جن شاعروں کے کلام سے ابھی اقتباس کیا گیا ہے وہ بیشک فصیح سمجھے جاتے ہیں اور ان میں سے اکثر اس وقت بفضلہ موجود ہیں-حضرت عشرت کو اس قسم کے اجتہاد سے آئندہ احتیاط چاہئیے-اب رہا نوراللغات کا قول-اس مضمون میں ہمارا روے سخن اردو کی نظم کی طرف ہے-بول چال کا جو اس میں ذکر آیا ہے سو بول چال کی کوئی سند نہیں—

جلال مرحوم کے ہاں (ان کو چوتھی دیوان نظم نگاریں میں) بیشک یہ

لفظ نہیں آیا-اس کے بدلے ہر جگھہ انہوں نے پر ہی لکھا ھے لیکن بوجہ ادغام کے جو انہیں اکثر و پیشتر موقعوں پر کرنا پڑا ھے بیسوں جگھہ " پر آیا " کا " پرا یا " وغیرہ شکلیں پیدا ھوگئی ھیں-اس سے تو کہیں بہتر تھا کہ وہ پہ ھی استعمال کرتے-اس کے علاوہ متروکات کے باب میں جناب جلال کو سند پیش کرنا شاید ٹھیک نہ ھوگا کیوں کہ ان کے ھاں بہت سے قدیم اور مسلمہ متروکات موجود ھیں-جیسے انکھڑیاں-اسی دیوان میں فرماتے ھیں:—

اپنی شوخ انکھڑیوں میں کچھہ تو حجاب آنے دو
راہ پر آئیں جو یہ خانہ خراب آنے دو

اس کے علاوہ چٹیلا، بے مرمتے نہ جاے، بہ سہل، پری گات، رسوا کن و غماز، جانی، بن ٹھن رھنا، پیش اھل مذاق، جاویداں، نڈری، نفس چند کے سہماں، گہ، پھبن کی تذکیر وغیرہ الفاظ اور ترکیبیں ان کے ھاں کثرت سے موجود ھیں-میں یہ ضرور کہونگا کہ بعض اُمور کا لحاظ اُنھوں نے بہت کیا ھے چنانچہ اُن کے ھاں کہیں خود رفتہ نہیں آیا ھر جگہ بڑے جد و جہد سے از خود رفتہ اور از خود رفتگی ھی لاے ھیں-حکیم صاحب مغفور کے مداح آزردہ ھوں گے ورنہ یہ ثابت کیا جا سکتا ھے کہ چند فارسی اور بعض اُردو "متروکات" سے بچنے میں ان کا ذھن اتنا صرف ھو گیا کہ اُن کے کلام میں تخیل شاعرانہ کا اتنا نشان بھی نہیں ملتا جتنا بیچاری غزل کے لئے ضروری سمجھا گیا ھے—

پر بمعنی مگر یا لیکن

حضرت شوق لکھتے ھیں "پر بمعنی لیکن بعض فصحا نے ترک کر دیا ھے" معلوم نہیں وہ بعض فصحا کونسے ھیں جنھوں نے بہ لفظ متروک قرار دیا-جناب عشرت لکھتے ھیں "آخر میں داغ و جلال نے بھی ترک کر دیا تھا" جلال کی متروکات کی نسبت اوپر کچھہ ذکر آگیا ھے-داغ کے اخیری دیوان میں ایسے بہت سے لفظ اور ترکیبیں موجود

ہیں جنہیں متروک بتایا جاتا ہے مثلاً سو، ساقیا، گلابی پوش، وہ ہی، بسا غنیمت، تا بہ حشر، دستگہ، روسیہ، سدا، دیجیے بجائے دیجئیے وغیرہ۔اس لئے اس باب میں نہ جلال کی سند مسلم ہو سکتی ہے نہ داغ کی۔ نوراللغات شوق کا ہمنوا ہے چونکہ اس معنی کا حامل اور کوئی لفظ اتنا مختصر نہیں ہے اس لئے اگر اسے صرف عشقیہ غزل کے متعلق متروک سمجھا جائے تو مضائقہ نہ ہوگا مگر نظموں میں یا نیچرل مضمون کی غزلوں میں ہرگز ایسا نہیں ہونا چاہئیے۔اس لفظ میں نہ کوئی ثقالت ہے نہ ذم کا پہلو اور پھر اتنا مختصر۔ کوئی وجہ نہیں کہ اسے ترک کیا جائے۔چند فصحا کے کلام سے استفادہ کیا جاتا ہے —

امیر

سیہ کاری سے جی بھرتا نہیں پر شام آتی ہے
کہاں تک بوجھ رکھئیے کاتب اعمال کے سر پر

لگایا تو گلے سے پر لگائی تیغ بھی آکے
ملا تو عید کے دن وہ مگر چیں برجبیں ہوکر

اس قدر ہے دراز ہجر کی رات — پر تڑپنے سے جی نہیں بھرتا

نظر

نظر ہم کو علاقہ شعر سے کیا پر یہ حسرت ہے
نہ رہتے ہم تو اپنا ذکر اس محفل میں رہ جاتا

صفی

لب پر اک موج تبسم ہاتھ میں ہلکی سی تیغ
نیم بسمل سیکڑوں پر نیم جاں کوئی نہیں

ابر مرحوم

جو نازک طبع ہیں مٹ جاتے ہیں پر اُف نہیں کرتے
شکست رنگ گل کی کب صدا آتی ہے گلشن میں

برق لکھنوی

ہر ایک کا جدا ہے رنگ و روغن پر سبزہ پہ ہے بلا کا جوبن

بہ ظاہر یہ پایا جاتا ہے کہ پر کلمۂ استثنا کے معنی میں متروکات دہلی میں سے ہیں —

گر، بجائے اگر شوق لکھتے ہیں "گر بجائے اگر بعضوں نے وجوباً ترک کر دیا ہے" عشرت نے اس لفظ کو متروکات میں نہیں لیا - نوراللغات اُردو نثر میں متروک اور نظم میں اگر کو فصیح قرار دیتا ہے - اس کی نسبت بھی میرا وہی قول ہے جو 'پر' کی نسبت آچکا ہے اب شعرا کا قول سنئے :—

داغ

فتنہ سازی بھی مرے دل کی قیامت ہوتی
گر ترے کوچے کی مٹی سے بنایا جاتا

اے واعظ اس کا ڈر ہے کہ آئے نہ آئے راس
گر بادۂ ظہور مرے حق میں سم ہوا

امیر

کرتے تو ہو سوال امیر اس سے حشر میں
اور اس کو گر جواب نہ آیا تو پھر کہو

بیخود

سنو گے اسی طرح گر بن کے پتھر
نہ میں کہہ سکوں گا نہ تم سن سکو گے

جلیل

یہی عالم ہے گر جوش جنوں میں خاک اُڑانے کا
زمیں بھی سر پہ اک دن آرہیگی آسماں ہو کر*

---

* تارکان ادب کے قول کے مطابق اس شعر میں دو متروکات موجود ہیں - دوسرے مصرعہ میں بجائے 'پر' کے 'پہ' آیا ہے مگر شعر کی شان ملاحظہ کے قابل ہے —

نظر

نہ دیتا گر سہارا کچھہ اُمید وصل کا طوفاں
شناور بحر غم کا حسرت ساحل میں رہ جاتا

محروم

ہم کو گر ہستی جاوید عطا کی تو نے
اپنے الطاف پہ اک اور اضافہ کر دے

برق دہلوی

گر اور ہی کسی پہ ترا دل نثار ہے
دم بھر بھی گر تجھے مرے ملنے سے عار ہے (مثنوی)

صفدر

وزیر اس وقت گر ہوتے تو ان سے پوچھتے ہم بھی
لیا ملک معانی کس نے شاہ شاعراں ہو کر

راسخ

گر مال طلب کروں تو کتنا چاہو
کیا مجھہ پہ بنی ہے کیوں یہ فتنہ چاہو

نظم

اُلٹ جانے کی شایاں گر زمیں ہے
تو پھٹ پڑنے کے قابل آسماں ہے

تلک | جناب شوق کے قول کے مطابق "اکثر خواص نے ترک کر دیا ہے" اور یہ امر واقعہ ہے کہ ایسا ہوا ہے۔ جناب عشرت کی متروکی فہرست میں یہ لفظ شامل نہیں۔ بقول نوراللغات "خاص خاص شعرا نے ترک کر دیا ہے" معلوم یہ ہوتا ہے کہ سنہ ۱۸۸۷ء کے بعد یہ لفظ پھر تناسخ پذیر ہو گیا اور صرف خاص خاص شعرا ہی اسے مردہ سمجھتے رہے۔ لیکن موجودہ شاعروں کا

کلام دیکھنے سے پایا جاتا ھے کہ غالباً اس خوف سے کہ مبادا تنقید کے توپ خانہ کا منہ ان کی طرف موڑ دیا جاے اول صنف کے اکثر شاعر اس کے استعمال سے پرھیز کرتے ھیں-جو عہد متروکات کے باب میں تعین کر چکا ھوں اس میں اس کے استعمال کی مجھے صرف تین نظیریں ملیں-بعض الفاظ خواہ مخواہ مرعوب ھو کر بھی ترک کر دئے جاتے ھیں-اگر یہ لفظ ترک کر دینے کے قابل ھے تو اس کی وجہ کیوں نہیں بتائی جاتی-مانا کہ 'تک' اس کا مرادف اور اس سے مختصر لفظ موجود ھے-مگر جب نظم میں قافیہ کی قید لازمی ھے تو ملک اور فلک کا ایسا بولتا ھوا قافیہ کیوں لغات سے خارج کیا جاتا ھے-اگر امیر مرحوم فصاحت کے باب میں خصوصیت رکھتے تھے تو سنئے وہ کیا کہتے ھیں:—

امیر

دھوم کرتا ھے تو اے وحشت تو خاطر خواہ کر
شہر گردی کب تلک صحرا سے بھی کچھہ راہ کر
کعبہ نہ جاے جو رہ نہ پہنچے خدا تلک
زاھد خدا کے گھر کی یہی ایک راہ ھے

اقبال

ھمنشیں افسانۂ بیداری جمہور چھیڑ
قصۂ خواب آور اسکندر و جم کب تلک (کب تلک ردیف)

معلوم ھوتا ھے کہ تلک کا ترک دھلی کے اجتہادات میں سے ھے نہ داغ کے ھاں آیا اور نہ دوسرے مشاھیر کے ھاں ملا-لکھنؤ بھی اب اس سے محترز ھو چلا ھے-بہر حال غزل کے متعلق راقم کو اس لفظ کی حمایت میں اصرار نہیں—

یاں-واں

بقول شوق محض غیر فصیح ہے اور اکثر شعرا نے ترک کر دیا ہے-
قرار نے اس کا ذکر نہیں کیا-نوراللغات کے ارشاد کے بموجب
"فصحاے دھلی استعمال کرتے ھیں لکھنؤ کے بعض شعرا احتراز کرتے ھیں"
لیکن تحقیق کا نتیجہ اس کے برعکس ہے-داغ کے ھاں یہ لفظ کہیں نہیں آیا-نہ
مشاھیر دھلی کے کلام میں دیکھا گیا-ھاں لکھنؤ اور اس کے توابعات میں اس
کا استعمال کم و بیش پایا جاتا ہے-جس لفظ کو امیر آخیر تک استعمال کرتے
رھے اور جلیل اور چکبست اب تک کر رھے ھیں وہ بقول شوق غیر فصیح
کیسے ھو سکتا ہے اور اس پر طرہ یہ کہ وہ شوق کا اجتہاد اس باب میں
دیکھہ چکے تھے—

امیر

کسی پہ زخم پڑا یاں جگر پہ آئی چوٹ
بھلا ھو زخم کا اپنی ھوئی پرائی چوٹ
مجھہ سے ھو سکتا کہ دیتا بازوے قاتل کو رنج
واں ھوئی ابرو کو جنبش یاں بدن پر سر نہ تھا

جلیل

وعدے پہ نہ یاں آنا وعدہ نہ وفا کرنا
آنا تو الگ رھنا کرنا تو جفا کرنا
واعظ کی کیا مجال جو مستوں میں آسکے
یاں ھوش کا گزر نہ کسی ھوشیار کا

چکبست

بنتے ھیں انھیں کے لئے ہے کوثر و تسنیم
یاں جر رہ مولا میں لٹاتے ھیں زر و سیم

یاس

رهائی کا خیال خام ہے یاں کان بجتے ہیں
اسیرو بیٹھے کیا ہو گوش بر آواز ور ہوکر
ہوا کا دخل نہیں یاں وہاں ہوا کا عمل
قفس کی سست بنا ہے کہ آشیانے کی

بلیغ

تم گھر گئے یاں دل میں اٹھا درد قضا آئی
کیا پوچھتے ہو حال عدم کے سفری کا
عالم نزع میں اٹھوائے گئے ہم واں سے
ہائے کس وقت ہوا ہے در جانانہ جدا

حسرت

نکلا جو واں سے پھر نہ فراغت ہوئی نصیب
آسودگی کی جان تری انجمن میں ہے
ہوں دولت و حشمت پر ارباب ہوس نازاں
یاں بے سر و سامانی سامان محبت ہے

ضامن

اس کی جمعـــــہ کی کل غنیمت
واں ہوتی تھی زیب خوان نعمت

الف ندا کا اختلاط منادیٰ کے ساتھ

بقول شوق "اب غیر فصیح ٹھہرا ہوا ہے" تعجب ہے کہ مہتاب اور صنمخانہ میں یہ ترکیب کیوں فصیح سمجھی گئی- شوق کے یہ لفظ سنہ ۱۸۸۷ ع سے آج تک کئی بار چھپ چکے ہیں مگر فصحا اور شعرا نے دلا تو ترک کر دیا لیکن ساقیا- زاہدا وغیرہ اب تک برابر لکھہ رہے ہیں- یہ ترکیب مع خوشنا کے (جلال " خوشا نصیب اس

کے"- ایسی ترکیبیں بہت استعمال کرتے ھیں) وجوباً ترک کر دینا چاھئیے—

اور فع کے وزن پر یعنی اُر- آؤر کے بدلے	حضرت شوق لکھتے ھیں بعض فصحا واؤ نہیں گراتے- جناب عشرت کے رسالہ میں یہ لفظ نہیں آیا- قرار صاحب نے بھی اسے چھوڑ دیا ھے- نوراللغات میں اسے متروکات کی فہرست

میں شامل نہیں کیا گیا- راقم کی رائے ھے کہ غزل میں یہ لفظ غور کے وزن پر ھی استعمال کرنا بہتر ھے- داغ- جلال اور جلیل نے یہ لفظ بر وزن فع استعمال نہیں کیا- عزیز- سرور- شوق قدوائی- برق لکھنوی- وحشت- نظم- اور نادر کے ھاں کہیں کہیں آیا ھے*- غزل کے شاعروں نے خوب کیا کہ اسے ترک کر دیا—

چکھا- رکھا- لکھا- اٹھا	جناب شوق فرماتے ھیں دوسرے حرف کی تشدید کے ساتھ فصیح ھے تحتی نوٹ میں لکھتے ھیں "حتی الوسع بالتشدید

ھی استعمال کرنا چاھئیے مگر بضرورت بالتخفیف بھی بے تکلف استعمال کر سکتے ھیں کیونکہ تلک اور سدا کی طرح یہ متروک نہیں"- بارے† اصول نہیں تو اصول کی پرچھائیں ھی سہی کچھ تو پتا چلا- اس سے صاف ظاھر ھے کہ ضرورت کی شرط پر ان لفظوں کے استعمال یا ترک کا انحصار ھے- میں کہتا ھوں یہ ضرورت کی شرط اور متروکات سے وابستہ کیوں نہو- کیا وجہ ھے کہ تلک اور سدا ضرورت پر بے تکلف استعمال نہ کئے جائیں- جناب قرار کی فہرست میں حرف رکھا ھی ھے- راقم کا قول یہ ھے کہ غزل میں ان تینوں لفظوں کا ک تشدید بغیر آنا وجوباً متروک قرار دینا چاھئیے- میں نے ایک اور- چوتھا لفظ بھی لکھدیا ھے یعنی اٹھا- اس کے ماضی مطلق واحد کے صیغے میں ٹ پر وجوباً تشدید لانی چاھئیے

---

* امیر مرحوم نے صنمخانہ میں ایک جگہ ضرور استعمال کیا ھے—

دل جو دیں ان سے تو اے جان یہ گہرا پردا
اور روا رکھتے ھو پردے میں پھر آنا دل کا

† راقم "بارے" کو ترک کے قابل نہیں سمجھتا—

تاکہ امر کے واحد حاضر صیغہ اور اسی طرح فعل کے دوسرے صیغوں کا آپس میں التباس بالکل نرھے—

ذیل کے شعرا کا کلام دیکھکر جنکی فصیح بیانی کے سب قایل ھیں یہ شبہ ھوتا ھے کہ وہ بزرگ اِن "تارکان ادب" کے اجتہاد کو نہیں مانتے جس کا سبب غالباً انھیں کی نازک مزاجی ھوئی-جب ترک کی لئے بے حد بڑھی تو شاعروں نے ان "تارکان ادب" کو نظر انداز کردیا—

داغ

روزہ رکھیں نماز پڑھیں-حج ادا کریں
اللہ یہ ثواب بھی ھے کس عذاب ھے
لڑیں گے وہ حوروں سے فردوس میں
یہ فتنہ اٹھے گا قیامت کے بعد
لکھا ھے داغ نے اس کا یہ مصرعہ تاریخ
ھزاروں سال مبارک یہ جشن سالگرہ

امیر

ضبط کرتے ھی اثر نالوں کا ظاھر ھوگیا
بول اٹھے گھبرا کے ھے ھے لو وہ آخر ھوگیا
خط طویل یار کو میں نے لکھا مگر
مطلب کو دیکھئے تو کہیں کچھہ پتا نہیں

جلال

بے تمہارے یہ رھی شکل نشست و برخاست
بیٹھے دل ھوکے اٹھے درد جگر کی صورت
تقدیر کا لکھا اسے کہتا ھے نامہ بر
خط آے غیر کا مرے خط کے جواب میں

ریاض

ریاض اب کیا کریں اس شہر سے ہم قصد جانے کا
نصیبوں میں لکھا ھے خاک گورکھپور ھوجانا

جلیل

دل چیخ اٹھا خیال جو ابرو کا آگیا
خنجر لگا گیا کوئی خنجر لگا گیا
لکھا ھے شان میں اس کی جو مہر برج شاھی ھے
چھک جاے نہ کیوں اس بندۂ درگاہ کا سہرا

عزیز

پردہ اٹھا تو مرجع دل یہ جہاں تھا
شرمندگی ھوئی مجھے اپنی خمیر سے

مہاراجہ شاد

ھوا جو تاریخ کا میں خواھاں تو بول اٹھا شاد ھو کے شاداں

برھم

میں نے اے برھم لکھا ترتیب دیواں کا یہ سال

برق لکھنوی

مرغان چمن چھک اٹھو تم گلھاے چمن مہک اٹھو تم

جناب شوق لکھتے ھیں "ایک ی' گرانا اور بر وزن فعلن لیجیے-دیجیے بجاے لیجئے-دیجئے استعمال کرنا غیر فصیح تھرا ھوا ھے" نوراللغات شوق کا ھم زبان ھے-عشرت اور قرار کے ھاں اس کا ذکر نہیں-کیا وجوہ لاحق ھوے کہ فعل کی ان دو شکلوں میں سے ایک کو قطعاً متروک قرار دینے کی تھرائی ؟ پایا جاتا ھے کہ یہ لکھنؤ کے متروکات میں سے ھے-وھاں معاصرین کے کلام میں ایسے صیغے فعلن کے وزن پر نہیں آتے-ھاں دھلی میں یہ شکل اب تک مروج ھے—

داغ

وہ خریدار ہی دل کے نہ ہوے کیا کیجے
ہم بھی کچھہ دبتے کچھہ ان کو بھی دبایا جاتا
میرے ہی ہاتھہ سے مشکل مری آسان ہوگی
مجھکو دیجے جو نہیں آپ سے خنجر پھرتا

بیخود

ناپ لیجے اپنے گیسو کی درازی قد سے آپ
اب تو یہ فتنہ قیامت کے برابر ہوگیا

زکی

دلیل راہ اس نقش پا ہے سر فدا کیجے
طریق عشق میں یہ ارمغاں ہے پہلی منزل کا

راسخ

ہے توڑ یہ بھوک کا کہ سم کھا لیجے
ٹھوکر بھی لگے تو ہر قدم کھا لیجے

سایل

دونوں جملوں کو جمع کر لیجے
سن ہجری کی ہوگئی تکمیل

شاعر

سر شوریدہ میں وہ بات نہیں پہلی سی
اب تو وقت آگیا کیجے بھی سبکدوش مجھے

بتلانا دکھلانا وغیرہ

بتلانا دکھلانا وغیرہ بتانا دکھانا وغیرہ کی جگھہ استعمال کرنا دہلی کے متروکات میں سے معلوم ہوتا ہے۔ اس کی نسبت بھی راقم کی یہ راے ہے کہ اگر اس کا ترک واجب رکھا جاے تو

تو غزل تک محدود رهے—

امیر

سنتا هوں محتسب نے کیا میکدہ کو قرق

بٹھلا دیا یزید نے پہرا فرات پر

آنکھه دکھلاتے هیں وہ دیکھیں گے مجھکو بیتاب

یه نکالا هے نیا درد جگر کا تعویذ

جلال

وہ ٹھکانا تمہیں بتلادے جہاں رهتا هے

هوش میں اپنے زخود رفته کو جب لاؤ ابھی

چکبست

نه بتلائی کسی نے بھی حقیقت راز هستی کی

بتوں سے جاکے سر پھوڑا بہت دیر برهمن میں

عزیز

ایک حالت هو تو اس منظر کو دکھلائے کوئی

سیکڑوں دیکھے تماشے اے بلائے ناگہاں

سدا | سدا کے خلاف دهلی اور لکھنؤ نے غضب کی تلوار سوتی هوئی هے - حضرت اکبر مرحوم اور جناب جلیل کی جوانمردی توصیف کے قابل هے که انهوں نے اس غریب کو اچھوت نه مانا—

اکبر

صوائے سرمدی سے مست رهتا هوں سدا اکبر

مجھے نغموں سے کیا مطلب مجھے سرگم سے کیا مطلب

جلیل

جلیل سنگ حوادث کا کیا کریں شکوہ
ہمارے دل نے سدا چوٹ پر اُٹھائی چوٹ

یہ سوال نہایت اہم ہے کہ کیوں اس لفظ کو ترک کیا جائے - اگر یہ کہا جائے کہ صدا سے التباس نہو اس غرض سے اس غریب کو اردو کی برادری سے کان پکڑ کے نکال باہر کیا - تو میں کہوں گا کہ ہماری زبان میں بہت لفظ ایسے موجود ہیں جو ایک دوسرے سے ہم آہنگ ہیں اور وہ بے تکلف استعمال کئے جاتے ہیں - مگر حرف استثناء ہے - اور ایک دریائی جانور کا نام بھی ہے اور کسی سے سرگوشی کرنے کا امتیاز بھی رکھتا ہے - کیوں نہ اس لفظ کو صرف ایک معنی میں استعمال کیا جائے اور باقی دو میں ترک کر دیا جائے - ایک اور لغت صلوت ہے جو در بالکل متناقض معنوں میں استعمال ہوتا ہے بھاشا کے ایسے بہت لفظ اردو میں موجود ہیں جو سدا اور صدا سے بھی زیادہ متشابہ باہم ہیں - کہئے کہ تلفظ اور املا میں عربی یا فارسی الفاظ سے بالکل یکساں ہیں جیسے کالا - مالی - مور - بندر - در - وغیرہ کیوں بھاشا لفظ متروک قرار دیا جائے اور عربی فارسی کے نہیں - جنکے مترادف اردو میں موجود ہیں یہ دیکھکر نہایت تعجب ہوتا ہے کہ اُدھر تو ایک لفظ کو اس کے مقدس معنے سے ہٹا کر نہایت مکروہ معنی پہنائے جاتے ہیں اور ادھر ایک لفظ کو جس کا ہموزن ہم معنی میسر نہیں اس بنا پر ترک کیا جاتا ہے کہ اس کی آواز ایک اور لفظ کی آواز سے ملتی ہے - ہمیشہ - دایم - دایما مدام وغیرہ الفاظ رباعی ہیں بلکہ بعض ان میں خماسی بھی - جناب جلیل اور جناب اکبر نے بہت معقولیت سے کام لیا کہ انیس اور مومن کے استعمال کی تقلید کی - میں ان "تارکان ادب" سے دریافت کرنا چاہتا ہوں کہ کیا ان کا عندیہ یہ ہے کہ سے میں - کا - جیسے چند روابط - گنتی کے مصدروں - دس پانچ اسمائے ذات اور

دو چار صفات سوا باقی تمام اردو اور سودیشی لفظ زبان سے خارج کردئے جائیں اور ان کی جگہ عربی، فارسی، ترکی، مصری، عراقی وغیرہ الفاظ بھرتی کئے جائیں - ایسا ہے تو اس کا اعلان ہونا چاہئیے تاکہ کوئی دھوکے میں نہ رہے - جن لوگو نے ہندی اور اردو بنائی وہ ایک اور زبان بھی بنا سکتے ہیں - اساتذہ اور مشاہیر کے کلام کے اقتباسات سے واضح ہو سکتا ہے کہ اِن اکثر نام کے متروکات کی متروکی حیثیت کہاں تک اسم با مسمے کی شان رکھتی ہے - ان تارکان ادب نے یہ بھی کیا ہے کہ اگر ایک شاعر نے کوئی غلطی کی یعنی غلط استعمال کیا یا ایک استاد کے باب میں کہدیجیے کہ تصرت کیا تو اسے بھی متروکات میں شامل کر کے اپنی فہرست کی طولت میں اضافہ کردیا ہے- مثلاً حضرت عشرت خواجہ کے المضات کو بھی متروکات ذیل میں لے آئے ہیں- خواجہ مرحوم نے لا علمی سے یا بے خیالی میں المضات کو غلط باندہ دیا تھا —

زہر پر ہیز ہوگیا مجھہ کو-درد درماں سے المضات ہوا-

اسی طرح صاحب نوراللغات نے خواجہ مرحوم کی دوسری غلطی یا "تصرت استادانہ" یا شاعرانہ مجبوری کو جو "حلوۂ بیددو" کی شکل میں ظہور پذیر ہوئی تھی متروکات کی فہرست میں رکھہ دیا ہے-"سندیسا" کاذکر پہلے آچکا ہے-یہ واقعات طویل استدلال سے مستغنی کرکے یقین دلاتے ہیں کہ ان کی فہم نے "متروک" کی تعریف ہی متروک قرار دیتی ہے-غرابت مخالفت قیاس-لغوی-صنعف تالیف وغیرہ کے تحت میں جو ذمایم اور نقایص بیان کئے گئے ہیں ان سب کو متروکات میں گڈمڈ کردینا ایسا کرنے والوں کی علمی استعداد اور فن-کی واقفیت کی قلعی کھولتا ہے-متروک کی تعریف یہ قرار دیجاسکتی ہے —

متروک وہ لفظ یا ترکیب ہی جو ایک وقت ایک زبان میں بغیر کسی قید اور تخصیص کے مستعمل ہو لیکن پھر اس کا استعمال بالکل یا اس کے ایک مختص معنی میں ترک کردیا گیا اس اہم موضوع پر کسی نے تفصیل اور دلیلوں

کے ساتھہ بحث تو کی نہیں، ہاں کیا تو یہ کیا کہ اپنی زعم میں جن لفظوں یا صیغوں کو رکیک اور مذموم یا غلط سمجھا انہیں آنکھہ بند کرکے متروکات کی فہرست میں داخل کردیا- لکھنؤ والوں نے دھلی کی خصوصیات کو اور دھلی والوں نے لکھنؤ کے خصوصیات اور اغلاط کو متروکات کی مثل میں نتھی کردیا اور سب نے پنجاب کے خصوصیات کو متروکات قرار دے دیا- اردو کے متروکات اور متروک کی تعریف ہر ایک کے ذہن سے پرے پرے ہی رہی- اور یہ بھی ہوا کہ ایک جگہ کے مستقل متروک کی پروا اس شخص نے جو وہاں سے ادبی واسطہ نہیں رکھتا مطلق نہ کی- مثلاً آگے ذکر آچکا ہے کہ صاحب نوراللغات نے اپنی ہاں متروکات کی فہرست کو فضول طول دیا ہے لیکن اس پر بھی وہ فہرست مکمل نہیں- جاننا چاہئیے کہ دھلی کے فصحا میں "دکھنا" متروک اور غیر فصیح ہے وہ اس کے بدلے "دکھائی دینا" کہتے ہیں- اگرچہ میں اس ترک کے خلاف ہوں کیونکہ مجھے کوئی برہان ناطق نظر نہیں آتی کہ کیوں ایک چار حرت کا لفظ ترک کرکے اس کی جگہ نو حرت کا لفظ وجوباً استعمال کیا جائے- میرے ہاں یہ لفظ ایک جگہ آگیا تھا- احباب نے ٹوکا- میں نے کہا آپ سے نکلے تو نکالدیجئے- اس میں وہ سب قاصر رہے- آخر وہ اُسی طرح قایم رہا- یہاں جو یہ ذکر آگیا ہے تو میں ایک اصول کی بات بتانا چاہتا ہوں- ہم لوگ یعنی ہندوستان کے ہندو مسلمان خواہ کسی خطے اور حصے میں رہتے ہوں مذہبی عقیدت اور دینی احکام کی پابندی میں نہایت راسخ اور استوار ہونے کے باوجود تہذیب اخلاق کے باب میں نہ صرت یقین سے بلکہ عمل سے بھی ضعیف الاعتقاد اور ڈھلمل یقیں ہیں- "شبہ شنگا" شگون بد شگون، سعد و نحس وغیرہ ارکان دین کے ساتھہ ساتھہ ہمارے دلوں پر مسلط ہیں- نذر نیاز، بھینٹ چڑھاوا، سامنے سے چھینک پڑی ابھی مت جاؤ!- بلی راستہ کاٹ گئی کسی سے لڑائی ہوگی- اُس طاقچے کو جمعرات کے دن سہرا اور گھی کا دیا چڑھاؤ- اس پیپل کے پیڑ کو پورنماسی کی رات کو دودھ پلاؤ اور کلاوہ

پہناؤ- ''وہ پیرجی پرانے بخار کا تیر بہدف تعویذ دیتے ہیں''- ''سول سرجن ہوجائیں تو ضرور ان پیرجی کو بلائینگے''- ''وہ بھگت جی تلی کا حکمی جھاڑا کرتے ہیں''- کل مسہل ہولے تو جھڑوا لایا کرو''- مختصر یہ کہ جب افراد کے مزاج میں سودائیت غلبہ پا جاتی ہے تو نظام اعصابی ماؤف ہوکر ذکی الحس ہوجاتا ہے- یعنی ذرا سی سردی یا گرمی سے طبعیت بگڑ جاتی ہے- برائے نام تری یا خشکی کی زیادتی بیماری کی صورت پیدا کر دیتی ہے- خاص اسباب سے جو کیفیت افراد کی جسمانی صحت میں مریضانہ ذکی الحسی کی شکل میں صورت پذیر ہوتی ہے ویسی ہی کیفیت اِنسانوں میں من حیث الجماعت ذہنی صحت میں احساس کی مریضانہ شدت کی شکل میں صورت پذیر ہوجاتی ہے- جس کی آئینہ بردار اس کی زبان ہوا کرتی ہے- جنھوں نے علمی اصول پر زبانوں کی تحقیق کی ہے وہ ایک زبان کی ساخت' اس سے محاورں' کہاوتوں اور صنایع بدایع سے اس کے استعمال کرنیوالوں کے سیر اور تہذیب معاشرت کا مجسمہ تیار کر لیتے ہیں- جب کہ ہماری معاشری اور جماعتی حالت وہ ہے جس کی طرف ابھی اشارہ ہوا تو یہ امر لابد تھا کہ ہماری زبان شکوک اور واہمہ کی زیر مشق ہو- جبھی تو آپ دیکھتے ہیں کہ نقایص اور سقایم' عیوب اور ذمایم جتنے ہمارے ہاں بتائے جاتے ہیں اس قسم کے کسی اور زبان میں نہیں پائے جاتے- ایک ذم کا پہلو ہی ایسا جن ہمارے پیچھے پڑا ہوا ہے کہ شاید کوئی اس سے بچا ہوگا- جو بولو وہی لکھو نہیں تو فصاحت کی ٹکسال سے باہر- یہ کانوں کو بھلا نہیں معلوم ہوتا' وہ لفظ اِب تک کسی نے استعمال نہیں کیا یہ روز مرہ کے خلاف' وہ محاورہ کی سند کا محتاج' وغیرہ وغیرہ- ان سب باتوں پر طرہ یہ کہ لے دے کے تین حروف علت تو ہماری زبان کی پونجی مگر وہ بھی منھ کھول کر اپنا نام نہیں بتانے پاتے- کوئی کہتا ہے فارسی الفاظ کا الف گرانا جایز نہیں- کوئی حکم لگاتا ہے الف' واؤ' ی' کسی کا بھی تقطیع سے ساقط ہونا جایز نہیں- کوئی یہ فتوی

دیتا ھے کہ واؤ اور ی کا مضایقہ نہیں لیکن الف سالم الصوت اور تقطیع کے اندر رھنا چاھئے- یہ شاید اس ادب کے پاس سے کہ رام اور خدا میں یہ حرف آیا ھے-اور یہ کسی کی سمجھہ میں نہ آیا کہ اردو نظم میں آخر ایسی کیا بات ھے کہ اس غریب تثلیث کی گوشمالی ناگزیر ھے * —

عرصہ | ایک صاحب فرماتے ھیں "عرصہ بمعنی مدت آج کل زبانوں پر بہت جاری ھے-مگر احتیاط لازم ھے کیونکہ عرصہ بمعنی میدان ھے"-محض یہ واقعہ کہ یہ لفظ آج کل اس معنی میں زبانوں پر بہت جاری ھے اس ترک کے خلاف بیٹھتا ھے-پھر ھرج کیا ھے اگر دونوں معنوں میں استعمال کیا جائے- لیکن لکھنے والے نے یہ غلط کہا کہ عرصہ بمعنی مدت آج کل زبانوں پر بہت جاری ھے- ھم تو شاھنشاہ اورنگ زیب کے وقت سے اس لفظ کو اس معنی میں سن رھے ھیں- نعمت خان عالی وقایع اول میں فرماگئے ھیں :-

یکے بشرط کہ فردا ست کوچ تا دھلی   تواں بہ عرصۂ چل روز یا دو ماہ رسید

عادی - مشکور | یہ بھی ھو رھا ھے کہ عرصہ کی طرح فارسی عربی کے وہ الفاظ جو ابتدا سے ابتک ایک خاص معنی میں مستعمل تھے،اب ترک کئے جارھے ھیں- وہ لوگ یہ بھولتے ھیں کہ ایک لفظ کے لغوی معنی کے علاوہ اور معنی بھی ھوا کرتے ھیں اور کہ کلام کی عقلی حقیقت یا عقلی مجاز متکلم کے عندیہ اوراعتقاد پر منحصر ھے- جب عادی اور مشکور مدتوں سے عادت گیرندہ اور احسان مند کے معنی میں استعمال ھو رھے ھیں اور متکلم اور سامع دونوں کا ذھن انھیں معنوں کی طرف جاتا ھے تو اب قاموس اور صراح سے فتویٰ لیکر ان الفاظ کو اردو سے خارج کرنے میں کیا مصلحت ھے- میں کہتا ھوں کہ گلاب کی مانند ان کو بھی مہند کیوں نہ مانا جائے- جس طرح گُلاب سے گُلابی بنالیتے ھیں

---

* یہ موضوع اتنا تفصیل طلب ھے کہ اس سے یہاں بحث نہیں ھوسکتی اس لئے کسی آیندہ وقت پر ملتوی رکھا جاتا ھے—

اسی طرح مشکور سے مشکوری بنا لیا تو کیا ہرج ہوگیا۔ معنی یا املا اور ہجا کی تبدیلی کے ساتھہ بے شمار الفاظ مفرس اور معرب ہوگئے ہیں۔ ذکی مرحوم فارسی عربی میں مسلمہ قابلیت رکھتے تھے اور مرزا غالب کے ارشد تلامذہ میں تھے انھوں نے مشکور استعمال کیا ہے۔ فرماتے ہیں:-

ہوئی تقدیم احساں احسن تقویم سے ثابت
نہو مشکور پھر کیوں بندہ لطف کبریائی کا

جناب ضامن کنتوری "گلزار نسیم اور تنقید نقاد" والے معنوں میں مشکور لکھتے ہیں—

عادی ہر اہل زبان کی زبان پر ہے۔ حضرت جلال نے اس بنا پر اس لفظ کو اردو سے خارج کیا تھا کہ اس کا وجود اردو کے ثقات شعرا کے کلام میں پایا نہیں جاتا۔ حکیم صاحب اگر نواب مرزا لکھنؤی کو ثقات شعرا میں نہیں سمجھتے تھے جو کہہ گئے ہیں—

ہم تو دشمن ہیں جعل سازی کے
آپ عادی ہیں رندی بازی کے

تو خواجہ وزیر لکھنؤی تو یقیناً ان ثقات حضرات کے حلقے کے ایک اعلیٰ رکن ہیں۔ فرماتے ہیں'

تیغ ابرو کی زباں عادی ہوئی
بات سیدھی بھی جو کی ٹیڑھی ہوئی

اسی پر اور الفاظ کے ترک کے اسباب اور علل کو قیاس فرما لیجئے—

اضافتیں یہ قرار دیا گیا ہے کہ تین مسلسل اضافتوں سے زیادہ کلام میں لانا ممنوع ہے۔ لیکن اس کی پابندی کم ہوتی ہے۔ حضرت ریاض ایک جگہہ چار اضافتیں لکھہ گئے ہیں۔ فرماتے ہیں:—

رہ گئے ہم گرد پس کارواں   نقش کف راہروان سخن

خاک سر آب روان سخن　　　نقش کف پا بھی نہیں نقش آب

دیکھئے چھوٹی بحر کے ان مصرعوں میں بارہ اضافتیں آئی ہیں —

اضافت وہیں تو لا بد لانی پڑتی ہے جہاں تشبیہ اور استعارہ سے کام لیا جاے اور ان صنعتوں میں ہندی اردو سے کہیں بڑھی ہوئی ہے۔ہندی والے کس طرح اضافت کے بغیر ان کا نباہ کرتے ہیں؟ اس کے علاوہ فارسی میں اضافتوں کی اتنی بھر مار کیوں نہیں ہوتی۔خواجہ حافظ اور نظیری کی غزلیں پڑھئے اضافت کی وہ بہتات ان کی ہاں ہرگز نہیں جو اردو میں مرزا غالب اور اقبال کے ہاں پائی جاتی ہے۔بلکہ خود مرزا صاحب کی فارسی کلام میں اضافتوں کا وہ ہجوم نہیں جو ان کی اردو کلام میں موجود ہے۔یہ ضرور ہے کہ جب آپ نے دو تین کے سوا باقی تمام حروف تشبیہ متروک قرار دیدے * جیسے آسا، ساں، نمط۔ صفت، رنگ وغیرہ تو پھر تشبیہ اور استعارہ کا بناہ ناممکن کے قریب ہوجاے گا۔ان سب امور کو نظر میں رکھہ کر راقم کی راے ہے کہ نثر میں اضافت وجوباً متروک قرار دی جاے اور نظم میں دو سے زیادہ اضافتیں نہ لائی جائیں۔نظم میں غزل بھی داخل ہے۔لیکن غزل گو شعرا سے میں یہ کہوں گا کہ اگر یہ درست ہے کہ غزل میں معشوق سے بات چیت کی جاتی ہے اور وہ معشوق اناث کی جنس کا ایک فرد ہے۔فعل خواہ کسی صیغہ میں لایا جاے۔تو انسب ہے کہ ایسی غزل کو اضافت سے معرا رکھا جاے۔کیوں کہ عورتیں اضافت نہیں بولتیں۔ریختی کے دیوانوں میں اضافت کا نشان کہیں نہ ملے گا غزل کا معشوق اسی زبان میں بات سننا پسند کرے گا۔جو وہ خود بولتا ہے —

نون | نون کے عنہ رکھنے یا اس کے اعلان کا قاعدہ بھی کلیہ کی حیثت نہیں رکھتا۔یہ تو مانا کہ اضافت کے بعد اس کا اعلان ناجایز ہے، لیکن اضافت

---

* اس بات میں راقم کا کلی اتفاق ادب کے تارکوں کے ساتھ نہیں ہے —

کے بغیر اس کے اعلان یا غنہ ہونے کے متعلق کوئی التزام نہیں رکھا گیا-بس یہی کہدیا ہے کہ بلا اضافت نون کا اعلان ہونا چاہئیے مگر جن الفاظ کا نون روز مرے میں غنہ بولا جاتا ہے اس کا اعلان مکروہ ہے-ان الفاظ کی مکمل فہرست چاہئیے تھی—

مت | بعض ہندو فرقوں میں عورتوں اور ملک کے ایک خاص حصے میں اس لفظ کا جا وبیجا استعمال دیکھہ کر یہ حکم لگا دیا کہ مت نفی کے معنی میں متروک ہے-راقم بھی اس معنی میں اس کے ترک کا حامی ہے لیکن فعل نہی حاضر کے صیغہ کےاستثنا کے ساتھہ اِس موقع پر مت کے بغیر نہی کی تاکید آدھی بھی نہیں رہتی—

اب میں اس قسم کی بحث کو بالفعل بند کر کے عرض کرنا چاہتا ہوں کہ ابتک کوئی اصول اور قاعدہ الفاظ اور ترکیبوں کے ترک کرنے کا اردو میں وضع نہیں کیا گیا ہے - راقم کے نزدیک ایک لفظ یا مرکب کو متروک اعلان کرنے سے پہلے ان اصولوں کا لحاظ رکھنا چاہئیے—

(ا) جو لفظ کریہہ الصوت ہو یا ثقیل التلفظ جب کہ اس کا مترادف موجود ہو—

(ب) جس میں بذاتہ یا دوسرے الفاظ کے ساتھہ ملکر ذم کا پہلو نکلتا ہو—

(ج) علاوہ ان نقایص کے جو غرابت اور مخالفت قیاس لغوی کے تحت میں آتے ہیں ایسے الفاظ اور ترکیبیں جنکو پوری طور پر سمجھنے کے لئے عربی یا فارسی لغات دیکھنے ضرورت پڑے - یعنی اردو کو عربیرانی نہ بنایا جائے (عرب اور ایران کی زباں سے ماخوذ) —

(د) جو الفاظ سلاست ، فصاحت اور ترنم کے منافی ہوں اور اردو کی شخصیت کے قیام میں حارج ہوں—

انھیں تجرجه تعمیه هو سکتا هے - اصل مین ایسے اصول قایم کرنا کسی ایک انسان کا کام هے هی نہیں - انجمن ترقی اردو کا فرض هے که وہ ایک جامع اجلاس کسی مرکزی مقام پر منعقد کرنے کا انصرام کرے - جہاں ملک کے هر حصے کے ادیب اور منصف جمع هوں اور اس معامله اور زبان کے متعلق دوسرے امور کا فیصله پوری بحث مباحثه کے بعد هوکر قرارداد قایم کئے جائیں - راقم کے ذهن میں چند الفاظ اور باتیں ایسی هین جنهین ترک کردینا چاهئے مگر میرے متروکات دوقسم کے هیں لفظی اور معنوی - لفظی متروکات کا ذکر هر شخص کرتا هے اور انهیں سے اس مضمون میں ابتک بحث کی گئی هے - مناسب بلکه ضروری هے که متروکات کے دفتر میں معنوی متروکات کی جدا مثل ترتیب دیجائے —

معنوی متروکات

معنوی متروکات | میری راے میں امور ذیل کا (التزام) بطور معنوی متروکات کے هونا چاهئے —

(۱) خط عارض یا معشوق کی داڑھی مونچھه کا تذکرہ قطعاً ترک کردینا چاهئے - مشاهیر میں حضرت جلیل تک اس کا وجود پایا جاتا هے - تاج سخن میں لکھا هے —

نمود سبزۂ رخ پر سکوت ان کو هوا
یه خط وہ آیا هے جس کا کوی جواب نہیں

امید کی جاتی هے که غزلگو حضرات عاج کی یه تجویز بلا چوں چرا منظور فرمائنگے —

(۲) معشوق کی کم سنی —

وہ کم سنی میں کھیل بھی کھیلیں گے تو یہی
مٹی کے تیغ و ناوک و خنجر بنائیں گے

ابھی سن ھی کیا ھے جو بیباکیاں ھوں
انہیں آئیں گی شوخیاں آتے آتے
سہمے جاتے ھیں ڈرے جاتے ھیں وہ عاشق سے
کمسنی ھے ابھی اس سن میں جھجک ھوتی ھے

جلیل

وہ کمسنی کے سبب واقف عتاب نہیں
دم سحر ھے ابھی گرم آفتاب نہیں

غزل کی یہ بیہودگی شرافت اور صالح مذاق کے اسقدر منافی ھے کہ ایراد و تعریض کی محتاج نہیں - اس اخلاقی جرم سے بچنا چاھئے —

۳ - معشوق کا روٹھنا سر آنکھوں پر - مگر گالیاں دینا اور کوسنا، سوقیت اور رکاکت کی خبر لاتا ھے - اس لئے ناشایستہ حرکت سے اُسے وجوباً باز رکھنا چاھئے -

۴ - قصابی مضمون - یہ نام میں ایسے مضامین کو دیتا ھوں :-

نہ سوچے ھم کہ تہہ تیغ ھوگی خلق اللہ
گھٹا نہ حوصلہ قاتل کے دل بڑھانے کا

معشوق نہ ھوا کسی شہر کے سلاخ کا میر قصاب ھوا :—

لگائیں لاش پہ تلواریں اس نے مقتل میں
جو میرے بعد بھی آیا مرا ھی وار آیا

امیر

اتر کر اس نے مقتل میں جو کھینچا میاں سے خنجر
قضا میداں سے بھاگی بیٹھ کر قاتل کے توسن پر

مہتاب داغ میں ۸۸ جگہ اس قسم کے قصابی مضمون آے ھیں - اس قبیل کے مضامین میں سب سے بڑی قباحت یہ ھے کہ معشوق کی جنسیت کے متعلق سامع کا ذھن ایک خاص جانب منتقل ھوتا ھے اور شاعر کے مذاق کو مذموم

ٹھراتا ھے۔ ستمگر اور ظالم کے ساتھہ سفاک اور قاتل معشوقوں کے ناموں میں رھنے دیجئے، مگر یہ قتل اور سفاکی، بوندی کی کٹاری، سروی کی تلوار اور اصفہانی شمشیر سے نہیں ھوتی۔اس کے لئے قدرت نے اُن کو اور ھتیاروں سے مسلح کیا ھے، جیسے تیغ ادا، تیر نظر، شمشیر تغافل، سنان مژگاں۔قدرت کی کارپردازی آپ کی اصلاح اور ترقی سے مستغنی ھے، یہ ھتیار آپ کے تیغ اور تیر سے زیادہ کاری ھیں اور معشوق کی جنسیت بھی قائم رھتی ھے —

۵-وصل-اس مضمون کے اشعار میں ایسی بد مذاقی اور عریاں نویسی سے کام لیا جاتا ھے کہ کوئی شاعر سینہ پر ھاتھہ مار کر یہ نہیں کہہ سکتا کہ میں اپنی غزلیں اپنی ماں اور باپ اور بہن کے سامنے پڑھا کرتا ھوں۔معشوق کا عاشق کے ساتھہ تلوار بیچ میں رکھکر سونا، خلخال پائے دوست کی جھنکار، منھہ اور زبان کے مضامین، اور زیادہ کیا لکھوں۔بھلا ان باتوں میں شاعری کا کونسا کمال اور ادب کا کونسا معجزہ دکھایا جاتا ھے۔راقم کی ناقص رائے میں اس قسم کے مضامیں اور وصل کا یہ مفہوم یک قلم متروک قرار ھونا چاھئے۔ وصل کا اطلاق خلوت صحیحہ پر کرنا وجوباً متروک ھونا چاھئے اور اسکا مفہوم صرف اور مخفی عاشق معشوق کا ایک جگہ بیٹھنا جیسے دو پیارے دوست بیٹھتے ھیں۔شکوہ شکایت اور پیار محبت کی میٹھی میٹھی باتیں، باغ میں ساتھہ پھرنا وغیرہ وغیرہ ھونا چاھئے۔سونا، پلنگ اور شبستاں یا خواب گاہ میں معشوق سے تخلیہ کرنا وجوباً متروک ھوجانا چاھئے —

۶-جوبن کی نسبت یہ ضرور کہا گیا ھے کہ اس کا اطلاق شباب کی عام کیفیت تک محدود ھونا چاھئے، زنانہ سینے کی ایک خاص کیفیت پر نہیں۔لیکن اسپر کاربند کوئی نہیں ھوتا۔تذکرہ نویسوں اور رسالہ والوں کو چاھئے کہ ایسے شعر قلمزد کر دیا کریں۔اپنے شاگردوں کی غزل بناتے وقت استادوں کو بھی اسکا اور نیز دوسرے امور کا خیال چاھئے، جن کا ذکر اس ذیل میں آیا ھے

ہے-مختصر یہ کہ معشوق کا سر اور گردن، ہاتھ کو کہنی تک-پاؤں ٹخنے تک، شاعری کی ملکیت ہونی چاہئیے-کمر کو وحدۂ لاشریک کی مصداق پر مانکر اس کی نازکی کا تذکرہ کر سکتے ہیں-جسم کے باقی حصوں اور عضووں سے لادعوی ہو جانا چاہئیے—

۷-معشوق کا لباس-معشوق کی کج کلاہی اور ایک پیچہ وغیرہ تو اب لوگ بھول گئے ہیں اور زیادہ توجہ زنانہ لباس کی جانب ہے-لیکن اکثر یہ ہوتا ہے کہ اپنی من مانتے کپڑے پہناتے ہوئے شاعر غریب معشوق کو ننگا کر دیتے ہیں عریاں نویسی کا یہ دوسرا قبیح اور مذموم پہلو ہے-جب یہ تسلیم ہوچکا کہ معشوق ہمیشہ اناث کی جنس سے ہے تو اس باب میں اور بھی احتیاط درکار ہے-لوگ پوشاک کا ذکر کرتے کرتے جسم کے ان حصوں کا بھی صراحتاً یا کنایتاً ذکر کر جاتے ہیں جن کو اس پوشاک میں مستور رہنا چاہئیے-نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ کلام بالکل ننگا ہو جاتا ہے-دوپٹہ یا آنچل اس تذکرہ میں کافی ہے-یہ ساڑھی پہننے والوں اور دوسری قسم کی پوشاک والوں سب پر عاید ہوسکتا ہے-کیونکہ ہندوستان کی ہر زنانی پوشاک میں آنچل کا وجود ثابت ہے-دامن اور زیریں لباس کے گھیر کا بھی مضایقہ نہیں-یہ ایسی چیزیں ہیں جو کسی خاص فرقہ یا ملک کے حصہ سے مختص نہیں-پوشاک کی باقی چیزوں کا ذکر وجوباً متروک ہونا چاہئیے—

۸-غزل میں ایک اور انوکھا سوانگ بھرا جاتا ہے-شاعر اپنے آپ کو پرند بنا کر صیاد کے جال میں پھنساتا ہے وہاں سے پنجرے میں منتقل کیا جاتا ہے جہاں میاں مٹھو بنا چڑیمار کو کوسا کرتا ہے-کبھی "دشت جنوں" میں تنکے چننا بھول کر جو اس کا منصبی فرض تھا سچ مچ کے تنکے چننے لگتا ہے اس سے اپنا گھونسلا بناتا ہے-وہ تو خیریت گزری کہ اس نشیمن کو بجلی نے فنا کر دیا ورنہ عجب نہ تھا کہ انڈوں بچوں کی نوبت آ جاتی-فہم قاصر ہے

که اُن مضمونوں میں عاشقی اور شاعری کی کونسی شان اور نازک خیالی مضمر ہے۔ بلبل اگر پھول کی شیدا ہے تو ہو، آپ کو خدا نے انسان پیدا کیا ہے انسانیت کی باتیں کیجئے —

۹ - دل کی تجارت - ہمارے شعری عاشق دل کے معاملے میں بھی بد نظمی سے کام لیتے ہیں - دل دینے میں ایسی جھک جھک اور تکرار ہوتی ہے کہ چھٹ بھیا دکانداروں سے سودا کرنا بھول جاتا ہے - گلی کوچوں کا وہ نظارہ آپ کی آنکھوں کے سامنے ہوگا جب پھیری والا سرمہ، مسی، فیتے اور چوڑیاں بیچنے آتا ہے یا ایک جہانیاں جہاں گشت "زری گوٹا پرانا" کی آواز لگاتا ہے - اکثر عورتیں اُن سے لین دین کرتی ہیں، دام چکانے میں پیسے پیسے پر وہ تکرار ہوتی ہے کہ الہی امان! یہی گت ان زبانی عاشقوں نے جو اننس جذبات اور لطیف حسیات کے لئے مردہ ہیں دل جیسی چیز کی بنا رکھی ہے۔ متاخرین تو لکھتے ہی تھے :—

غالب

کہتے ہیں نہ دیں گے ہم دل اگر پڑا پایا
دل کہاں کہ گم کیجے اس سے مدعا پایا

دل نہ ہوا کسی کی اچکن کا ٹوٹا ہوا بٹن ہوا کہ اس طرح پڑا مل جائے۔ اُستاد ذوق نے اس پر ترقی کی —

ذوق

مال جب اس نے بہت رد و بدل میں مارا
ہم نے دل اپنا اُٹھا اپنی بغل میں مارا

"ہم" نہ ہوئے ٹٹ پونجئے پھیری والے ہوئے کہ ایک گاہک سے سودا نہ بنا تو اپنا بقچہ باندھکر چلتے بنے اور آگے جاکر "سرمہ، مسی" پکارنے لگے داغ اور امیر کے ہاں بھی دل کا سودا ہوا ہے۔ جلال فرماتے ہیں :—

جلال

جلد دل کا فیصلہ کچھ ہو چکے لے چکو سودا یہ جتنے کو چکے

کبھی عاشق آرزو بیٹھتا ہے کہ ایک بوسہ دو تو دل دوں-یہ باتیں نہایت رکیک ہیں، ان میں ابتذال کی پھٹکار ہے-دل بھی کوئی بیع و شرا کی جنس ہے-وہ جب کسی پر آتا ہے تو کسی کی اجازت سے نہیں آتا، اپنے آپ آتا ہے اور کسی کے روکے نہیں رکتا-قوت ارادی کا اس میں دخل نہیں، عاشق بیپاری نہیں ہوا کرتے-دیکھئے اللہ بخشے میر تقی کس خوش اسلوبی سے دل کے ہاتھہ سے جانے کا نقشہ اُتار گئے ہیں-شاعر پر اگر یہ روحانی کیفیت کبھی طاری نہیں ہوئی تو اس کا بیان ہی کیا ضرور ہے اور پھر آپ بیتی نہیں کہہ سکتا تو جگ بیتی ہی کہے-لیکن عشق کے مسلک کو پینٹھہ اور نخاس تو نہ بنا دے—

میر

• پڑ گئی اُس پہ اک نظر اِس کی پھر نہ آئی اسے خبر اس کی
تھی نظر یا کہ جی کی آفت تھی وہ نظر ہی وداع طاقت تھی
ہوش جاتا رہا نگاہ کے ساتھہ صبر رخصت ہوا اک آہ کے ساتھہ
بیقراری نے کج ادائی کی تاب و طاقت نے بے وفائی کی

یہ چند معنوی متروکات ہیں جن کی طرف شاعروں اور ادیبوں کی توجہ دلائی جاتی ہے-اس قبیل سے اور بہت سے امور احتراز کے قابل ہیں جن کا بیان طوالت کے خوف سے اس وقت ملتوی رکھا جاتا ہے—

لفظی متروکات

۱-نثر میں اضافت کا استعمال قطعاً ترک کیا جائے-اصطلاحیں، محاورے اور لفظوں کے مقررہ جگ مستثنیٰ ہیں جیسے علت غائی، نام خدا، گوشت خر دندان سگ وغیرہ—

۲- واؤ عاطفه کے ساتھه بهی اضافت کا سلوک کرنا چاهئیے—

۳- تا به ابد- تا، بمعنی تک اور جب تک، تا چند وغیرہ فارسی روابط سے احتراز لازم هے- یه اُصول قرار پانا چاهئیے که فارسی روابط اور مرکبات جهاں تک هو سکے اُردو میں کم ملائے جائیں—

۴- نظم میں اضافت- غزل میں قطعاً متروک سمجھی جائے- نیچرل نظموں میں دو سے زیادہ اضافتیں ایک ساتھه نه لائی جائیں- اس کے متعلق آگے مفصل مذکور آ چکا هے—

۵- نظم میں واؤ عاطفه ایک دفعه سے زیادہ مسلسل نه آئے- کبھی ایسا بهی دیکھنے میں آیا هے که پورے مصرعے کے تمام الفاظ تسلسل کے ساتھه معطوف معطوف علیه واقع هوئے- اس اسلوب سے مصرعے کا مصرعه فارسی هو جاتا هے—

آخر میں یه عرض کرنا هے که یه مضمون اجتهاد کے طریق پر نهیں بلکه استشهاد کے طور پر لکھا گیا هے- راقم ممنون هو گا اگر فن کے واقفوں، ادیبوں اور نظم، نثر کے لکھنے والوں نے اس طرف توجه فرمائی- یه نه سمجھنا چاهئیے که متروکات کے باب میں راقم کا یه مذهب هے:—

سر برهنه نیستم دارم کلاہ چار ترک

ترک دنیا، ترک عقبیٰ، ترک مولا، ترک ترک

میں ادب اور زبان کے معاملوں میں ”برچھیگردی“ کے سخت خلاف هوں جس کا ثبوت خود میرا کلام هے- هاں زیادت جیسی کلام کا سقم هے ویسی هی فن کے قواعد کی توضیع کا- میں دیکھتا هوں که ایک فریق ایک امر میں ایک حد پر جاتا هے تو دوسرا دوسری حد پر- یه بازگشتی حرکت قدرت کے قانون کا خاصه هے- شاید اسی نهج پر جناب عزیز نے ایک صدی کے مردہ لفظ کو پھر زندہ کرنے کا خیال کیا- فرمایا هے:—

هر داغ دل هے گویا تاریخ میرے تن میں
جلوے هیں رفتگاں کے پیدا اسی چمن میں

عربی کا ایک مشہور قول هے ''یجوزللشاعر مالا یجوزلغیرہ'' یعنی جو دوسروں کو جایز نہیں وہ شاعر کو جایز هے-اس جواز کا جایز استعمال مفقود هے-اگر عریاں نویسی، ابتذال نگاری، با سلیقہ سرقہ اور زبان سے اخلاقی جرایم کا ارتکاب اس قول کا مفہوم هے تو میں خاموش هو جاؤں گا- ورنہ اتنا ضرور کہوں گا کہ اگر اس کا مفہوم انشا اور اسلوب سے علاقہ رکھتا هے تو یہ ماننا پڑے گا کہ جتنی قیدیں نظم کہنے والوں پر عاید کی گئی هیں وہ سراسر جابرانہ اور نا جایز هیں اور اُس قول کے بالکل منافی-نہ اس سے زبان کی ترقی هو گی نہ تخیل شاعرانہ کی توسیع، ایسی کا جو بھو جو زبان جو همارے نقاد اور غیر مصنف ادیب بنانا چاهتے هیں سرسبز نہیں هو سکتی- همارا دستورالعمل یہ هونا چاهئے ع: مصلحت بین و کار آساں کن-ورنہ خوف هے کہ اگر اس خرج یخرج اور ترک یترک کی لے یونہیں بڑھتی گئی تو کہیں مرزا غالب کا یہ قول همارے حال کی مصداق نہ هو جاے —

مشکلیں مجھہ پر پڑیں اتنی کہ آساں هو گئیں

تیتری

(رقص و سکون کی دونوں حالتوں میں)

از

(حضرت ابوالمعانی اختر شیرانی الافغانی سلمہ)

یہ تیتری ہے یا کوئی رنگ پریدہ ہے؟ بوے چکیدہ ہے؟
آغوش گل میں یا کوئی نقش دمیدہ ہے؟ عکس کشیدہ ہے؟
اُٹھے تو ایک بوسۂ رقصیدہ سامنے! پاشیدہ سامنے!
بیٹھے تو ایک لذت خوابیدہ سامنے! دامن کشیدہ ہے!

موج ہوا میں ہلکا سا طوفان رنگ و بو! ہیجان رنگ و بو!
اوج فضا میں چھوٹا سا نیسان رنگ و بو! جو صف کشیدہ ہے!
اک عکس ہے جما ہوا رنگیں غبار کا؟ کیف و خمار کا؟
یا شاخسار گل پہ عروس بہار کا! حسن رمیدہ ہے؟

ہلکی سی اک شعاع ہے طور کلیم پر، اوج نسیم پر!
رقاصۂ بسنت کا فرش شمیم پر، رقص پریدہ ہے!
موج شراب کی اسے اک تھرتھری کہوں؟ ننھی پری کہوں؟
یا موسم بہار کی اک تیتری کہوں؟ جو آرمیدہ ہے!!

ادبی بات چیت

۱ - فرانس

از

(جناب شاهد سهروردی صاحب)

مسٹر شاهد سهروردی هندوستان کے اُن چند نوجوانوں میں سے هیں جو اپنی بعض خصوصیات کی وجه سے نهایت قابل قدر هیں اور جو باوجود هندی هونے کے، اپنے وطن سے دور، یورپ کے ممالک میں محض اپنی قابلیت کی وجه سے عزت کی نگاه سے دیکھے جاتے هیں - فنون لطیفه اور ادب میں اُن کا ذوق نهایت پاکیزه هے - زبانوں کی تحصیل کا خاص ملکه هے - یورپ کی جتنی بڑی بڑی زبانیں هیں وه سب جانتے هیں اور صرف جانتے هی نهیں بلکه اس خوش اسلوبی سے بولتے اور لکھتے هیں اور اُن کے ایسے اچھے ادیب هیں که اهل زبان بھی قائل هیں - اُنھوں نے میری درخواست پر اُردو کے اس نمبر کے لئے یه مضمون لکھ کر بھیجا هے - میری درخواست یه تھی که جنگ کے بعد یورپ کے ممالک میں ادبیات میں کیا انقلاب هوا، آج کل ادب کا رنگ کیا هے، کونسی ادبی تحریکات رواج پذیر هیں اور عام میلان کس طرف هے - مسٹر شاهد نے یه مضمون فرانس پر

لکھا ھے اور آج کل کے ادبی رنگ پر بحث کی ھے - دوسرا مضمون وہ جرمنی پر لکھنے والے ھیں - میری درخواست پر وہ یہ مضامین بہت صاف اور سلیس لکھیں گے جیسے کوئی کسی کو خط لکھتا ھے —

اصل مضمون انگریزی میں تھا - ترجمہ ھمارے دوست پروفیسر وھاج الدین (اورنگ آباد کالج) نے کیا ھے اور خوب کیا ھے (اڈیٹر) —

اگر ھم موجودہ زمانے کے ان رسالوں پر جو کتابوں سے بحث کرتے ھیں ایک سرسری نظر ڈالیں تو ھمیں ان میں ایک چیز خاص طور پر تعجب خیز نظر آے گی اور وہ یہ کہ گزشتہ جنگ عظیم کے بعد سے ھر ملک کے مصنفین ایسے واقعات پر قلم اُٹھانے لگے ھیں جو عام طور پر افسانوں کے دائرے سے باھر ھیں اور ان پر جو بحثیں ھوتی ھیں وہ ایک عجیب دلچسپ اور مخصوص انداز میں ھوتی ھیں - اب کوشش یہ ھوتی ھے کہ ان مباحث کو جو پہلے صرف ہمارے مورخین، ماھرین حیاتیات اور منجمین کی بے مزہ اور صبر آزما کاوشوں کے لئے مخصوص سمجھے جاتے تھے، عام لوگوں کے سامنے بھی دلچسپ بنا کر پیش کیا جاے اور یہ اسی کوشش کا نتیجہ ھے کہ تحریروں اور تصنیفوں میں ایک جان سی پڑ گئی ھے - اس میں شک نہیں کہ اس عمل کا آغاز جنگ سے پہلے ھو چکا تھا، چنانچہ ھم میں سے اکثر اشخاص ایسے ھوں گے جن کے دلوں میں فابر (Fabre) کی یاد اب تک موجود ھوگی - یہی وہ مصنف تھا جس نے حشرات الارض کی سوانح حیات کا مطالعہ انسانی نقطۂ نظر سے کیا، ھماری اور ان کی مختلف فعلیتوں میں ایک خاص مطابقت ڈھونڈھ نکالی اور دنیا پر یہ حقیقت ثابت کر دی کہ اختلاف اجزا کے باوجود کل کائنات ایک ھی

رشتۂ وحدت میں منسلک ہے، فابر کی طرح ایک اور مصنف فلے ماریں (Flammarion) تھا، اس کے انتقال کو ابھی کچھہ زیادہ عرصہ نہیں ہوا، اس سن رسیدہ منجم نے ستاروں کی دنیا کے بھید کچھہ ایسے دلچسپ اور مانوس انداز میں بیان کئے کہ پڑھنے والوں کے دلوں پر مصطلحات اور اصطلاحی جملوں کی جو دہشت بیٹھی ہوئی تھی وہ نکل گئی اور یہی وہ چیزیں ہیں جن سے ہول کھا کر عام لوگ علوم طبیعی کی حدود کی طرف جاتے ہوے ہچکچاتے ہیں —

اس میں شک نہیں کہ فابر اور فلے ماریں جنگ سے پہلے کے مصنفین ہیں لیکن یہ لوگ ادیب نہیں بلکہ سائنس داں تھے - ان کی کوشش یہ رہتی تھی کہ اپنے مخصوص مباحث کے اشکال کو کم کر کے انھیں عام پڑھنے والوں کی ذہنی سطح پر لے آئیں - ہمارے زمانے کے مصنف ان کی طرح ماہر خصوصی نہیں ہیں - وہ صرف اہل فن ہیں اور ان کی یہ آرزو رہا کرتی ہے کہ اپنے قلم کی ایک ہلکی سی جنبش سے اس علمی مواد میں جان ڈال دیں جو مدرسوں میں بچوں کو پڑھایا جاتا ہے اور محض اس وجہ سے کہ درس میں داخل ہے ہمارے لئے مردہ ہے اور ہماری حیات اور تخیل پر اس کا اثر کچھہ زیادہ نہیں پڑ سکتا —

جب ژان ڈارک (Jeanne D' Arc) کی سہ صد سالہ برسی بڑی دھوم دھام اور مذہبی اهتمام کے ساتھہ فرانس میں منائی گئی تو اس سے مختلف پایے کے مصنفوں کو یہ خیال پیدا ہوا کہ اس برگزیدہ دوشیزہ کے سوانح حیات پر کچھہ لکھیں - فرانس میں اس موقع پر جو رسومات ہوتی ہیں ان سے فائدہ اُٹھا کر یہاں لوگوں نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ آبادی کے غالب حصے کے رجحانات کیتھالک (Cotholic) مذہب کی طرف ہیں اور وہ جمہوریہ فرانس کی غیر مذہبی پالسی کی تائید نہیں کرتے - چنانچہ پارس

اور آرلیان میں اس موقع پر جو جلوس نکالے گئے ان کا نظارہ متعدد جھنڈوں اور مذہبی نشانیوں کی موجودگی کی وجہ سے حد درجہ موثر تھا - یاد رکھئے کہ یہ اس ملک کا ذکر ہے جہاں مذہب کی ظاہری وقعت تو کی جاتی ہے لیکن اس کے عقاید دلوں سے محو ہو چکے ہیں' ژان دارک کی زندگی کی داستان جس قدر دلگداز اور موثر ہے اس کی نظیر انسانیت کی تاریخ میں مشکل سے مل سکتی ہے - جس زمانے میں یہ ناخواندہ دھقانی لڑکی منظر عام پر آئی ہے اور اس نے یہ ظاہر کیا ہے کہ اس کے کان میں غیبی صدائیں آتی ہیں اور اسے حکم دیتی ہیں کہ فرانس کی سیوا کے لئے اٹھہ کھڑی ہو' وہ فرانس کی تاریخ میں نازک ترین زمانہ تھا' ایک طرف بادشاہ اپنے درباریوں کو جلو میں لئے ہوے طواف زمین کرتا پھرتا تھا' تو دوسری طرف تمام ایسے شہر جو تہذیب و تمدن کا گہوارہ تھے انگریزوں کے قبضہ میں آچکے تھے' غرض کہ ایسے نازک وقت پر یہ لڑکی اٹھہ کھڑی ہوتی ہے - معمولات و فرائض زندگی کی ادائگی نے اسے عام دنیاوی باتوں کے متعلق تھوڑی بہت عقل سکھا دی ہے اور محض اسی کے سہارے اور مشیت ایزدی کے اشارے پر یہ فوجیں لے کر میدان جنگ کی طرف بڑھتی ہے اور جن زمینوں کو بڑے بڑے شاطر سپہ سالار کھو بیٹھے تھے' انہیں دشمنوں سے چھین کر شاہ فرانس کے حوالہ کرتی ہے - لیکن اس المناک داستان کا انجام کس قدر حسرت ناک ہے' اہل کلیسا انگلستان سے ساز باز کرکے اس مجاھدہ کو ملعون قرار دیتے ہیں - اس پر مقدمہ چلایا جاتا ہے اور حکم ہوتا ہے کہ اسے زندہ جلا دیا جاے - آج کل کیتھلک کلیسا نے اس کی ولایت کو تسلیم کر لیا ہے - لیکن اس کی زندگی میں اہل کلیسا برابر یہ استدلال کرتے رہے کہ کوئی انسان پیغمبری کے دعوے کا مجاز نہیں ہو سکتا اور ہو بھی کیسے سکتا تھا - حکم ربانی سننے اور اسے لوگوں تک پہونچانے کا ٹھیکہ تو اہل کلیسا پہلے ہی سے لے چکے تھے! —

یوں تو ژان دارک کی داستان اکثر ادبیات کا موضوع رہا کرتی ہے۔ لیکن شلر کی کتاب "آرلیاں کی دوشیزہ" (Maid of Orleans) میں جو بھجنوں کی سی نرم رو موسیقیت اور خاص حزنیہ شان پائی جاتی ہے وہ کہیں اور نظر نہیں آتی۔اس مصنف نے اُس کی سیرت نگاری میں جن رنگوں سے کام لیا ہے وہ رومانیت اور مثالیت کے رنگ ہیں جو اس کے زمانے میں مقبول تھے۔ اُس کی خوبیوں کو شاعرانہ مبالغہ کے ساتھ اور اُس کی تقریروں کو دلکش اور متین انداز میں بیان کیا گیا ہے۔شلر نے اُس کے روحانی پیغام پر خاص طور پر زور دیا ہے اور یہ ناممکن ہے کہ ہم اس کے ڈرامے کو پڑھیں اور اس مقدس دوشیزہ کے مجذوبانہ جوش اور علویت سے مرعوب نہ ہوں ژان دارک کی خیالی تصویر الہانی مثالیت (Idealism) کے مخفی رجحانات کے عین مطابق تھی۔ ٹیوٹن (Teuton) قوم کے قصص میں جو حیثیت (Brundhildes) کو حاصل ہے، وہی شلر کی تصنیف کی مذہب عیسائیت کے قصص میں ہے —

اور تو اور اناتول فرانس بھی ژان دارک کی پر اسرار شخصیت کی کشش سے نہ بچ سکا۔پہلے اس مصنف کا یہ خیال ہوا کہ دوسرے مباحث کی طرح اس موضوع کو بھی اپنے ذہن کی تیز اور نقادانہ روش میں دیکھے اور جس طرح وہ اپنی علمی زندگی کے دوران میں عیسویت کے پیدا کئے ہوئے توہمات کو غارت کرتا رہا۔اسی طرح اپنے قلم کی نوک سے ژان دارک کے احترام اور تقدس کے حباب کو بھی توڑ ڈالے، لیکن اناتول فرانس صرف عہد قدیم کی شان اور یک رنگی کا دلدادہ نہ تھا، بے رحمانہ تنقید اور عقاید کی منطقی کمزوریوں کے علاوہ اس کی فطرت کا ایک اور رخ بھی تھا، یعنی وہ ایک متبحر عالم تھا۔اس کی کسی کتاب کو اٹھا کر پڑھو تو تمہیں خود بخود محسوس ہو جائے گا کہ اس کی تصانیف میں کس قدر علمی شان ہوتی ہے۔چنانچہ جب وہ ژان دارک کی تاریخ لکھنے لگا اور اس نے اپنی عادت کے موافق تمام

قدیم تحریروں اور ماخذوں پر نظر ڈالی تو اس برگزیدہ لڑکی کی شخصیت نے اس کو بہت متاثر کیا - ایسی ایسی چیزیں اس کی نظر کے سامنے آئیں کہ اس کا معقولیت پسند ذھن بھی ان کی تہ کو نہ پہونچ سکا - طعن و طنز سے کام لینا تو درکنار، اُس نے اس خدا رسیدہ دھقانی لڑکی کے سامنے سر تسلیم خم کر لیا اور بے بس اور مجبور ہوکر، اپنی عادت کے خلاف اس کے تقدس اور اپنے عجز کا مقر ہوگیا —

مسٹر برنارڈ شا نے بھی گزشتہ چھہ ماہ میں ژان ڈارک کی سوانح پر اظہار خیال کیا ھے، اس تصنیف نے یورپ کے علمی حلقوں کو اپنی طرف متوجہ کرلیا ھے - یہ ایک ڈراما ھے، جو یورپ میں ھر جگہہ کھیلا جا چکا ھے اور اب بھی کھیلا جاتا ھے - یہ ایک انگریزی ایکٹرس مس سی بل تھارن ڈایک (sybil Thorndike) کے لئے لکھا گیا تھا جو المیہ پارٹ کھیلنے کا خاص ملکہ رکھتی ھے - مبصرین فن کی رائے ھے کہ وہ اپنے پارٹ کو کامیابی کے ساتھہ نہ کھیل سکی - یہ ڈراما برلن، پیرس، پریگ، ماسکو میں بہت مقبول ھوا ھے، مگر روم اور وانیا میں اسے ممنوع قرار دیا جا چکا ھے - اس کی وجہ یہ ھے کہ اس میں ژان ڈارک کی زندگی جس پہلو سے پیش کی گئی ھے وہ مذھبی اعتقاد کے خلاف ھے —

مسٹر برنارڈ شاہ کی حیثیت بہ لحاظ صاحب فن ھونے کے اتنی زیادہ نہیں ھے جتنی کہ بحیثیت ایک پمفلٹ باز، اشتراکی، اور مصلح کے ھے، وہ ژان ڈارک، یا بقول خود "مقدس جون" کو دھقانی ذھانت اور عملی قابلیت کا ایک اعلیٰ نمونہ سمجھتے ھیں اور بس - وہ تسلیم کرتے ھیں کہ اس خاتون کی زندگی میں کچھہ ساعتیں مکاشفہ اور الہام کی بھی ھوتی تھیں، لیکن شلر کی طرح وہ ان کے وجود پر زور نہیں دیتے - ان کی کتاب کے سب سین (مجلسیں) یکے بعد

دیگرے پڑھتے چلے جاؤ' کہیں تم دیکھوگے کہ ژان ڈارک بادشاہ کو سکھا پڑھا رہی ہے' خود بادشاہ کی سیرت یہ ہے کہ وہ ایک کند ذہن نوجوان ہے جو ہر وقت سیب چوستا رہتا ہے اور عجیب و غریب لباس پہنتا ہے۔کبھی تم ژان ڈارک کو اس رنگ میں دیکھوگے کہ وہ بڑے بڑے طرے اور دستار والے با رعب جنرلوں کو اصول جنگ کی تعلیم دے رہی ہے اور حربی مدارس میں جو قواعد جنگ ان لوگوں نے سیکھے ہیں انھیں بالائے طاق رکھہ کر' ان کی بجاے اپنی پر زور طبعی ذہانت کے بنائے ہوے اصول حرب پیش کر رہی ہے۔ مسٹر برنارڈ شا کی یہ خصوصیتیں صرف اسی تصنیف تک محدود نہیں ہیں' جو کچھہ وہ لکھتے ہیں اس میں ایک نہ ایک رجحان یا عمرانی مقصد ضرور پیش نظر ہوتا ہے' اس تمثیل (Play) کے پڑھنے والے کو محسوس ہوتا ہے کہ مصنف حسب عادت اپنے زمانہ کے انتہای جدید خیالات کی ترجمانی کر رہا ہے۔ مسٹر شا آئرش ہیں' انگریزی ظرافت نگاری ان کا پایہ بلند ہے اور یورپ میں عموماً اور جرمنی میں خصوصاً ان کی تحریریں نہایت مقبول ہوتی ہیں' لیکن ان کی ظرافت کا مزہ صرف انگریزوں ہی کو آ سکتا ہے۔اگر ظرافت کو چیستان کا مرادف مان لیا جاے تو اس میں شک نہیں کہ وہ اعلیٰ درجہ کے ظریف ہیں' لیکن بد قسمتی سے ان کی ظرافت زیادہ تر سطحی ہوتی ہے' اور کہیں کہیں تو اسکی حیثیت محض ایہام کی سی ہو جاتی ہے' اس میں شک نہیں کہ انہوں نے ہنسنے ہنسانے کی باتوں میں بہت بڑا حصہ لیا ہے' لیکن انسانی غور و فکر کو بہت کم اُکسایا ہے۔ان کے خیالات کا سرمایہ زیادہ تر ماخوذ ہے۔ اس سے کوئی انکار نہیں کرسکتا کہ انگریز مصنفوں کے زمرے میں صرف وہی ایک ایسے ہیں جو یورپ کے خیالات حاضرہ سے با خبر ہیں۔اس کا سبب غالباً یہ ہے کہ وہ آئرلینڈ میں پیدا ہوے۔اگر کسی کو مسٹر شا کے خیالات کا ماخذ دیکھنا ہو' تو اُسے چاهئے کہ اِبسن (Ibson) برایو (Brieux) ویگنر (Wagner)

مارکس (Marx) اور اسٹرن ڈن برگ (Strindenburg) کی تصنیفات کو پڑھ جاے۔ان کتابوں سے اُسے معلوم ھوجاے گا کہ مسٹر شا کے جذبہ اشتراکیت کی سوت کہاں سے پھوٹتی ھے۔جب سے کہ روس میں اشتراکیت کا تجربہ شروع ھوا ھے، اسوقت سے یورپ میں تعلیم یافتہ طبقہ کی طرف سے مخالفت پیدا ھوگئی ھے۔اور یہ اس لئے کہ یہ طبقہ صلح جو ھے اور ھنگامہ آرائی کا اھل نہیں۔عمال اور مزارعین کے ساتھہ ھمدردی ھو چلی ھے۔ھم یہ نہیں کہتے کہ خیالات کا موجودہ بہاؤ صحیح راستے پر ھے یا غلط راستہ پر، لیکن اتنا ضرور ھے کہ مسٹر برنارڈ شا نے بھی اسی عام احساس سے متاثر ھوکر ژان ڈارک کی شخصیت کو دھقانی زندگی کا ایک کامل نمونہ بناکر پیش کیا ھے، اور اس کے مقابلہ میں نالایق " ماھرین فن " اور زوال آمادہ اشرافوں کا خاکہ اُڑایا ھے۔ اس کی تمثیل کی آخری مجلس میں فردوس کا ایک منظر دکھایا گیا ھے۔یہاں ایک شخص جو جدید وضع کے لباس (فراک کوٹ اور ٹاپ ھیٹ) میں ملبوس ھے ژان ڈارک کی خدمت میں اس کی ولایت کی سند پیش کرتا ھے، وہ اس پر متعجب ھوتی ھے اور پھر سے زندہ ھونے کی آرزو کرتی ھے، اس کے منہہ سے یہ الفاظ سن کر ھمارا دور جدید کا نمائندہ خوف سے چلا اٹھتا ھے کہ اس کا دوبارہ دنیا میں آنا ایک عذاب عظیم ھو جاے گا۔ایک طرف یہ گفتگو ھو رھی ھے، اور دوسری طرف چارلس شاہ فرانس شب خوابی کا لباس پہنے ھوے ایک بادل کے ٹکڑے پر سر رکھے ھوے لیٹا ھوا ھے، اور بوکاشو (Boccacio) کے ولولہ انگیز افسانوں کی ایک ضخیم جلد کے مطالعہ میں مشغول ھے—

ژان ڈارک کے سوانح حیات کو اس طرح علمی بحثوں کے موضوع قرار دینے کا ایک نتیجہ یہ ھوا کہ ان علمی حلقوں میں جو ولایت، اور اولیاء اللہ کے قایل ھیں ادبی رد عمل کا آغاز ھوا۔بد قسمتی سے جن لوگوں نے اس خاتون

کی حمایت میں قلم اٹھایا ھے وہ استعداد، جوھر ذاتی، اور ظرافت، غرض ھر اعتبار سے مسٹر برنارڈ شا سے پیچھے ھیں۔ایم پورشے (M-Porche) نے جو تمثیل " عالی ظرف دوشیزہ " (La Vierge an grand coeur) کے نام سے لکھی ھے، اس کی بڑی خامی مبالغہ آمیزی ھے۔اگر ایک طرف یہ کتاب اس سنجیدہ اور متین انداز سے خالی ھے جو شلر کی تصنیف کی امتیازی خصوصیت ھے تو دوسری طرف اس میں ژان دارک کی زندگی کے پر اسرار رخ کو اتنا بڑھا چڑھا کر دکھایا گیا ھے کہ اُس کی انسانیت پر پردہ پڑ گیا ھے حالاں کہ یہ انسانیت ھی اس کی زندگی کا حسین ترین پہلو ھے۔اس پارٹ کو ایک مشہور ایکٹرس نے ادا کیا، لیکن اسے کامیابی نصیب نہ ھوسکی، اگرچہ اس حیثیت سے اسے ضرور کامیاب کہا جاسکتا ھے کہ اس میں اس دوشیزہ کی شخصیت کو مسٹر شا کے خلاف دوسرے ھی انداز سے پیش کیا گیا ھے۔ایک موسیو دل تیل (M Delteil) ھیں یہ اگرچہ نوجوان ھیں لیکن بڑی قابلیت رکھتے ھیں، ان کی تصنیف " خیرالامور اوسطہا " کی مثال ھے، سنجیدہ تاریخی واقعات کو متانت کے ساتھہ مذھبی اعتقاد کی روشنی میں پیش کیا گیا ھے۔ان کی تصنیف ھی کی بدولت بہت سے ایسے اشخاص جو پہلے پورا اعتقاد نہ رکھتے تھے اب ژان دارک کے حامیوں کی صف میں مل گئے ھیں یہ عام فہم ھے۔اپنے مو قلم کی ھاکی جنبشوں سے انھوں نے اس ولیہ کی شخصیت کو جیتا جاگتا، اور ھم سب کے لئے مانوس بنا دیا ھے اور اس طرح ان عام فہم اور مقبول عام تصانیف کی فہرست میں جس کا حوالہ میں پہلے دے چکا ھوں ایک اور تصنیف کا اضافہ کیاھے —

جن لوگوں نے گزشتہ چند ماہ کے فرانسیسی ادب کا مطالعہ کیا ھے، ان کو یہ دیکھکر تعجب ضرور ھوا ھوگا کہ آج کل اس میں رومانیت (Romanticism) کا رنگ کتنا گہرا جھلکتا ھے، فرنسیسی مزاج خاص طور پر قدامت پسند واقع ھوا ھے، اس کے ثبوت کے لئے اس قوم کی مصوری،

سنگتراشی اور چمن بندی پر نظر ڈالنا کافی ہوگا' ان چیزوں سے معلوم ہوتا ہے کہ اس قوم میں صحیح منظر کشی اور جسم انسانی کے خط و خال کو ہوبہو بیان کرنے کا کتنا ملکہ ہے۔ رومانیت دراصل المانی اور اینگلو سیکسن لوگوں کا مذہب ہے۔اور اگرچہ فرانسیسی ادب میں بھی وکٹر ہیوگو (Hugo) کی طرح رومان نگار ہوے ہیں' لیکن اس نے بہت جلد پارناسی* قدامت پسندی کی شکل اختیار کرلی۔ اس لئے کہ موخرالذکر طرز لوگوں کے مذاق اور ان کی ادبی ضروریات کی ہمنوا ہے' اگر خود وکٹر ہیوگو کی تصانیف سے تاریخی مناظر اور تاریخی اثرات کو خارج کردیا جاے تو اسکی حیثیت بھی ایک ایسے کلاسک (قدیم) مصنف کی سی رہجاتی ہے جو صناعوں کی طرح صورت نگاری میں خاص کمال رکھتا ہے۔ فرانسیسی رومانیت کل وجز پارناسیت (Parnassianism) نہیں ہے۔ بلکہ اس کے رد عمل کے طور پر اس نے مثالیت†

---

* پارناسیت (Parnassianis) لفظ Parnassus سے مشتق ہے' یہ وہ ایک پہاڑ ہے جو یونان میں اتھنس کے شمال مغرب میں واقع ہے اور خداے نغمہ اپالو کا مسکن خیال کیا جاتا تھا' مذہب پارناسیت فرانسیسی شاعری کا ایک مشہور مذہب ہے اس مذہب کا مقولہ "L' Art pour l' art" " فن بحیثیت فن " ہے۔ اس خیال نے سب سے پہلے سنہ ۱۸۶۶ میں مذہب شاعری کی حیثیت اختیار کی صرف فنی حیثیت پرزور دیا جاتا ہے اور ذاتی تاثیرات اور اخلاقی پند و موعظت کو معیوب سمجھا جاتا ہے یہ مذہب فی الحقیقت رومانیت کی ایک شاخ ہے' اس کے بڑے بڑے حامی Catulle Mendes,Sully Prudhomme,Francois Coppee Armande Silvestr وغیرہ ہیں بعد میں اس مذہب نے مسخ ہو کر لفاظیت کی بالکل وہی شکل اختیار کرلی جس کے لئے ہمارا لکھنؤ بدنام ہے —

(مترجم)

† مثالیت (Symbolism) بحیثیت ایک مذہب ادبیات کے یہ چیز فرانس میں انیسویں صدی کے نصف آخر میں پیدا ہوئی' اس مذہب کے حامی فطرت کے خارجی مظاہرات کو ایک باطنی اور روحانی حقیقت کی نشانیاں سمجھتے ہیں اور اپنی

(باقی صفحہ آئندہ)

(Symbolism) کی شکل اختیار کرلی ہے ' یہ صورت کے اعتبار سے رومانیت ہی ہے۔ پارناسیت کی طرح مثالیت میں بھی ادب کی ظاہری شکل کا مسئلہ تھا، اور اگرچہ یہ مذہب اپنی خیال آرائی کے لحاظ سے عجیب و غریب ضرور ہے، لیکن اس میں ہمیں تحقیق و تلاش کا وہ پر جوش رحجان نظر نہیں آتا جو Novalis یا Coleridge کی تصنیفات میں ملتا ہے۔ مذہب مثالیت اپنا ایک علیٰحدہ اسلوب رکھتا تھا جس کی اساس اصوات تھیں—

رومانیوں کا رحجان جس شکل میں ظاہر ہوتا ہے وہ نئے ملکوں کی سیر کی خواہش ہے جہاں کی زندگی ہماری زندگی سے مختلف ہوتی ہے ' اور جہاں کے عورت مرد انوکھے اور دلکش طور طریقوں کے شیدا ہوتے ہیں ' یہ لوگ عجیب و غریب درختوں ' نئے نئے پھولوں ، غیر معمولی آرائش و زیبائش کے شوقین ہیں ' دیومالا ' خاندانی کہانیاں جو مائیں اپنی اولاد کو سناتی ہیں، انجان دلوں کے نغمے، یہ چیزیں انہیں مرغوب ہیں۔ چوں کہ مشرق کا رحجان بھی زیادہ تر یہی ہے اور وہ اپنے سونے اور جوہرات کے خزانوں اور بوقلمونیوں کے لئے مشہور ہے ' اس لئے وہاں کا شق ہمیشہ سے رومانیت کے تخیل کو اکساتا رہا ہے چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ جس کتاب سے انگلستان میں رومانیت کی تحریک کا آغاز ہوا ، وہ بک فورڈ کا ناول "واتیک" ہے۔ یہ الف لیلیٰ کی وضع کا ایک خیالی افسانہ ہے جرمنی میں اس تحریک کا آغاز شلیے گل (Schlegel) کی سنسکرت زبان کے متعلق تصانیف اور گوئٹے کے دیوان " پیام مغرب " (West - Ostliche) سے ہوتا ہے۔ فرانس میں اس کی سب سے

تصانیف میں اسی پس پردہ حقیقت کو آشکار کرتے ہیں۔ جیسا کہ خود صاحب مضمون نے بتلایا ہے، یہ مذہب پارناسیت کی واقعہ نگاری کی ضد پر پیدا ہوا، یہ لوگ خواب، اور روحانی مکاشفوں کو اکثر بیان کرتے ہیں، اس مذہب کے مشہور مصنف Stephane mallarme ' Paul Verlaine ' Maeterlinck وغیرہ ہیں—

پہلی مظہر و کڑ ھیوڈر کی کتاب (Orentales) ھے —

شاید یہ فرانسیسی ادب کی تاریخ میں پہلا موقع ھے کہ آج کل کی ادبیات جس آرزو سے لبریز نظر آتی ھے وہ رومانیت کے مفہوم سے بہت قریبی تعلق رکھتی ھے، اب عالم اور باکمال لوگ خوب سفر و سیاحت کیا کرتے ھیں اور دور دراز ملکوں کے حالات لکھتے ھیں- اج کل کے جوش کی شدت کو دیکھکر کسی کو یہ یقین نہیں آسکتا کہ طرز انشاءکی خشکی اور بے مزگی ھمیشہ سے اس ادب کی خصوصیات رھی ھیں اس چیز کی ابتدا اب سے بہت پہلے اسی زمانہ میں ھو چکی ھے جب گاگنیں (Gangain) نے اپنی ایک کتاب میں تاھی تی (بحرسکاھل کا ایک جزیرہ) کی عورتوں کا حال لکھا- آج کل دھامل (Dumahel) جن کے کلام میں عصر جدید کے سب فرانسیسی شعرا سے زیادہ جدت پائی جاتی ھے، برابر سیر و سیاحت میں مصروت رھتے ھیں، اور نئے ملکوں کے متعلق اپنے خیالات کا اظہار کیا کرتے ھیں- پال کلاندیل (Paul clandel) فرانس کے زندہ شاعروں میں سب سے زیادہ مشہور ھیں، یہ صوفی منش بھی تھیں- کسی زمانہ میں سفر کی حیثیت سے ان کا قیام جاپان میں بھی رہ چکا ھے، انہوں نے بھی نظموں کا ایک اعلی اور کسی قدر ادق مجموعہ شایع کیا ھے- (مشرق کے متعلق اپنی سب معلومات اس میں بیان کی ھے ' (L' Connaissance-esit) (مشرق کے متعلق معلومات) نثر نما نظموں کا ایک مجموعہ ھے- اس میں سرسری قلبی واردات کا بیان اور اقصائے مشرق کے علم و دانس کے تذکرے ھیں نا یہ کتاب بہت لاجواب چھپی ھے- ترجے لیں (Dorgelis) ایک قابل اور نوعمر فرانسیسی مصنف ھیں- ان کی ایک کتاب (Sur Laroute Mandarins) (چینیوں کے نقش قدم پر) ھے، یہ کتاب فرانس کے مشہور معمور رسالہ (L' Illustration) میں مضامین کی شکل میں شایع ھو چکی ھے- اس میں مصنف نے رنگین بیان کے ساتھہ هندی چین کمبوڈیا، سیام اور چین میں اپنی سیاحت کا حال لکھا ھے - ایک اور صاحب

مان تهرلان فرانس کے سب سے زیادہ کثیر الاشاعت اخبار (L' Intransigient) میں هسپانیه کے دیہات اور سرحدی قصبات کے متعلق اپنے تجربات شایع کر رهے هیں- آج کل هسپانیه نے یکایک تمام یورپ کے تخیل میں جگه پالی هے اور اکثر افراد کے رومانی رجحانات کا قبلۀ مقصود بن گیا هے - یه ملک قدیم روایتوں میں ڈوبا هوا هے' ادب اور فن کے اعتبار سے اس کا ماضی نهایت شاندار رہ چکا هے اور آج بهی جب که یورپ کے دوسرے حصوں میں جمہوریت کی آندهیاں اٹهه رهی هیں' اس ملک میں پرانی اشرافی (Anistocratic) زندگی کا توازن بدستور موجود هے' گزشته سال ایک جرمنی کتاب (Der Unbe-kannte spanien (نا معلوم هسپانیه) لکهی جا چکی هے' اس کتاب کو جو حیرت انگیز قبولیت حاصل هوئی اس کی بڑی وجه یه تهی که اُس میں اس سرزمین هسپانیه کے حالات درج تهے-جو قریب هونے کے باوجود هم سے دور هے اور جہاں قدیم رنگینیاں اور ساده عقیدے آج تک باقی هیں - مان تهرلان کے جن مضامین کا ذکر سطور بالا میں هو چکا هے اس قدر بصیرت کے ساتهه لکهے گئے هیں اور ان میں اس ملک کی رنگینیاں کچهه ایسے انداز میں بیان کی گئی هیں که نا ممکن هے که پڑهنے والے کے دل میں اس پیرےنیز (Pyrennese) پار ملک کے دیکهنے کی آرزو نه پیدا هو اور ملک بهی کیسا! جہاں پرانے پادری اور گرجا آج تک موجود هیں' جہاں کا رقص ولوله انگیز هے محبتیں ساده هیں اور جہاں کی مہمان نوازی پرانے زمانے کے سورماؤں کی سی هے - یه وه ملک هے جس پر آج بهی ایک پراسرار پرده پڑا هوا هے اور جہاں لوگ آج تک سیاسی اور مذهبی "پیر پرستی" پر ایمان لاتے هیں —

سیاحت ناموں کے علاوہ زمانه حال کی دوسری تصنیفوں سے بهی یهی رومانی رنگ جهلکتا هے' فرانکوا ماریس نے ایک نهایت اهم اور دلچسپ کتاب "صحرائے محبت" کے نام سے لکهی هے - یه صاحب Le baiser anx lepreux

(جذامیوں کے لئے ھدیۂ محبت' کے بھی مصنف ھیں' ان کا شمار زمانہ حال کے اُن مذھبی مصنفین میں ھوتا ھے جو عیسویت کے ان اُصولوں پر قائم ھیں جن کی مثال اور جن کی تعلیم "سینٹ فرانسس آف اے سی سی" کی زندگی سے ملتی ھے' محبت' مفاھمت اور تواضع ان کی زندگی کے اُصول ھیں' عشق میں مبتلا ھونے کے بعد انسان کو جو کشمکش اپنے رھبی جذبہ انانیت پسندی سے کرنی پڑتی ھے اس کو یہ خاص طور پر سراھتے ھیں' یہ صاحب ایک مخصوص طرز تحریر کے مالک ھیں اور اگرچہ انھیں مشکل اور متروک الفاظ استعمال کرنے کا شوق ھے' تاھم ان کی تصنیفات کی سطح کے نیچے سنجیدہ مزاجی' ذھانت اور سرمدی حب الٰہی کے اعتقاد کی جھلک دکھائی دیتی ھے - وھی اعتقاد جو ایک دن انسان کو ھمیشہ ھمیشہ کے لئے آلام سے نجات دلائے گا —

کے سل (Kessel) کی کتاب Les Roi Avengles (نابینا بادشاہ) اپنی نوعیت کے اعتبار سے مذکورۂ بالا تصنیف سے کسی قدر مختلف ھے' لیکن رومانی تاثر اس میں بھی بھرا ھوا ھے' اس کتاب کی اشاعت نے لوگوں کو کو متعجب کر دیا ھے اور اس پر بہت کچھہ بحث و مباحثے ھوتے رھتے ھیں' اس کتاب کو فرانسیسی مجلس علمی کے ادبی انعام پانے کا موقع بہت کچھہ تھا' لیکن چونکہ اس میں بہت قریب زمانہ کے تاریخی واقعات سے بحث کی گئی ھے' اس لئے رد اسے کر دیا گیا' اس میں سلطنت روس کے آخری زمانہ کا ذکر ھے - اصل قصہ ایک رسالہ کے افسر کے عشق کا ھے - یہ شخص اپنے ھی طبقہ کی ایک خاتون پر عاشق تھا' اسی سلسلہ میں سلطنت روس کی تباھی کی داستان بھی آگئی ھے - کے سل نے یہ کتاب کاونٹ ازواتسکی سابق سفیر روس متعینہ پاریس کی لڑکی کے ساتھہ مل کر لکھی ھے' اسے زار روس کے دربار کے حالات اس خاتون سے معلوم ھوے اور اپنے تخیل سے کام لیکر اس نے ان حالات کو

ایک ترکیبی حیثیت دی، جو لوگ ان آخری ایام سے کچھہ بھی تعلق رکھتے تھے، ان سب سے مشورہ کیا - غرض کہ اس کد و کاوش کے بعد اِس نے اُس پرآشوب زمانہ کی جیتی جاگتی تصویر کھینچی ھے جب فوج قلت رسد کی وجہ سے مجبور تھی اور بہادری کے ساتھہ درباری پارٹی کی خاطر اپنی جانیں قربان کر رھی تھی اور دوسری طرف دربار ھپناٹزم (نومیت) کے تماشوں اور راگ رنگ کی محفلوں سے اپنا جی بہلاتا تھا، خصوصاً اس نے راس پوتن کے جو حالات بیان کئے ھیں وہ منصفانہ نظر اور بلند تخیل کا نمونہ ھیں - راس پوتن سابریا کا دھقان اور پادری تھا اس نے اپنے پر اسرار اور ساحرانہ علاج سے ولی عہد کو اچھا کر دیا تھا اور اس وجہ سے بادشاہ بیگم اور اس کے توسط سے زار پر اس کا اثر بہت کچھہ تھا، اس قوی ھیکل دھقان کی جو تصویر کے سل نے اپنے قلم سے کھینچی ھے - اس کے وہ کرتے جو شاھزادیوں کے ھاتھوں کی بوی ھوئی روئی سے بنے تھے، اس کی وہ رنگ رلیاں، لیکن ساتھہ ھی ساتھہ بہت لوگوں پر اس کے احسانات، اس کی زندگی، جو عورتوں میں گزری، لیکن اس کے باوجود اس کی بیوی اس کے متعلق یہی کہا کرتی تھی "اس سے زیادہ محبت کرنے والا شوھر ھونا ناممکن ھے" وہ اس کی سیرت جو خوبیوں اور کمزوریوں کا مجموعہ تھی اور اس سیرت کے متزاد اجزا جو سب روسیوں میں پاے جاتے ھیں، وہ اس کی ترحم آمیز قوت و طاقت جو صرف کھیتوں میں زندگی بسر کرنے والوں میں ھوتی ھے، یہ سب باتیں جس انداز سے بیان کی گئی ھیں وہ ایسا ھے کہ بہت دنوں تک پڑھنے والوں کی یاد سے محو نہ ھو سکے گا - اس کی موت کا سماں بھی نہایت پر زور انداز سے کھینچا گیا ھے، عزرائیل اور ساحر کی جنگ، خوبصورت شاھزادہ یوسو پوف کا اسے زھر ملی ھوئی روٹیاں دینا، اس کا زھریلی شراب کا پینا، یکے بعد دیگرے بندوقوں کی تین گولیاں کھانے کے بعد بھی اپنے قاتل کو محبت کے ساتھہ

نام لے کر پکارنا' موت کی پرچھائیں کا محسوس کرنا' لیکن اپنے ارادے کے زور سے اس سے محفوظ رہنا' اسی حالت میں اس کوٹھری سے جس میں اس کو مقید کر دیا گیا تھا رینگ رینگ کر نکلنا اور نم بستہ صحن سے ہوکر گزرنا' اس کے دماغ کا پاش پاش کر دیا جانا اور تب اس کی روح کا پرواز کرنا' یہ سب واقعات خاص زور کے ساتھہ بیان کئے گئے ہیں—

کے سل کی یہ تصنیف نہایت زبردست اور پر اثر ہے' اس کے مطالعہ سے ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ زندگی کی بہت سی ایسی باتیں جنھیں ہم آسان اور قابل توجیہ سمجھتے ہیں' فی الحقیقت پیچیدہ اور دقائق سے بھری ہوئی ہیں' کے سل کے قلم میں توازن و تعدیل کا وہی احساس موجود ہے جو ہر صاحب فن میں ہوتا ہے۔ وہ کبھی کسی طرف جنبہ داری کے خیال سے مائل نہیں ہوتا' جن افراد انسانی کا وہ ذکر کرتا ہے وہ جتنے جاگتے انسان ہوتے ہیں' خواہ زار روس ہوں' یا فوج کے جنرل' یا پھر معمولی خدمتگار' اس کا منظر کشی کا احساس بھی جنچا تلا اور اعلیٰ درجے کا ہے۔ اس کی تصنیفات میں حد درجے توازن اور موسیقیت پائی جاتی ہے اور وہ ان گنتی کے چند مصنفین میں سے ہے جو اشیا اور مقامات کے طول طویل بیانات دیکر اپنی کتاب کو غارت نہیں کرتے۔ ذہنی حالت کا لحاظ رکھتے ہوے مناظر کی عضوبندی کرنا اور موسیقیانہ توازن کو قائم رکھنا یہ چیزیں اس نے فن افسانہ نویسی کے استاد ایوان ترجی لوت سے حاصل کی ہیں کیونکہ وہ (کے سل) روسی زبان جانتا ہے اور اس نے ضرور اس مصنف کا گہرا مطالعہ کیا ہوگا۔ سنیت پیٹرس برگ کی راتوں کا جو حال اس نے لکھا ہے' وہاں کی بدنما برفستانی گاڑیاں' راتوں کے وقت کی بھیانک پرچھائیاں' زد رنگ کی پھیکی روشنی جس سے کبھی تو اس مرطوب شہر کے قصر چمک اٹھتے ہیں' اور کبھی دھندلے ہوجاتے ہیں' وہاں کی سایہ دار شاہراہیں' رات کے سناٹے میں اس شہر کی پر سکوت شوکت و

عظمت، یہ سب چیزیں جس انداز سے پیش کی گئی ہیں وہ یقیناً اس قابل ہے کہ دورجدید کے فرانسیسی ادب کی تاریخ میں یادگار کے طور پر باقی رہے۔ کے سل ایک نازک مزاج، حساس اور صاحب تخیل مصنف ہے اور یقین ہے کہ اس کا مستقبل نہایت شاندار ہوگا۔

ادب

تاریخ

متفرق

اردو کے جدید رسالے

-:o:-

ادب

قاموس المشاهیر

مرتبہ مولوی نظام الدین حسن صاحب نظامی بدایونی

مطبوعہ نظامی پریس بدایون سنہ ۱۹۲۴ ع

جلد اول- صفحات-۴-۳۲۴-قیمت چھہ روپیہ

قاموس المشاهیر مشرق کی بیاگریفیکل ڈکشنری هے-اس میں اون مشاهیر علماء فضلاء شعراء اور ملوک امراء کے تذکرے درج هیں جنهوں نے بلاد مشرق میں نمایاں شهرت حاصل کی هے—

اس قسم کی دو تین کتابیں اگرچه اس سے پہلے بهی اردو میں شایع هو چکی هیں-لیکن یه کتاب اپنی ترتیب کے لحاظ سے اردو میں پہلی کتاب هے اور اس کی تدوین ویسی هی عمل میں آئی هے جیسی که یورپ کی کتب استنادیر میں هوا کرتی هے اور مولانا نظامی نے اس کو ترتیب دے کر ادب اردو میں ایک مفید اور کار آمد اضافه کیا هے—

هم نے قاموس المشاهیر کے جسته جسته مقامات دیکھے هیں جس سے معلوم هوتا هے-که اس کی تالیف میں پوری احتیاط سے کام نهیں لیا گیا هے اور اس وجه سے اس میں بہت سی فروگزاشتیں هوگئی هیں-اکثر مشاهیر کے حالات نهایت تشنه اور نامکمل هیں اور ان میں اکثر ضروری اور اهم باتیں چھوٹ گئی هیں— مثلاً

داغستانی مصنف ریاض الشعراء کا تذکره بہت ناقص لکھا هے-یهاں تک که اس میں نام اور سنه وفات بهی نهیں هے—

تقی اوحدی کے احوال میں اس کے مشهور و معروف تذکرے عرفات العارفین وعرصات العاشقین کا ذکر نهیں هے—

زلالی کے تذکرے میں اس کی مشہور مثنویات کا جو سبعہ سیارہ کہلاتی ہیں ذکر نہیں ہے —

کتاب میں ایسے بہت سے مقامات ہیں - ان کے علاوہ اکثر نام غلط ہیں اور اکثر مقامات پر واقعات بھی غلط لکھے ہیں - جو تذکرے انگریزی ماخذوں سے نقل کئے ہیں اور ان کے اسماء کو صحیح کرنے کی مطلق کوشش نہیں کی ہے —

ذیل میں ہم بعض فروگذاشتوں کو نقل کرتے ہیں - امید ہے کہ آئندہ اشاعت میں اس قسم کے نقائض دور کردے جائیں گے —

——:o:——

صفحه	کالم	سطر	
۲	۲	۲۶	آذری رازی - صحیح غضائری رازی ہے - (تذکرہ عوفی جلد جلد اول ص ۵۹) غضائری کے معنی ہیں کاشی ساز و کاسہ گر اور یہ منسوب ہے غضائر سے - غضائر جمع قیاسی ہے غضارہ کی - غضارہ کے معنی ہیں گل چسپیدہ - وہ ظروف سفالین جن پر کاشی اور چینی سے گل بوٹے بنائے جاتے ہیں غضار کہلاتے ہیں - بعض یورپین مصنفین نے غلطی سے غضائری کا تلفظ عین مہملہ کے ساتھہ ادا کیا ہے - Uzdeeri Razi —
۱۷	۲	۲۵	ابوتسیبا موفق الدین ابوالعباس احمد (مصنف عیون الانبا فی طبقات الاطبا) صحیح ابن ابی اصیبعہ ہے (فہرست کتب خانہ خدیویہ جلد خامس صفحہ ۹۲) —
۲۳	۲	۱۱	ابن رشید - ابوالولید محمد - صحیح ابن رشد ہے —
۲۷	۱	۲۱	ابن ہوکل و مشہور سیاح و جغرافیہ نویس) صحیح ابن حوقل ہے (فہرست کتب خانہ خدیویہ جلد خامس صفحہ ۱۵۰) —
۳۲	۱	۱۰	ابوالفتح مصنف چار باغ اور ابوالفتح گیلانی کو علیحدہ
	۲	۱۲	علیحدہ لکھا ہے - لیکن حقیقت میں دو جدا جدا نہیں ہیں بلکہ ایک ہی شخص ہے - چار باغ ابوالفتح گیلانی کے مجموعہ رقعات کا نام ہے دربار اکبری صفحہ ۶۵۶ و ۶۶۵) —
۳۴	۲	۲۷	ابوالفرج سنجری کو چنگیز خاں کا معاصر بتایا ہے - حالانکہ وہ عنصری کا اوستاد - آل سیمجور کا معاصر اور امیر بوعلی سیمجور کا مداح ہے اور سنہ ۴۱۰ سے پہلے فوت ہوا ہے - مجمع الفصحا جلد اول صفحہ ۷۰) اور اس کی وفات کے

صفحه کالم سطر

تقریباً دو سو سال بعد ساتویں صدی کے شروع میں چنگیز خاں نے خروج کیا ہے -(ابوالفدا جلد سوم صفحہ ۲۲۲)—

۴۶ ۱ ۱۴ آثار ماضیه (حکیم ابو ریحان البیرونی کی ایک تصنیف کا نام) صحیح آثار الباقیه عن قرون الخالیه ہے اور اسے پروفیسر سخاؤ نے سنہ ۱۸۷۸ ع میں چھپوایا ہے (فہرست کتب خانہ خدیویه جلد خامس صفحہ ۲)—

۶۳ ۲ ۱۰ احمدالمکری (اندلس کا مورخ اور نفح الطیب کا مصنف) صحیح المقری ہے (فہرست کتب خانہ خدیویه جلد ۵ صفحہ ۱۹۹)—

۷۶ ۲ ۹ ازرقی حکیم - ازرقی شاعر اور ازرقی مصنف اخبار مکہ ایک نہیں بلکہ دو علیحدہ علیحدہ شخص ہیں —

ازرقی شاعر فارس کا نہیں بلکہ ہرات کا باشندہ اور طغان شاہ بن مويد والی نیشاپور کا مداح و معاصر ہے -(عوفی جلد دوم صفحہ ۸۶) طغان شاہ سنہ ۵۶۸ هجری میں بر سر حکومت ہوا (ابوالفدا جلد سوم صفحہ ۵۳) اور سنہ ۵۸۱ هجری میں فوت ہوا (روضة الصفا طبع ایران جلد چہارم صفحہ ۱۵۰)—

ازرقی مصنف اخبار مکہ کا نام ابوالولید محمد بن عبدالله بن احمدالازرقی ہے اور اس نے ازرقی شاعر سے کم و بیش تین سو سال پہلے سنہ ۲۲۳ هجری میں انتقال کیا ہے —

R. Dozycat. Codicum Orientalium Bibliothecæ Academiæ Lugduno-Batavæ Vol. 11. pp.169.

۷۹ ۲ ۲۸ اسمعیل بن حسین جرجانی (طبیب مشہور) کی نسبت لکھا ہے کہ اس نے فارسی میں طب کی دو کتابیں اغراض الطب اور خف علائی لکھیں اور انہیں الب آرسلان کے نام سے معنون کیا - اسمٰعیل کو الب ارسلان (سنہ ۴۵۵ سنہ ۴۶۵) کا معاصر سمجھنا غلطی ہے - یہ سلطان علاء الدین تکش (سنہ ۵۶۸ سنہ ۵۹۶ کا معاصر ہے اور اسی کے نام سے اس نے کتابیں لکھی ہیں چنانچہ خوند میر کا بیان ہے کہ " سید اسمعیل بن حسین بن محمد الجرجانی زمان تکش خاں را بوجود خود مشرف داشت و

صفحه	کالم	سطر	
			بنام نامی آن بادشاه عالیشان ذخیره خوارزم شاهی و کتاب اعراض الطبیه و خفی علائی را بر صحایف روزگار نگاشت (حبیب السیر جلد دوم جز چهارم صفحه ۱۷۹)—
۱۰۰	۱	۱۹	تاج الدین عبدالوهاب بن آسکی مصنف طبقات الشافعیات- صحیح ابن السبکی اور کتاب کا نام طبقات الشافعیه هے - R. Dozy. Voll. 11 . pp. 302.
۱۱۳	۱	۱۰	انوری (مشهور شاعر) کا نام اشهدالدین لکها هے حالانکه صحیح اوحدالدین هے (عوفی جلد دوم صفحه ۱۱۷)
۱۲۳	۲	۵	بختری (عرب کا مشهور شاعر) صحیح بحتری هے R. Dozy. Vol. 11 pp. 5.
۱۳۲	۲	۹	بندرا بن داس-عالم گیر کے سنه ۴۰ جلوس میں اس نے خلاصة التواریخ لکھی هے اس میں هندوستان کی تاریخ آریاؤں کے زمانے سے عهد عالم گیر تک ترتیب دی هے- خلاصة التواریخ بندرا بن کی تصنیف نهیں هے بلکه ایسے سوجان رائے نے تصنیف کیا هے-بندرابن نے جو تاریخ لکھی هے اس کا نام لب التواریخ هے-اور عالمگیر کے سنه ۳۳ سال جلوس میں تصنیف هوئي هے- اس میں دس ابواب هیں-پهلے باب میں سلطان معزالدین محمد سام کے عهد سے سنه ۱۰۱۱ تک سلاطین دهلی کے حالات هیں-بقیه نو ابواب میں سلاطین دهلی کے ان هم عصر بادشاهوں کا تذکره هے جو ۱-دکن ۲-گجرات ۳-مالوه ۴-خاندیس ۵-بنگال ۶-جون پور ۷-سنده ۸-ملتان ۹-کشمیر میں بر سر حکومت رهے هیں— (Wilson, Makenzie Collection–pp–. 375 Rieu , B.M. Cat . Persion . MSS . Vol . 1 . pp 228)
۲۱۱	۱	۷	کتاب لطایف الطوایف کو ملا حسین واعظ کاشفی کی تصنیف لکھا هے حالانکه وه ان کے فرزند ملا فخرالدین علي بن حسین کی تصنیف هے (محبوب الالباب فی تعریف الکتب والکتاب صفحه ۶۹۳ ---
۱۴	۱	۱۹	خاوند شاه مصنف روضة الصفا کے حالات میں اوسکی

صفحہ	کالم	سطر	
			دوسری تصنیفات کے حسب ذیل نام لکھے ہیں - ماثرالملوک اخبار الاخیار - دستورالوزرا - مکارم الاخلاق - منتخب تاریخ وصاف - غرایب الاسرار - جواہرالاخبار - پھرانہیں کتابوں کو صفحہ ۲۳۰ کالم ۲ میں خوند میر مصنف حبیب السیر کی تصنیفات بیان کیا ہے —
۲۲۷	۲	۸	خواجہ محمد پارسا کے حالات میں اونکی تصنیف کا نام فصل الکتاب لکھا ہے - حالانکہ صحیح نام فصل الخطاب لوصل الاحباب (محبوب الالباب فی تعریف الکتب والکتاب صفحہ ۵۰۷)
۲۳۰	۲	۸	" خوند میر (مصنف حبیب السیر) امیرخاوند شاہ مصنف روضۃ الصفا کا بیٹا اس کا پورا نام غیاث الدین محمد بن حمیدالدین خوند میر ہے " خوند میر خاوند شاہ کا بیٹا نہیں بلکہ نواسہ ہے اور اس کے باپ کا صحیح نام ہمام الدین ہے — (Elliot . Vol . 1V . pp 142 .)
۲۳۳	۲	۷	دارا شکوہ نے فارسی میں اپنکھت کا جو ترجمہ کیا تھا اس کا نام سرالاسرار لکھا ہے - حالانکہ صحیح نام سراکبر ہے چنانچہ بمقام بنارس ندوۃ العلما کا جو گیارواں اجلاس اپریل سنہ ۱۹۰۶ عیسوی میں منعقد ہوا تھا - اوسمیں ایک علمی نمائش بھی قایم ہوئی تھی اور اس نمائش میں سراکبر کا ایک قلمی نسخہ سنہ ۱۰۶۷ کا لکھا ہوا پیش ہوا تھا - جس کے خاتمہ پر کتاب کا نام اس طرح ثبت تھا " این ترجمہ اپنکھا ے ہر چہار بید کہ موسوم بہ سر اکبر ست وتمام نورالانوار محمد داراشکوہ در مدت شش ماہ آخر دوشنبہ بست وششم ماہ رمضان سنہ یکہزار و شصت و ہفت ہجری در منزل نکبود باتمام رسانید " — رسالہ الندوہ جلد سوم نمبر دوم بابت اپریل ۱۹۰۶ صفحہ ۱۵ —
۲۷۹	۲	۴	سامانی (مصنف کتاب الانساب) صحیح سمعانی ہے اور پورا نام یہ ہے - ابو سعد عبدالکریم بن منصورالسمعانی

صفحه	کالم	سطر	
			المروزی - سمعانی منسوب ھے سمعان سے اور سمعان بطن ھے قبیلہ تمیم کا (دول الاسلام امام ذھبی جلد دوم صفحہ ۵۴ مفتاح السعادہ جلد اول صفحہ ۲۱۱) —
۲۸۰	۲	۸	سبحانی (مشہور رباعی گو شاعر) صحیح سحابی ھے نجف کا باشندہ نہیں بلکہ استرآباد کا باشندہ ھے - نجف اشرف میں اس کی سکونت تھی — Rieu . Vol . II . pp . 272 .
۲۸۶	۱	۲۵	سرخوش کے تذکرہ شعرا کا نام کلمتہ الشعراء لکھا ھے - حالانکہ صحیح نام کلمات الشعراء ھے Rieu. Vol . 1 . 369
۲۹۲	۲	۱۸	سعدی شیرازی کے حالات میں ان کی دیوان ثالث کا نام قوانین لکھا ھے - حالانکہ صحیح نام خواتیم ھے (کلیات سعدی طبع بمبئی سنہ ۱۳۰۹ صفحہ ۳۷۳) —
۲۹۳	۱	۳	سکاکی کے حالات میں اس کی تصنیف کا نام مصباح العلوم لکھا ھے حالانکہ صحیح مفتاح العلوم ھے (مفتاح السعادہ جلد اول صفحہ ۱۸) —

خلفاے عباسیہ اور بہت سے علماے عرب کو اُن کے ناموں پر الف لام زیادہ کر کے حرف الف میں لکھا گیا ھے - جیسے البطنی - الراشد - الراضی - المامون - المتوکل المستعصم - المقدسی - المنصور وغیرہ یہ تریقہ صحیح نہیں - کیونکہ یہ الف لام اصلی نہیں ھے - ان تمام اسماء کو ان کے حروف اصلی میں لکھنا چاھئے - البطنی کو حرف بے میں الراضی کو حرف رے میں المامون و المنصور وغیرہ کو حرف میم میں علیٰ ھذا القیاس —

لیکن باوجود اس کے ھم قابل مولف کی محنت کی داد دئے بغیر نہیں رہ سکتے - اُردو میں اس قسم کی کتابیں شاذ ھیں جن سے طلبہ کو اپنے علمی مطالعہ میں مدد مل سکے - مولانا نظامی نے اس کتاب کی تالیف سے بلا شبہ اُردو زبان میں اضافہ کیا ھے - پہلی طبع میں اس نوع کی کتاب میں اس قسم کی فر و گزاشتوں کا ھونا معمولی بات ھے - اُمید ھے کہ دوسری طبع میں پورے طور سے صحت کر دی جائے گی —

کتاب مولف یا انجمن ترقی اُردو اورنگ آباد سے مل سکتی ھے —

(ھ - ق)

فہرست مخطوطات فارسی مخزونہ کتب خانہ ایشیاٹک سوسائٹی بنگال

Descriptive Catalouge of the Persion Manuscripts in the Collection of the Asiatic Society of Bengal, by Wladimir Ivanow, late Assistant keeper of the Mohammadan Mss., Asiatic museum, Russian Academy of Sciences. Calcutta, 1924 pp. xxxvll. 934. Rs. 42 - 8.

بنگال ایشیاٹک سوسائٹی کے کتب خانہ میں فارسی زبان کی جس قدر قلمی کتابیں ہیں ان کی یہ توضیحی فہرست ہے - اسے ایک روسی مستشرق ولد یمر ایوانو نے مرتب کیا ہے جو ایک عرصہ تک روس کی ایکادیمی آف سائنس کے ایشیاٹک میوزیم میں اسلامی کتابوں کے مددگار محافظ رہ چکے ہیں اور ادبیات اسلامیہ کی نسبت وسیع واقفیت رکھتے ہیں —

یہ فہرست ایسی جامع اور مکمل نہیں ہے جیسی کہ ریو' ایتھے وغیرہ متشرقین کی فہرستیں ہیں لیکن پھر بھی اس میں ایسی معلومات جمع ہیں کہ اُن کی وجہ سے ہم یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتے کہ اس کی اشاعت سے فارسی ببلیو گرافی میں ایک قابل قدر اضافہ ہوا ہے —

اس فہرست کی ترتیب و تدوین میں مولف نے بالکل ریو اور ایتھے کی فہرستوں کا اتباع کیا ہے اور ہر کتاب کے بیان میں بالالتزام امور ذیل کی پابندی کی ہے —

(۱) کتاب کا نام اور اُس کا عہد تصنیف

(۲) مصنف کا نام اور اُس کا سنہ وفات

(۳) اُس بادشاہ یا امیر کا نام جس کے نام پر یا عہد میں کتاب لکھی گئی ہے

(۴) کتاب کے ایڈیشن اور ترجموں کی کیفیت

(۵) مشرق و مغرب کی تاریخی کتابوں اور فہرستوں کے ریفرنس جن کی وجہ سے کتاب اور اُس کے مصنف کی نسبت مزید واقفیت حاصل کرنے میں رہنمائی ہوتی ہے اور اس بات کا پتہ چلتا ہے کہ یہ کتاب سوسائٹی کے علاوہ یورپ اور ہندوستان کے کون کون سے کتب خانوں میں موجود ہے —

اس کتاب کی ترتیب میں فاضل مولف نے کم و بیش چالیس کتابوں سے امداد

لی ھے اور جگہ جگہ ریو ایتھے فلوگل ' پرچ ' برون ' ڈورن ' پیزی وغیرہ مستشرقین کی ضخیم ضخیم تصنیفات کے حوالے دئے ھیں مثلاً

Rleu, Catalogue of the Persion
Mss . In the Brilish Museum.,
Ethe, Catalogue of the Persion
Mss . In the Library of the India office
Ethe, Neupersische Library,
Pertsch, Die Hands chriften
Verzeichnisse der Koniglichen
Bibliothek Zu Berlin.
Dorn, Catalogue des Manuscrits
et XylograPhe Orientanx de
La Bibliothegue Imperiale
Pnblique de ft . Petersbourg.
Brouin, Literary Histry
of Pessia.
,, Catalogue of the Persion
In the Library of the
University of Cambridge
Pizzi, Storia deua Poesia
Persiuna,
Borthold, Turkestane, at the
Mongol Jnvasion,

مطبوعات کی کیفیت مسٹر ایڈ ورڈس Edwards کی کتاب Catalogue of the Persion Printed Books In the British Museum .
سے ما خوذ ھے۔ سلاطین کے سنین حکومت استینلی لین پول S . Lane, Pool کی کتاب Muhammadan Dynasties سے نقل کئے ھیں۔

اس فہرست میں (۱۷۸۱) کتابوں کا تذکرہ ھے ۔ اور فنون کے اعتبار سے ان کی تقسیم اس طرح کی گئی ھے۔

تاریخ ۲۱۱ (1 - 211)

-:o:-

اس ذخیرہ میں جو کتابیں خاص اہمیت رکھنے والی ہیں اون کی تفصیل یہ ہے —

تاریخ

مجمل فصیحی (9 D 278 .) اس کو فصیحی خوانی نے سنہ ۸۴۵ ھجری میں مرتب کیا ھے - اس میں سنین کے تحت میں تاریخی واقعات جمع ھیں- نہایت نایاب و کمیاب کتاب ھے - اس کا ایک نسخہ بانکی پور کی اورنٹیل لائبری میں بھی موجود ھے —

مجمل مفصل (43 , D 275) سنہ ۱۰۶۵ ھجری کے قریب ھندوستان میں تصنیف ھوئی ھے-اس میں آغاز سال ھجری سے سنہ ۱۰۶۵ ھجری تک حالات جمع ھیں —

حدیقۃالصفا (45 , D 141 اس کو یوسف علی بن غلام علی نے سنہ ۱۱۷۳ ھ میں تصنیف کیا ھے-اس کے پہلے حصہ میں شاھان قدیم-خلفاے اسلام اور ان کے معاصر سلاطین عالم کے حالات ھیں دوسرے حصہ میں ھندوستان کے شاھان تیموریہ کا تذکرہ ھے - تیسرے حصے میں ھندوستان کے ان فرمان روا خاندانوں کی تاریخ تحریر ھے جو بنگالہ دکن گجرات سندہ مالوہ جون پور-کشمیر وغیرہ میں برسر حکومت رھے ھیں-خاتمہ دو حصوں پر منقسم ھے-پہلے حصے میں حکماء کے حالات ھین دوسرے میں شعرا اور صوفیہ وغیرہ کا تذکرہ ھے—

خلاصۃالاخبار (106 , D 154) اس کو محمد اسلم نے لکھا ھے-اس میں

امیر دوست محمد خاں کے کارنامے سنہ ۱۲۵۴ ہجری تک مذکور ہیں—

تاج المآثر (110 , D 34) سلاطین ہندوستان کی قدیم تاریخوں میں نہات نایاب کتاب ہے۔اس میں سلطان شہاب الدین محمد بن سام اور اس کے جانشین قطب الدین ایبک اور شمس الدین ایلتمش کے حالات ہیں—

تاریخی مراسلات

انشاء قاسم طوسی (350 , F . 9) اس سے سلاطین دکن اور شاہان ایرانی کے تعلقات کا پتہ چلتا ہے—

رقعات میر عبداللطیف (364 , F - 6) اس سے عہد جہانگیر اور شاہ جہاں کے سیاسی حالات معلوم ہوتے ہیں—

گلشن عجائب (392 , F - 40) اس میں مرزا فرخ سیر اور محمد شاہ کے مراسلات جمع ہیں—

تاریخی منظومات

تواریخ قطب شاہ (691 - D , 65 اس میں سلاطین قطب شاہیہ کے حالات ابتداء سے سنہ ۱۰۰۰ ہجری تک مذکور ہیں اور اسے ہیرا لعل خوش دل نے نظم کیا ہے—

انور نامہ (872 , N a , 7 - سنہ ۱۱۷۴ ہجری میں تصنیف ہوا ہے۔اس میں انور الدین خاں والی کرناٹک کے حالات ہیں—

نجیب نامہ (870 , N a, 86) اس کا دوسرا نام نامہ طرفہ ہے۔سنہ ۱۱۸۵ ھ تصنیف ہوا ہے۔اس میں نجیب الدولہ نواب نجیب خاں روہیلہ کے حالات میں مذکور ہیں—

ظفر نامہ 886 , N a , 87) اس میں عہد جنرل لیک (Lake) کے واقعات مذکور ہیں جو سنہ ۱۸۰۰ ع سے سنہ ۱۸۰۷ ع تک واقع ہوے ہیں—

شعرا اور صوفیہ کے تذکرے

مذکر الاحباب (219 , D 95) اسے میر بہاء الدین حسن نقیب الاشراف بخارانی نے سنہ ۹۷۴ ع میں مرتب کیا ہے۔نہایت نایاب اور قابل قدر تذکرہ ہے اس کی ۳۰۸ صفحات ہیں—

طبقات الصوفیہ (234 , D 232 یہ تذکرہ پیر ہرات شیخ الاسلام ابو اسمعیل عبداللہ بن محمد الانصاری المتوفی سنہ ۴۸۱ ہجری کی تصنیفات سے ہے اور دنیا کی نایاب کتابوں میں اس کا شمار ہوتا ہے—

ابو عبدالرحمن محمد بن حسین السلمی المتوفی سنہ ۴۱۲ ع سے عربی زبان

میں صوفیائے کرام کا ایک تذکرہ لکھاتھا (Brockel mann . Geschichte der Arabeischen littera Tur —

(V0l 1 . PP . 200)

خواجہ عبداللہ انصاری نے اپنے مجالس وعظ و تذکیر میں بزبان فارسی اس کا ترجمہ فرمایا-یہ ترجمہ ہرات کی قدیم زبان میں تھا-مولانا عبدالرحمن جامی نے اوسے مروجہ فارسی میں لکھا اور اس کا نام نفحات الانس من حضرات القدس رکھا—

گلزار ابرار (259 D. 262,) اسے محمد غوثی بن حسن بن موسی شطاری نے سنہ ۱۰۲۲ میں مرتب کیا ہے-ہندوستان اور خاص کر گجرات کے اولیا اللہ کا ایک ضخیم تذکرہ ہے —

شرایف عثمانی (277. D. 227,) مشاہیر بلگرام کا تذکر ہے-اسے غلام حسن صدیقی فرشوری بلگرامی نے تصنیف کیا ہے-اور اس کی تصنیف کی وجہ الفاظ ذیل میں بیان کی ہے—

> میر سید غلام علی متخلص بآزار ... بسبیل نسب نامہ جمع فرمودند و بے اطلاع ما مردم اکثر اقوال سماعی و قیاسی کہ معتمد علیہ نبودند درج نمودند و بعد چندی یوم بزیارت حرمین شریفین آز بلگرام براہ دکن سفر حجاز گردیدند ... الان بحسب آب خور درآن ملک (دکن) استقامت دارند و از انجا کتابی مسمی بماثرالکرام فی تاریخ بلگرام و نسخۂ سرد آزاد نام تالیف فرمودہ ببلگرام فرستادند-چوں بنظر جمعیؔ از فضلا و بعضے از روساے بلگرام گذشت بسبب آنکہ اکثر اقوال خلاف واقع تاریخ و اسناد و وثایق فرامین بودند ہر یک بزرگان بملاحظہ آن بگرداب حیرت در افتادند کہ ہر گاہ بنیان ایشاں سر تا سر خلاف واقع و مخالف اسناد و تواریخ سلف است بجز آنکہ ساقطہ از اعتبار است چہ تواں گفت قطع نظر بناے کتاب محتوی بر صدق و صواب می باید تا جماعتے خلق را دلیل یقینی باشد و معتمد علیہ گردد- (الخ)

دواوین

شعراے ذیل کے دوادین نہایت نایاب و کمیاب ھیں:-

ڈیوان قطرن بن منصور تبریزی المتوفی سنہ ۴۶۵ ھجری (408, Nb , 111)

دیوان مختاری، سراج الدین عثمان بن محمدالغزنوی المتوفی قریب سنہ ۵۴۴ ہجری (1753. M. 19)—

دیوان سوزنی، شمس الدین محمد بن علی النفسی المتوفی سنہ ۵۶۹ ہجری —(449. Nb, 71)

دیوان شرف الدین شفروہ محمدفضل‌اللہ الاصفہانی المتوفی ۶۰۰ ہجری 465. Nb. 13)

دیوان امامی-ابو عبداللہ محمد بن عثمان‌الہردی المتوفی سنہ ۶۶۷ ہجری —(489. Nb. 15)

کلیات عماد فقیہ- خواجہ عمادالدین کرمانی المتوفی سنہ ۷۷۳ ہجری —(583. Nd. 14.)

دیوان آذری-شیخ جلال‌الدین حمزہ بن علی البیہق المتوفی سنہ ۸۶۶ہجری --(606. Nb. 1,)

دیوان سہیلی-امیر نظام الدین احمد المتوفی سنہ ۹۰۷ ہجری وزیر سلطان حسین مرزا (643. Nb. 72,)—

دیوان عبیدی-عبداللہ خاں بن محمود خاں شیبانی والی ہرات (سنہ ۹۴۰ تا ۹۴۶) (1759. Oi, 14)—

دیوانی تقی اوحدی-تقی الدین یلبانی , 733. Nb. 29)—

صوفیانہ نظمیں

مثنویات مولانا جمالی دہلوی (648 N · 75. 143 ، اس مجموعہ میں ۲۷ مثنویاں ہیں منجملہ اون کے بعض نام یہ ہیں-مصباح الارواح-کنزالادقایق- تنبیہ العارفین-روح القدس-مفتاح الفقر-فاتح الابواب وغیرہ—

کتب دینیہ

امام ابوجعفر محمد بن جریرالطبری المتوفی سنہ ۳۱۰ کی تفسیر کبیر کا فارسی ترجمہ (955 A.i. 19) جس کو امیر منصور بن نوح سامانی (سنہ ۳۵۰-سنہ ۳۶۵) کے حکم سے علمائے بخاراو سمرقند وفرغانہ نے مرتب کیا ہے-نہایت نایاب اور نادر الوجود کتاب ہے-سوسائٹی میں اس کا مکمل نسخہ نہیں ہے-بلکہ درمیانی جلد ہے جس کے ۸۰۰ صفحات ہیں-اور اس میں سورۂ آل عمران سے سورۂ کہف تک پندرہ سوروں کی تفسیر ہے —

فن حرب

سوسائٹی کی نایاب ترین کتابوں میں "آداب الحرب والشجاعہ" (M. 160

1608. / ایک قابل ذکر کتاب ہے - یہ کتاب ۴۲۲ صفحات پر تمام ہوئی ہے - محمد بن منصور القرشی نے جو مبارک شاہ اور فخر مدبر کے لقب سے مشہور ہے اسے سلطان شمس الدین ایلتمش بادشاہ دہلی (سنہ ۶۰۷ ہجری سنہ ۶۳۳ ہجری) کے نام پر تصنیف کیا ہے - اس میں جنگ کے وہ آداب و قوانین مذکور ہیں جو ساتویں صدی کے مسلمانوں میں رائج تھے —

———:o:———

اس فہرست کی ترتیب و تدوین میں مولف سے متعدد مقامات پر غلطیاں ہو گئی ہیں مثلاً —

ترجمہ تاریخ طبری (No. 1)

اس کے متعلق لکھا ہے کہ ابوعلی محمد بن محمد بلعمی نے منصور بن نوح سامانی کے حکم سے سنہ ۳۵۲ میں ترجمہ کیا اور محمد بن عبدالملک الہمدانی نے اس میں مستظہر باللہ عباسی کے عہد خلافت تک حالات اضافہ کئے —

یہ سمجھنا کہ محمد بن عبدالملک ہمدانی المتوفی سنہ ۵۲۱ نے فارسی ترجمہ پر حالات اضافہ کئے ایک صریح غلطی ہے - اس میں شک نہیں کہ محمد بن عبدالملک سے تاریخ طبری کا تکملہ لکھا ہے لیکن وہ فارسی ترجمہ کا نہیں ہے بلکہ اصل عربی کتاب کا ہے اور ذیل طبری کہلاتا ہے اور حاجی خلیفہ نے بھی اس کا ذکر کشف الظنون میں کیا ہے —

تاج المآثر (No. 155)

اس کے مصنف کا نام حسن (صدرالدین محمد بن حسن) نظامی لکھا ہے اور ایلیٹ کی تاریخ میں بھی یہی نام ہے (Elliot History of India. Vol. 11 pp. 204) —

اس کتاب کو صدر الدین محمد کی تصنیف قرار دینا ایک اہم تاریخی غلطی ہے - حقیقت یہ ہے صدرالدین محمد تاج المآثر کے مصنف کا نام نہیں ہے بلکہ اس کے اصل نسخہ کے کاتب کا نام ہے اور اس نے کتاب پر ایک تقریظ لکھی ہے جو کتاب کے آخر میں بطور خاتمہ شامل ہے اور اس کا عنوان یہ ہے —

> " ذکر فصلی کہ ملک الافاضل والعلماء مولانا صدر الملۃ والحق ملا محمد بن محمد المحوبکی رحمۃ اللہ کہ نسخۂ اصل منتسخ منہ بخط اوست در مدح ایں کتاب و مولفش در آخر نسخۂ اصل نوشتہ است " —

اس تقریظ میں مصنف کتاب کا نام " نظام الحق والملۃ و الدین الحسن

النظامی النیشاپوری'' لکھا ہے-یہ حسن نظامی مشہور شاعر نظامی عروضی سمر قندی کا فرزند ہے جو ادب فارسی کی مشہور کتاب چہار مقالہ کا مصنف ہے (تاریخ گزیدہ-چھاپہ عکسی طبع لندن صفحہ ۸۲۶)—

جدول بادشاهان تیموری (No. 167.)

اس رسالہ کا صحیح نام "مجموعہ مرزا مہدی خاں صفوی'' ہے-یہ نام تاریخی ہے اور اس سے سنہ ۱۱۴۲ سن تالیف بر آمد ہوتا ہے—

احقر خاندان مصطفوی و اقصر دودمان مرتضوی ابوالفاخر نظام الدین محمد هادی الحسینی الصفوی الملقی به شاه مرزا و المخاطب به مرزا مهدی خاں صفوی از کتب سیر و سوانحی که بنظر رسیده بود بعد استخراج و استنباط بر نهج سطور ذیل ترسیم و ترقیم نمود و بالهام ملک مجید تاریخ اتمام این ارقام که رقم زده کلک تیره فام احقر انام است "مجموعه مرزا مهدی خاں صفوی'' موسوم گردید—

طلسمات خیال (No. 403.)

اس کے مصنف کا نام منشی نولکشور لکھا ہے-لیکن حقیقت میں یہ کتاب منشی کیول رام کی تصنیف ہے اور اس کے فرزند منشی نول کشور نے بعد اتمام اس پر خطبہ لکھا ہے اور اس خطبہ میں اس کی تاریخ تصنیف اس طرح بیان کی ہے—

بحمد الله که طبع قبله گاهی چه نیکو پایهٔ معنی بیفزود
پئے تاریخ سالش هاتف غیب طلسمات خیال وے بفرمود

(محبوب الاحباب فی تعریف الکتب و الکتاب طبع حیدر آباد صفحہ ۴۶۴)

تذکرۃ الامرا جو امراے دربار مغلیہ کا ایک ضخیم تذکرہ ہے-اسی منشی کیول رام کی تصنیفات سے ہے (Elliot. History of India, Vol. VIII, pp 192)

خمسہ نظامی (No. 466)

(۲) لیلے مجنون-اس کی نسبت لکھا ہے کہ یہ کتاب ابو المظفر شروان شاہ کے نام پر لکھی گئی ہے-لیکن یہ غلطی ہے-صحیح یہ ہے کہ مولانا نے اس کو اخستان شاہ کے نام پر لکھا ہے—

صاحب جهت جلال و تمکین یعنے که جلال دولت و دین
تاج ملکان ابوالمظفر زیبندهٔ ملک هفت کشور
شاه سخن اخستان که نامش مهر یست که مهر شد غلامش

اخستان جی کا پورا نام خاقان کبیر جلال الدین اخستان شاہ ہے

اور یہ فرزند اور جانشین ہے خاقان اعظم فخرالدین منو چہر شروان شاہ کا خاقانی شروانی نے ان دونوں بادشاہوں کی مدح میں متعدد قصاید لکھے ہیں جو اس کے دیوان میں موجود ہیں —

(۳) خسرو شرین-اس کتاب کا سن تصنیف سنہ ۵۷۶ لکھا ہے-اور اس تاریخ کے معین کرنے میں غالباً ایو کا اتباع کیا گیا ہے-لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس بارے میں ایو اور اس کے متبعین دونوں سے غلطی ہوگئی ہے-مولانا نظامی نے اس مثنوی کو اتا بک اعظم شمس الدین محمد جہان پہلوان بن ایلدگز کے زمانہ میں لکھنا شروع کیا اور اس کی وفات کے بعد اس کے برادر اور جانشین مظفر الدین قزل ارسلان کے عہد حکومت میں اختتام کو پہونچایا —

مولانا نظامی نے مثنوی کے اخیر حصہ میں اس کے اختتام محمد بن ایلدگز کی وفات اور قزل ارسلان کی قدر دانی کے مفصل حالات لکھے ہیں-جن کا محاصل یہ ہے کہ جب مثنوی تمام ہوئی تو قزل ارسلان سے مولانا کو دربار میں طلب کیا-خسرو شرین کے اشعار سن کر تحسین و آفرین کی اور کہا کہ آپ نے میرا نام ہمیشہ کے لئے زندہ کر دیا ہے-اور اس کا صلہ دینا میرا فرض ہے-اس کے بعد دریافت کیا کہ بھائی صاحب (محمد بن ایلدگز نے آپ کو دو گاؤں دینے کا ارادہ کیا تھا-وہ دیے یا نہیں-مولانا نے جواب دیا کہ شاہ سعید نے بیشک ایسا ارادہ کیا تھا-لیکن اس کے پورا ہونے سے پہلے ان کا انتقال ہوگیا-اس پر قزل ارسلان نے مولانا کو دو گاؤں عطا کئے -

بلے شاہ سعید از خاص خویشم پذیرفت انچہ فرمودی زپیشم

چوں رخت عمراو کشتی روان کرد مرا نے' جملہ عالم رازیاں کرد

جہاں پہلوان محمد بن ایلدگز کا سنہ ۵۸۱ ع میں انتقال ہوا ہے (دول الاسلام ذہبی طبع حیدرآباد جلد ثانی صفحہ ۹۷-حبیب السیر جلد دوم جز چہارم صفحہ ۱۲۶ اس اعتبار سے یہ مثنوی سنہ ۵۸۱ ع کے بعد تمام ہوئی ہے —

(۵) سکندر نامہ کی نسبت لکھا ہے کہ سنہ ۵۹۷ ھ کی تصنیف ہے اور اس کے بعد بیان کیا ہے کہ یہ کتاب دو حصوں میں منقسم ہے —

پہلے حصے (سکندر نامہ بری یا شرف نامہ اسکندری) کی نسبت لکھا ہے کہ اتابک نصرت الدین ابوبکر کے نام پر لکھا گیا ہے —

دوسرے حصے سکندر نامہ بحری یا خردنامہ اسکندری) کی نسبت لکھا ہے کہ سلطان عزالدین مسعود بن نورالدین ارسلان کے نام پر معنون ہے —

اس کتاب کی نسبت مولف سے دو غلطیاں ہوئی ہیں-اول یہ کہ دونوں

حصوں کو ایک ہی سنہ میں تصنیف ہونا بیان کیا ہے۔حالانکہ دونوں حصے دو مختلف سنین میں تصنیف ہوے ہیں۔پہلا حصہ سنہ ۵۹۷ ھ میں اور دوسرا سنہ ۵۹۹ ھ میں تمام ہوا ہے۔دوسرے حصے کی تاریخ تصنیف خاتمہ میں اس طرح مذکور ہے —

زھجرت چنان بردھم یاد گار   لوز نہ گذشتہ زپا نصد شمار

دوم یہ کہ حصہ دوم کو عزالدین مسعود کے نام سے منسوب کیا ہے۔حالانکہ یہ بادشاہ اس حصے کے تمام ہونے سے آٹھہ سال بعد سنہ ۶۰۷ ھ میں برسر حکومت ہوا ہے۔(دول‌الاسلام ذھبکی جلدثانی صفحہ ۸۴ و صفحہ ۸۵ تاریخ ابوالفدا۔ طبع قسطنطنیہ جلد ثالث صفحہ ۱۱۳)—

دیوان واقف (No. 877)

واقف کا نام نورالدین وطن پٹیالہ (Patyala) اور سال وفات سنہ ۱۲۰۰ م ۱۷۸۶ لکھا ہے جو غلط ہے —

واقف کا صحیح نام نورالعین وطن بٹالہ ہے اور سنہ ۱۱۹۵ هجری میں ان کا انتقال ہوا ہے (خزانہ عامرہ طبع کانپور صفحہ ۴۵ نتائج الافکار طبع مدراس صفحہ ۴۵۲)—

عروس عرفان (No. 1283)

اس کے مصنف کا نام اس طرح لکھا ہے " محمود بن باقر محمد پیشگی قادری " شیخ محمد باقر محمود بحری کے والد نہیں بلکہ مرشد ہیں۔قاضی محمود بحری نے سنہ ۱۱۱۱ هجری میں ایک مثنوی دکنی زبان میں " من لگن " کے نام سے لکھی ہے اور اس میں حمد و نعت کے بعد اپنے مرشد کے سجائد و مناقب بیان کئے ہیں اوراس کے ضمن میں ان کا نام محمد باقر لکھا ہے (من لگن طبع مدراس سنہ ۱۳۰۷ هجری صفحہ ۷)—

قاضی محمود بحری کے والد کا صحیح نام بحرالدین اور لقب قاضی دریا ہے۔(تاریخ اردوے قدیم صفحہ ۸۶)—

——:o:——

اکثر مشاہیر کے سنین وفات چھوڑ دیے ہیں حالانکہ وہ تاریخ و تراجم کی کتابوں میں آسانی کے ساتھہ مل سکتے ہیں اور چند سنین جو ہمیں یاد ہیں ذیل میں درج کرتے ہیں—

(6) حمداللہ مستوفی قزوینی سنہ ۷۶۶   منتظم ناصری در تحت سنہ ۷۶۶ صاحب تاریخ گزیدہ

(513) شاہ ولی محمد اکبرآبادی سنہ ۱۰۵۷ مخبر الواصلین
مشارح مثنوی مولانا روم

(733) نقی الدین اوحدی بلبانی سنہ ۱۰۳۰ صبح گلشن طبع بھوپال صفحہ ۸۸
صاحب تذکرۃ الشعراء

(737) محمد سعید اشرف مازندرانی سنہ ۱۱۱۶ نتائج الافکار صفحہ ۳۷
استاد زیب النساء بیگم

(909) علاء الدین وصالی سنہ ۹۹۸ نتائج الافکار صفحہ ۲۸۹
صاحب ترجیع بند (ما مقیمان)

(1117) ابو النصر فراهی صاحب سنہ ۵۷۹ منتظم ناصری در تخت سنہ ۵۷۹
نصاب الصبیان

(1131) ملا عبدالرشید تتوی سنہ ۱۰۷۷ خزانہ عامرہ صفحہ ۴۲۴
صاحب منتخب الغات و فرھنگ رشیدی

کتاب میں ان کے علاوہ اور بہت سی اغلاط و فرو گزاشتیں موجود ھیں-جن کی تصحیح اس مختصر سے مضمون میں غیر ممکن ھے - ھم امید کرتے ھیں کہ ارکان طبع ثانی میں ان کی اصلاح کر دیں گے—

(حکیم سید شمس اللہ قادری)

-:o:-

مقتل فریب مغربی معمل خانے

یہ ایک ۵۸ صفحہ کا چھوٹی تقطیع کا رسالہ ھے جس کے مصنف سید طالب علی صاحب طالب الہ آبادی ھیں' سائنس کی ترقی' نئے نئے آلات کی ایجاد اور زمانۂ جدید کے تجربے اور تحقیق کے ذوق نے اس میں شک نہیں کہ انسانی معلومات کے دائرے کو بہت وسیع کر دیا ھے اور اس سے ھمیں بہت سے فائدے بھی پہونچ چکے ھیں' لیکن دوسری طرف اختبار و تجربے کے شوق کا ایک ادنیٰ نتیجہ یہ ھے کہ آدمی محض اپنے ذوق تحقیق کی خاطر بے زبان جاندار مخلوق پر طرح طرح کے ظلم کرتا ھے اور ان کے جواز کے لئے یہ دلیل پیش کرتا ھے کہ ان باتوں سے اضافۂ علم مقصود ھے' یہ کتاب اسی "ظالمانہ شوق تشریح و تحقیق" کے خلاف ایک طرح کا احتجاج ھے' جناب مصنف نے علم تشریح الاعضا کو خاص طور پر ھدف ملامت بنایا ھے اور تجربے کے پردے میں بے زبان جانوروں پر جو مظالم ھوتے ھیں

انھیں اپنے مخصوص چبھتے ہوے انداز میں ظاہر کیا ھے، کتاب میں دس بڑے بڑے علوانات جیسے "قتل روح" "تجربات بے درد" کلب مفرور" گربہ مسکین" وغیرہ ھیں - ھر علوان کے تحت جراحی عمل کی مختلف قسموں کا بیان اور تجربوں کا حال ھے، یہ تجربے اکثر نا کامیاب ھوتے ھیں —

ھم اس موقع پر یہ بحث چھیڑنا نہیں چاھتے کہ جناب مصنف کا نقطۂ خیال خالص علمی انسانی اور اخلاقی حیثیت سے صحیح ھے یا غلط، لیکن یہ ھم ضرور کہیں گے کہ اس کتاب میں صرف تصویر کے ایک رخ کو بہت بڑھا چڑھا کر دکھایا گیا ھے، بے زبان جانوروں کا عامل کے تیز آلات کے نیچے تڑپ تڑپ کر جان دینا و قعی ایک پر اثر نظارہ ھے، لیکن انسانوں کا ایسے امراض کی وجہ سے ایڑیاں رگڑ رگڑ کر جان دینا جن کی تحقیق کافی طور پر نہیں ھوئی ھے، اس سے بھی زیادہ جگر خراش منظر ھو سکتا ھے ھندوستان میں جس رد عمل کی ابتدا جناب مصنف کی اس کتاب سے ھوتی ھے وہ انگلستان میں بہت پہلے شروع ھو چکا ھے - ورڈس ورتھ کے الفاظ سنئے —

فطرت کی کہانی تو سریلی ھے لیکن ھمارا ذھن دخل در معقولات کر کے اشیا کی حسین صورتوں کو بگاڑ دیتا ھے تشریح (چیر پھا -) کے شوق میں ھم قتل پر بھی اُتر اتے ھیں —

Sweet is the love which nature brings
Our meddling Intelleet
Mis shapes the beauteons forms of thing
We munder to lisseet

اس میں شک نہیں کہ یہ خیال قابل غور ھے لیکن یاد رکھنا چاھئے کہ جذبات کے علاوہ عقل کا بھی ھم پر آخر کچھہ حق تو ضرور ھے، اسے بھی جانے دیجئے تو پوری انسانی نسل کیا اتنے ایثار اور مستحسن ظلم کی بھی مستحق نہیں!

کتاب کی عبارت شروع سے آخر تک طنزیہ ھے اور الجھی ھوئی ھے، عجیب و غریب ترکیبوں کا استعمال کیا گیا ھے "ھم ایک دن بحیرۂ حیات کی حدیث طبیعیہ والی تہ تک پہونچ کر رھیں گے" "ثمردار ترقی" "سایۂ باز انداختۂ آئینۂ جذبات" "خوش صوت جملے" وغیرہ کہیں کہیں انگریزی الفاظ کا عجیب و غریب ترجمہ کیا گیا ھے Foxhound سگ روباہ شکار یا Labaratony کا معمل خانے حالانکہ اس کے لئے صرف لفظ "معمل" کافی تھا کہ اس میں خود ظرفیت موجود ھے "دورۂ مغزیہ" رگ قلبیہ، رگ حلقیہ نفسیہ وغیرہ خدا معلوم کن اصطلاحات کے ترجمے ھیں، اصل الفاظ دئے جاتے تو مقابلہ ممکن تھا —

کتاب معمولی کاغذ پر چھپی ہے الناظر پریس لکھنؤ سے چار آنہ میں مل سکتی ہے —

(و)

گوتم بدھ

اس مضمون میں منشی امیر احمد صاحب علوی بی اے نے ہندوستان کے سب سے بڑے اخلاقی رہنما کی مختصر سوانح عمری اور اسکی تعلیمات بیان کی ہیں - پہلے یہ الناظر لکھنؤ میں مسلسل شایع ہوتا رہا اور اب ایک دو جز کے رسالہ کی صورت میں علیحدہ طور پر الناظر پریس کی طرف سے شایع ہوا ہے ظاہر ہے کہ اس مختصر رسالے سے مہاتما بودھ کی سوانح نگاری کا فرض پوری طرح ادا نہیں ہوتا، اور نہ جناب مصنف نے اس کا دعویٰ کیا ہے، پھر بھی ان کی زندگی کے اہم واقعات سب کے سب اس میں آگئے ہیں، ولادت، ۲۹ سال کی عمر تک محل کی چار دیواری کے اندر رہنا، اتفاقاً آبادی کی طرف آن نکلنا اور انسانی مصائب کے نمونے دیکھنا، جوگ لینا، پھر سکون اور شانتی کی تلاش میں پھرنا، بودھی درخت کے نیچے عرفانی نور کا پرتو دیکھنا، ان سب چیزوں سے بحث کی گئی ہے، آخر میں اس کی تعلیمات کا نہایت مجمل بیان بھی ہے - کتاب کی عبارت بھی خاص طور پر دلچسپ ہے، اور چونکہ مضمون مختصر ہے اور نظر زیادہ گہری اور تاریخی نہیں ہے، اس لئے اس طرز کو شروع سے آخر تک خوب نباہا ہے، عام اردو داں حضرات اور مدارس کے طلبہ کے لئے اس کتاب کا مطالعہ فائدے سے خالی نہ ہوگا —

کاغذ معمولی اور لکھائی چھپائی غنیمت ہے الناظر پریس لکھنؤ سے ۴ آنہ میں مل سکتی ہے —

(و)

سرگزشت وزیرخاں لنکران

یہ ایک فارسی تمثیل ہے جس کے لکھنے والے مرزا جعفر قراجہ داغی ہیں - مرزائے موصوف شاہ کج کلاہ ایران فتح علی شاہ قاچار کے بھتیجے شہزادہ جلال الدین

مرزا کی سرکار میں ملازم تھے' شہزادہ کے ایما سے انہوں نے کئی ترکی تمثیلات کو ایرانی لباس پہنایا - جامعہ لکھنئو کے پروفیسر محمد عبدالقوی صاحب فانی ایم-اے نے ان کے اس ڈرامے کو اپنے اردو ترجمے کے ساتھ چھپوایا ھے ' اصل کے مقابل ترجمہ بھی دیا گیا ھے جو خاصہ سلیس اور عام فہم ھے ' کتاب کے شروع میں ۳۲ صفحات کا ایک مقدمہ بھی ھے جو ڈرامے کی تاریخ سے متعلق ھے اس میں مختلف قوموں کے ڈراموں کا تھوڑا بہت حال بھی لکھدیا ھے' چونکہ اس حصے کی حیثیت محض تقریبی ھے اس لئے فاضل مترجم اس جامع نہ بناسکے' بہرحال چونکہ اصل فارسی ڈرامہ جامعہ لکھنئو کے نصاب میں شریک ھے' اس لئے یہ مقدمہ ڈرامہ کی تقابل تاریخ کے لحاظ سے طلبا کے لئے ضرور مفید ھوگا —

اصل ڈرامہ کی زیادہ دلچسپ نہیں ھے' لیکن اس حیثیت سے کہ اس میں معاشرتی حالات سے بحث کی گئی ھے سبق آموز ضرور ھے' ویسے بھی فارسی ڈرامے باعتبار فن ابھی کچھہ زیادہ ترقی نہیں کی ھے' مستقر وطہ کا زمانہ تو ادب عالیہ کی اس صفت کچھہ ایک بھی ایسی مثال پیش نہیں کرسکتا جسے حقیقی معنوں میں ڈرامہ کہ سکیں کچھہ ترجمے البتہ قابل قدر ھیں جیسے انگریزی کے ھنری دی فورتھہ کا' یا فرانسیسی ڈرامہ نویس موتیر کے پسل L'emMalade Imaginnaire کا ترجمہ طبیب اخبار زیر تبصرہ ڈرامہ واقعہ نگاری کی حیثیت سے اچھا ھے' لیکن سیرت نگاری کے اعتبار سے کچھہ نہیں' ترجمہ کے علاوہ کتاب کے آخر میں بھی مشکل الفاظ کی ایک فرھنگ لگادی گئی ھے' جس سے یہہ ڈراما طلبا کے لئے کافی طور پر آسان اور مفید ھوگیا ھے ' اھل ذوق حضرات جنھیں فارسی ڈراموں کا رنگ دیکھنا ھو' اور طلبا جنھیں مصطلحات جدیدہ کے جاننے کی ضرورت ھو' اس کو ضرور مفید پایں گے' کتاب ۵ جزکی ھے' لکھائی ھے' چھپائی' کاغذ سب کچھہ اچھا ھے قیمت ایک روپیہ چارآنہ " آسی پریس - محمود نگر' لکھنئو " سے مل سکتی ھے —

(و)

:0:

شہاب کی سرگزشت

یہ افسانہ مولانا نیاز فتح پوری کی تازہ ترین تصنیف ھے' پہلے مسلسل ان کے رسالے نگار میں شایع ھوتا رھا' اور اب دفتر نگار کی طرف سے کتابی صورت میں شایع کیا گیا ھے —

افسوس ھے کہ اس افسانہ میں ھمیں پلاٹ کی کوئی ایسی خوبی نظر نہیں

آتی جس کی مولانا نیاز جیسے کہنہ مشق اہل قلم سے توقع ہو سکتی تھی - سوائے تقریروں یا خطوں کے اس کتاب میں کچھہ نہیں ہے ' اور اگر ان حصوں کو حذف کردیا جائے جو برائے نام ربط قائم رکھنے کے لئے جابجا داخل کردے گئے ہیں تو اس کو افسانہ کو شہاب کی سرگزشت کے بد لے " تین تعلیمیافتہ دوستوں کی مکالمت " کہا جاسکتا ہے —

اس افسانہ کے سرورق پر یہ لکھا ہوا دیکھکر کہ یہ اردو زبان کا پہلا افسانہ ہے جو تحلیل نفسی کے اصول پر لکھا گیا ہے " ہماوے شوق کی کوی حد نہ رہی تھی ' اس لئے کہ ہندوستان تو ایک طرف خود انگلستان ' حتیٰ کہ جرمنی اور آسٹریا میں بھی جو تحلیل نفسی (Psychoanalysis) کے مولد ہیں ' کسی نے اس اصول پر افسانہ نگاری کی ہمت نہیں کی ' لیکن تحلیل نفسی کے اصول تو درکنار ' ہمیں تو اس کتاب میں کوی خاص بات ایسی بھی نظر نہیں آئی کہ جس کی بنا پر اسے نفسیاتی افسانہ ہی (psychdogieal novels) کہا جا سکے ' اس تقریبی جملہ کو استعمال نہ کیا جاتا تو اچھا تھا ' ہم نے پوری کتاب کو شروع سے آخر تک پڑھا لیکن ہمیں تو اس میں کہیں بھی اشارۃ یا کنایتاً کی " تحت - شعوری یا غیر شعوری " کا شائبہ نظر نہ آیا —

کتاب میں شہاب کی سیرت کو عجیب و غریب انداز سے پیش کیا گیا ہے - وہ ایک فلسفی ہے' لیکن ایسا فلسفی کہ جس کی نظیر آج تک نہیں پیدا ہوئی اگر فلسفی کا تصور جناب مصنف کے ذہن میں یہ ہے کہ ہر وہ شخص جو مروجہ اصولوں کے خلاف عمل کرے ' اور مروجہ خیالات کی مخالفت کرے ' فلسفی ہے تو ممکن ہے کہ شہاب بھی فلسفی ہو ' ورنہ اگر انصاف سے دیکھا جائے تو اس کی ہر گفتگو بتلاتی ہے کہ وہ اس نو جوان گریجویٹ طبقہ کا ایک ذہین فرد ہے جو فلسفہ کی دو چار درسی کتابیں پڑھکر ہر چیز کو فلسفیانہ طرز میں بیان کرنے کی کوشش کرتا ہے اپنے مخاطبوں کے ہر قول کو اُلٹ دیتا ہے اور ہر رائج الوقت خیال یا رائے کی مخالفت کرتا ہے غرض سیرت نگاری میں مصنف کو زیادہ کامیابی نہیں ہوئی ہے —

افسانے کی زبان کے متعلق تو کچھہ کہنے سننے کی گنجائش ہی نہیں ہے ' صرف اتنا کہدینا کافی ہوگا کہ ہمارے ملک میں آے دن جو گوہرفشانیاں ادب لطیف کے نام سے کی جاتی ہیں' اس کا بہترین نمونہ ہے ' وہی الجھے ہوے ' عربی آمیز' انگزی نما جملے ' وہی غیرمانوس ترکیبیں ' چند مثالیں ملاحظہ ہوں —

" میں اپنی رائے محفوظ رکھتے ہوے پوچھتا ہوں اب یہ کس طرح ممکن ہے کہ میں شادی سے انکار کروں " —

"یہ صبح و شام اپنے صحیح فرائض زندگی کو بھول کر کھلنڈوں تک سلونے والیاں، یہ اپنے بے باک تبسموں، اپنی دلبر نگاہوں، اور اپنی جری و شوخ چتونوں سے دنیا کو مالوف کر لینے کی آرزو رکھتے ہوئے خود کسی سے محبت نہ کرسکنے والیاں"......

"تبسموں کی روشنی اور ہلکے ہلکے قہقوں کی آواز سے مضامین ایک موسیقیٔ درخشاں دوڑ رہی تھی"

"میری فرصت تمہیں مخاطب کرنے کے لئے، یا تمہاری کسی تحریر کا جواب دینے کے لئے بہت تنگ نظر آتی ہے"—

اس وقت ہا اپنی سفید ساری میں خاص محویت کے عالم میں سمندر کے اندر ہلکے ہلکے ہچکولے لینے والے جہازوں کو دیکھہ رہی تھی" ہم نے لفظ میں پر خط کھینچ دیا ہے، انگریزی میں In her white sari کہہ سکتے ہیں لیکن اس جملہ میں لفظ "جلوس" کی سخت ضرورت ہے ورنہ مظروف نہایت مضحکہ خیز ہو جاتا ہے'—
"جس وقت اس پر دوسرے دن کا آفتاب طلوع ہوا" یہ بھی انگریزی عبارت کی نقل ہے، اور کسم از کسم ہمیں خوش نہیں آتی- ایسی مثالیاں بے شمار ہیں- چند ترکیبیں ملاحظہ ہوں—
لرزۂ مسترحم، ارتعاش ملتجی، سیلاب خندہ، تابناک اضطراب'—
"سینہ کی مثلث عریانی جو بلاؤز کی تراش کا نتیجہ ہے "ملتہب تمنائیں"—

کاش فاضل مصنف اس حقیقت کو سمجھہ لیں کہ ٹیگور کے تصوفانہ گیتوں کے لئے جو زبان موزوں ہے وہ ہر جگہ بھلی نہیں ہوتی، اگر چندے یہی حالت رہی تو "ادب لطیف وہی" مسلم شکل اختیار کرلے گا جو فرانس میں مذہب پارناسیت (Parnassianism) نے اختیار کی تھی، اور خدا معلوم اس سے اردو کو کیا صدمہ پونچے-

ترسم نرسی بکعبہ اے اعرابی
سائیں رہ کہ تو میروی بہ ترکستان است

مولانا نیاز کی علمی قابلیت سے کسی کو انکار نہیں، کاش وہ اسے صحیح راستوں

پر لے لائیں- ندی کے زور کی طرح قلم کا زور بھی صرف رخ کے پھیر سے مضر یا مفید ہو جاتا ہے'—

کتاب معمولی کاغذ پر چھپی ہے' دفتر نگار بھوپال سے ۱ روپیہ میں مل سکتی ہے — (و)

———:o:———

تاریخ

اسلامی خلافت کارنامہ حصہ اول

مرتبہ مولانا محمد موسیٰ خاں صاحب رئیس دتاولی

اردو زبان میں جتنی تاریخی کتابیں لکھی گئی ہیں یا لکھی جاری ہیں ان میں بہت زیادہ خامیاں نظر آتی ہیں تحقیق سے بہت کم کام لیا جاتا ہے لیکن چند کتابیں ایسی ہیں جو معیار پر پوری اترتی ہیں ان کتابوں میں سے یہ ایک کتاب ہے جس میں موجودہ یوروپی مورخین کا رنگ اختیار کیا گیا ہے- مولف نے اپنی تالیف میں اسلام سے قبل دنیا کے مختلف مذاہب اوضاع و اخلاق پر مختصر بحث کی ہے اور ان کے مذہبی و اخلاقی عروج و زوال کو ظاہر کیا ہے کہیں کہیں نسل کے مسائل حل کرنے کی کوشش کی ہے اس بیان میں محنت و کاوش سے کام لیا گیا ہے مختلف انگریزی- عربی اور فارسی کتابوں کے حوالے دئیے ہیں جہاں کہیں واقعات مشتبہ ہیں ان میں تصدیق بھی طلب کی گئی ہے- مولف نے مختلف اسناد دیکر یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ اسلام سے پہلے تمام دنیا تاریکی و ظلمات سے گری ہوئی تھی- تہذیب بر آعظم قعر مذلت میں پڑے ہوے تھے اور راہ و راست سے بھٹک چکے تھے اس لئے انسان کی اصلاح کے لئے ایک رہبر کی ضرورت تھی- کتاب پر ایک گہری نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ فاضل مولف نے منشائے نظر ضرورت بنی قرار دیکر مختلف واقعات کو یکجا کیا ہے اور ان سب سے ایک ہی نتیجہ مرتب کرنے کی کوشش کی ہے- جو واقعات ان کے مقصد کے موافق ہیں وہ لے لئے گئے ہیں اور جو مخالف ہیں ان کو بالکل نظر انداز کیا گیا ہے' اور واقعات کی ترتیب غیر فطری اور غیر ارتقائی ہوگئی ہے—

دوسری تاریخوں میں ہمیں ایک نقص بہت عیاں نظر آتا ہے یعنی

قدیم تواریخ کے حوالے غلط دے جاتے ھیں فاضل مولف نے اس کتاب میں قدیم تاریخوں میں سے اکثر حوالے دے ھیں اور ان میں بیشتر درست ھیں لیکن کئی جگہہ غلطیاں کی ھیں جن میں سے ہم صرف چند پیش کرتے ھیں— ملاحظہ ھو

صفحہ ۱۵ "عیسوی صدی سے تقریباً دو ہزار برس پہلے جب کہ تمام یورپ کس مپرسی کی حالت میں پڑا ھوا تھا اس زمانے میں اس بر اعظم میں یونانی قوم کا ستارہ عروج پر تھا"—

حالانکہ واقعہ یہ ھے کہ یونانی تہذیب کی ابتدا تو سنہ ۷۵۳ ق م کے بعد ھوتی ھے جب انہوں نے (Theseus تھیس کی سرکردگی میں قریطش کی سیادت کا جوا اتار پھینکا تھا—

صفحہ ۳۵ "اندلس میں پہلے آئی بیری اور لگوائی اور اس کے بعد یہاں فینیقی آے اور پھر یونانی اور پھر قرطاجنی' یونانیوں نے ھسپانیہ پر کب قبضہ کیا تاریخ تو اس قبضہ کے متعلق بالکل خاموش ھے-یونان کا صرف ایک جرنیل اسکندر تھا (اسکندر اعظم کے عزیزوں میں سے تھا) جس نے جزیرہ صقلیہ کا رخ کیا تھا-وہ ھسپانیہ تک نہیں پہنچا—

صفحہ ۸۷ "کارتھیجیا یا قرطاجنہ کی قدیم سلطنت جو افریقہ میں تھی اس کے رھنے والے لوگ بھی حسام ھی کی نسل میں ھوں گے جو اس افریقہ کی پرانی عظیم الشان سلطنت کے بانی تھے—"

قرطاجنہ کی تاریخ تو بالکل صاف ھے اس سلطنت کی بنیاد اس فینیقی امیر جماعت نے ڈالی تھی جو صور [Tyre] کی عموی تحریک سے بھاگ کر افریقہ کو چلی آئی تھی اس لئے قرطاجنی سامی نسل میں سے ھیں کیونکہ فینیقی بھی بابل کے قریبی علاقوں میں سے آئے تھے—

فاضل مولف نے ایران کے افسانوں کو بالکل تاریخ کی حیثیت دی ھے- فردوسی کا شاھنامہ تاریخی واقعات کی بیخ و بنیاد نہیں قرار دیا جاسکتا ھے—

صفحہ ۱۲۴ ساکیامنی کی پیدائش کی تاریخ سنہ ۶۸۸ ق م مقرر کی گئی ھے اور تاریخ وفات سنہ ۵۵۰ ق م مقرر کی ھے حالانکہ جدید تاریخی تحقیق سے یہ امر پایہ ثبوت کو پہنچ چکا ھے کہ بدھ کی تاریخ پیدائش سنہ ۵۶۸ ق م ھے اور تاریخ وفات ۴۸۸ ق م ھے-یہ تاریخیں غالباً مہاویر کے متعلق ھوں لیکن تاریخ پیدائش پھر بھی غلط ھوگی—

صفحہ ۱۵۰ "پانچویں صدی قبل مسیح میں اس ظالم جابر اور مشرک سلطنت (بابل تہذیب ثانی) کا ایرانیوں کے ھاتھ سے ھمیشہ کے لئے خاتمہ

ہو گیا"—

بابل کا شہر سنہ ۵۳۸ ق م میں کیخسرو کے ہاتھوں فتح ہوا نہ کہ پانچویں صدی میں—

صفحہ ۱۵۴ "یمن کے بادشاہ ابرہہ الاشرم نے ہاتھیوں کی فوج لے کر مکہ مکرمہ پر خانۂ کعبہ کو ڈھا دینے کی غرض سے چڑھائی کی تھی"—

ابرہہ یمن کا بادشاہ نہ تھا بلکہ نجاشی کی طرف سے حاکم یمن تھا جس نے پہلے حاکم ارياط کو قتل کرکے نجاشی سے وہاں کی حکومت کا پروانہ حاصل کیا تھا—

صفحہ ۱۶۵ "سنہ ۷۰ ق م میں یونانیوں نے حملہ کرکے اس جدید یہودی سلطنت کو نیست و نابود کر دیا"—

اس وقت یونانیوں میں کونسی قوت موجود تھی جو وہ بیت المقدس پر حملہ کرتے۔ سلا اور اس کے بعد پامپی نے سنہ ۷۸ ق م سے قبل ہی ان کی سلطنت کا تریب تریب خاتمہ کر دیا تھا۔ متھری ڈیٹس [Mithridates] باقی رہ گیا تھا اس کا بھی چند ہی سالوں میں خاتمہ ہوگیا—

کہیں کہیں مولف نے جغرافئی غلطیاں کی ہیں' ملاحظہ ہو

صفحہ ۱۴۸ "عرب کے شمال میں آبنائے سویز۔ جنوب میں دریائے فرات"—

اگر یہ ہے تو کیا شداد کے زمانے میں صفا اور عدن اسی دریا پر آباد کئے گئے تھے؟—

ایک جگہ انوکھا نظریہ قایم کیا ہے اور اس میں کوئی دلیل یا سند پیش نہیں کی—

صفحہ ۱۰ "لا مذہب اصول کے لوگ اخلاقی یا کسی انتظامی قانون کی پابندی کے واسطے اپنے کو مجبور خیال نہیں کرتے تھے"—

اس سے غالباً مولف کے نشانہ ملامت ایپی کیورین ہیں یہ لوگ فی الحقیقت ایسے نہیں تھے جیسا کہ ان کو بیان کیا گیا ہے۔ ایپی کیورس کا فلسفہ یقیناً دہریت کی تعلیم دیتا تھا لیکن اخلاق کے متعلق اس نے نہایت سخت فلسفہ قائم کیا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ انسان کی سب کوششوں کا مطمح نظر راحت ہے اور اسی مطلب کے لئے تمام نیکی عمل میں آتی ہے۔ نیز اس کا قول ہے کہ ہمیں شہوانی لذتوں سے بچ کر حقیقی مسرت کے لئے کوشش کرنی چاہئے—

کتاب میں نقائص ضرور ہیں لیکن پھر بھی موجودہ اسلامی تاریخوں کے مقابلے میں اس کی حیثیت بہت ارفع و اعلی ہے اور اس میں ہمیں مستند تاریخ کا

رنگ نظر آتا ھے - مولف اس ترتیب کے لئے مستحق مبارک باد ھیں —

چھپائی عمدہ ھے کاغذ اچھا ھے - کتاب مذکور محمدی پریس علی گڑہ سے ایک روپیہ آٹھہ آنہ میں مل سکتی ھے —

(ا)

—:o:—

ثانی اثنین، ذوالنورین، ابوالحسنین

یہ مولانا محمد عبدالحلیم صاحب شرر کے تین لکچر ھیں جو انھوں نے لکھنؤ میں ایک منتخب مجمع کے سامنے پڑھے تھے - پہلے لکچر میں حضرت ابوبکر صدیق دوسرے میں حضرت عثمان غنی اور تیسرے میں حضرت علی کے حالات ھیں تاریخی حیثیت سے یہ لکچر خاص وقعت رکھتے ھیں - اُس زمانے کے حالات اور واقعات بہت وضاحت، صفائی اور تاریخی تنقید کے ساتھہ بیان کئے گئے ھیں - جس تاریخ کا لگاؤ مذھب سے آ پڑتا ھے وھاں مورخ کو بڑی دشواری پیش آتی ھے - اکثر ایسا ھوتا ھے کہ ذاتی خیالات یا عام تعصبات کی وجہ سے حالات و واقعات کو یا تو اصلی حالت میں بے لاگ طریقہ سے نہیں دکھایا جاتا یا ان کی توجیہ یا تاویل کرنی پڑتی ھے - مولانا شرر کے یہ لکچر اس سے بالکل پاک ھیں - صحابۂ رسول اللہ اور خصوصاً خلفاے راشدہ اُن نفوس میں سے ھیں جن کے کارنامے دنیا میں ھمیشہ عزت و احترام سے دیکھے جائیں گے - لیکن آخر وہ انسان تھے اور اس لئے مورخ کو ان کے حالات اسی نظر سے دیکھنے چاھئیں - مولانا شرر نے نہایت صفائی اور آزادی سے واقعات کی تنقیح کی ھے اور اپنی راے کے اظہار میں کہیں تامل نہیں کیا ھے - اگرچہ یہ رسالے حجم میں کچھہ زیادہ نہیں لیکن ان کے پڑھنے سے ایسی بصیرت ھوتی ھے جو بڑی بڑی کتابوں کے مطالعہ سے نہیں ھوتی - اس قسم کی تحریریں ملک کے لئے نہایت مفید ھیں - ان سے لوگ بہت سے حالات و واقعات پر آسانی سے عبور کر سکتے ھیں اور بہت سی غلط فہمیاں رفع ھو جاتی ھیں - جو صاحب آنحضرت (صلعم) کے بعد کے حالات پڑھنا چاھتے ھیں اور خلفاے راشدہ کی سیرت اور اُن کے واقعات سے دلچسپی رکھتے ھیں انھیں یہ لکچر ضرور مطالعہ کرنے چاھئیں - ھمیں یقین ھے کہ اِن سے اُنھیں ضرور فائدہ ھوگا —

-:o:-

سیر الصحابہ

مسلمانوں کے لئے یہ کچھ کم موجب فخر نہیں ہے کہ انہوں نے تاریخ نویسی میں وہ رتبہ حاصل کیا جو اس سے پہلے دنیا کی کسی قوم کو حاصل نہ تھا۔ انہوں نے تاریخ کو فسانے کے دائرہ سے نکال کر فن کی حیثیت تک پہنچا دیا۔ اسلام کے پہلے ہی دور میں مذہبی تحفظ کے خیال سے روایات کی تحقیق، راویوں کی تنقید، تنقید کے اصول مرتب ہوے۔ رجال حدیث کے حالات قلم بند کئے گئے۔ تصنیفات و تالیفات کے دور اور طبقے قائم ہوے۔ غرض اس طرح فن رجال و اسانید کے دفتر تیار ہو گئے جس کی روشنی میں ہر مورخ تاریخ نگاری کا صحیح راستہ تلاش کر سکتا ہے اور اسلامی سیرۃ نگار جو ائمہ خلفاء یا مشاہیر اسلام کی سیرت لکھنی چاہتا ہو اس کے لئے تو یہ سڑک بالکل خس و خاشاک سے پاک ہے —

مولانا سعید انصاری نے جو اس کتاب کے مصنف ہیں اردو میں تمام صحابہ کی سیرت اور ان کے حالات لکھنے کا بیڑہ اُٹھایا ہے جو حقیقت میں بڑا کام ہے یہ کتاب اس کی پہلی قسط ہے۔ اس میں پہلے ایک مقدمہ ہے۔ مقدمہ میں اُن جلیل القدر فقہاے صحابہ، تابعین اور تبع تابعین کا ذکر ہے جن کے ذریعہ سے علوم نبوی کی نشر و اشاعت ہوئی اور جو روایات اسلامی کی مستحکم عمارت کے لئے بمنزلہ سنگ بنیاد اور فن رجال و اسانید کے لئے ایک سر چشمہ کی حیثیت رکھتے ہیں۔ پھر مصنفین سیر و تاریخ محدثین اور ان کی تصنیفوں پر کچھ تنقید کی ہے اُسی سلسلہ میں ایک عنوان "کتب رجال کے نقایص" کا قایم کر کے لکھا ہے کہ "اسلام کا اصل الاصول قرآن مجید، عمل متواتر، احادیث صحیحہ اور اجماع صحابہ ہے لیکن رجال کی کتابوں میں متعدد روایتیں اُن کے خلاف ملتی ہیں" "اور اکثر مصنفین نے تو جرح و نقد کی زحمت بھی گوارا نہیں کی" ہم کو حیرت ہے کہ کتب رجال جن کی غایت محض جرح و تعدیل ہے ان میں اس قسم کی روایتوں کا کیونکر دخل ہو سکتا ہے۔ اچھی بری روایتوں کا میدان تو حدیث کی کتابیں ہیں۔ تعجب ہے کہ کتب رجال اور کتب حدیث کا فرق و امتیاز پیش نظر نہ رکھا گیا۔ بہر حال لایق مصنف نے پہلا نقص نص قرآنی کی مخالفت کا بیان کیا ہے جس سے اُصولاً کسی کو اختلاف نہیں ہو سکتا لیکن اس کے نظائر میں جو سماع موتی، آنحضرت کی امیت، نکاح، متعہ وغیرہ کی روایتوں کو پیش کیا ہے اس میں بہت کچھ کلام کی گنجایش ہے اس لئے کہ اُن میں باہمی توفیق و تطبیق بآسانی ممکن ہے۔ اسی تصادم کے سلسلہ میں مصنف نے قرأت، خلف الامام اور

رفع یدین کی حدیثوں پر لمبی چوڑی بحث کر کے صحیح بخاری اور دیگر صحاح کے راویوں پر لے دے کرنے میں پوری طاقت صرف کر دی ہے۔ ہماری رائے میں ایک سورۃ کی کتاب ایسے اخلاقی مسائل اور اُلجھاؤ کی بحثوں سے بالکل علیحدہ رہنی چاہئے۔ روایت اور درایت کی بحث میں مصنفین نے محدثین کے بیان کئے ہوئے اصول بتا کر لکھا ہے کہ "محدثین نے بے شبہ ان اصول سے احادیث کے نقد میں کام لیا ہے لیکن ان ہی لوگوں نے اسماء الرجال کی کتابوں میں ان کو ہاتھ بھی نہیں لگایا اس کا یہ اثر ہوا کہ آج کتب رجال میں جو بے سر و پا باتیں ملتی ہیں وہ اسی غلطی کا نتیجہ ہیں"۔

اگر یہ صحیح ہے تو بظاہر ان جملوں کا مفہوم اور کیا ہوسکتا ہے کہ رجال کی کتابیں جو روایات کے پرکھنے کا واحد ذریعہ ہیں، بے اعتباری کی آگ میں جھونک دی جائیں۔

اسی ضمن میں مصنف نے روایتوں پر حکومت کے اثرات، کا سلسلہ چھیڑ دیا ہے اور نظیر میں واقعہ حرہ کی روایت کو پیش کرکے مجاہد پر جو دور اول کے مشہور مفسر ہیں محض اس لئے کہ اُن کے قلم سے اہل مدینہ کے متعلق لمداهنتهم کا لفظ نکل گیا ہے، یہ طعن کیا ہے کہ "یزید کی سیہ کاریوں کی داد دینے کا طریقہ اس سے بہتر کیا ہوسکتا ہے کہ تمام صحابہ، تابعین اور تبع تابعین کو مداہن کہا جائے"۔

مجاہد کے اصل الفاظ یہ ہیں وبعث یزید الی اهل المدینة عشرین الفاً فاباحوا المدینة ثلاثا یصنعون ماشاء والمداهنتهم۔

ہماری رائے میں تو مجاہد نے کوئی بیجا بات نہیں کہی۔ اگر سیاسی امور میں مدینہ والے مداہنت اختیار نہ کرتے اور ابتدا ہی سے جس چیز کے وہ دل سے مخالف تھے اس کے لئے کچھ بھی ہاتھ پانوں ہلاتے تو کیا عجب تھا کہ سیاست کی بساط پر کوئی ایسی چال پیدا ہوجاتی کہ یوں بنی ہاشم کو شہ مات نہ ہوتی اور اسلام کے اتنے مہرے جلد اور آسانی سے نہ پٹتے اور اشراف مدینہ پر یہ مصیبت نہ آتی۔ علاوہ اس کے مجاہد کے لفظ "لمداهنتهم" کا دامن اس قدر دراز کیوں ہوگیا جس کے لپیٹ میں تمام صحابہ، تابعین اور تبع تابعین آگئے۔

اس کے بعد اسی تیر کا نشانہ حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ کو بنایا ہے۔ لکھتے ہیں کہ "حسن بصری ربیع بن زیاد والئی خراسان کے دفتر میں کام کرچکے تھے جو امیر معویہ کا نائب تھا اِس لئے اِس نمک خواری کا اثر دیکھو کہ وہ محمد بن ابی بکر کو فاسق بن ابی بکر کے نام سے یاد کیا کرتے تھے" پھر لکھتے ہیں کہ "جانتے ہو؟ یہ

فاسق کون تھا ؟ محمد بن ابو بکر جو رسول اللہ کے صحابی ' حضرت ابوبکر کے فرزند اور حضرت علی کے آغوش پروردہ تھے - حضرت علی ان کی مدح کرتے اور فضیلت دیتے تھے ''—

بے شبہ وہ ابوبکر کے بیٹے ' اور شاید وہ مولانا کی تحقیق جدید کی رو سے صحابی بھی ہوں مگر کیا یہ ممکن نہیں ہے کہ حسن بصری رح کے خیال میں وہ اپنے مشہور عمل غیر صالح اور نالایق کر توتوں کی وجہ سے اہل ابی بکر نہیں بلکہ اہل فسق میں شمار ہونے کے مستحق ہوں - ہمارے خیال میں تو اگر سرے ہی سے اس روایت ہی کو بے اصل ٹھیرا دیا جاے تو بہت اچھا ہو کیوں کہ صوفیانہ درایت کے لحاظ سے ہم کیوں کر صحیح سمجھیں کہ حضرت حسن بصری نے اپنے پیر و مرشد خاتم الولایت مولانا علی علیہ السلام کے ممدوح اور آغوش پروردہ کی نسبت ایسا لفظ زبان سے نکالا ہوگا - حقیقت یہ ہے کہ مشاجرات صحابہ اور تابعین میں اس قسم کے ظن و تخمین سے کام لے کر جادہ اعتدال پر قائم رہنا بہت کٹھن اور دشوار ہے —

روایت بالمعنی کی بحث میں آپ لکھتے ہیں کہ '' حضرت عایشہ ' ابوہریرہ ' عبداللہ بن عباس ' ابوسعید خدری ' جابر ' عبداللہ بن عمر ' عمرو بن العاص روایت باللفظ نہ کرتے تھے بلکہ صرف مطلب ادا کیا کرتے تھے '' - اس التزام کے ثبوت میں اِن حضرات کے اقرار وقبال کا حوالہ پیش کرنا ضروری تھا —

مقدمہ کے بعد مصنف نے مہاجرین اولین کے کچھ مناقب ' قرآن وحدیث سے بیان کرکے شیخین کی سیرت لکھنی شروع کر دی ہے اور چونکہ مصنف کا خیال ہے کہ تاریخ کی کتابیں ماخذ کے لحاظ سے زیادہ بلند رتبہ نہیں ہوتیں اور صحابہ کے حالات تاریخ سے زیادہ احادیث میں موجود ہیں اور صحت کے اعتبار سے پایہ بھی احادیث کا تاریخ سے بڑھا ہوا ہے اس لئے مصنف نے احادیث صحیحہ کو پیش نظر رکھا ہے اور سب سے زیادہ مستند کتاب ' صحیح بخاری سے واقعات زیادہ تر انتخاب کئے ہیں اور اصل موضوع کے لحاظ سے یہی ایک خصوصیت ' اس کتاب کے صحت و اعتبار کے لئے کافی ضمانت ہے —

(منظور)

———:o:———

تاریخ القرآن

اس کتاب کے مصنف مولوی مفتی عبداللطیف صاحب رحمانی نے بڑی جانکاہی اور محنت شاقہ اُٹھاکر ان شکوک و شبہات کو رفع کرنے کی کوشش کی ہے جو بعض

رطب ویابس احادیث اور آثار کی بنا پر قرآن مجید کے محفوظ ہونے کے متعلق پیدا ہوے یا ہوسکتے ہیں' مثلاً اس قسم کی روائتیں کہ " قرآن آنحضرت صلعم کی زندگی میں کتابی طریقہ پر ایک جا جمع نہیں ہوا تھا' خلیفہ اول نے جمع کرایا —
یا یہ کہ " قرآن کی بعض سورتیں بہت بڑی تھیں وہ مختصر کرادی گئیں یا یہ کہ خلیفہ اول کے عہد میں بعض آیتیں لکھنے سے رہ گئیں تھیں خلیفہ سوم کے وقت میں لکھی گئیں " یا یہ کہ ,, قرآن کی آخری دو سورتیں یعنی معوذتین عبداللہ بن مسعود کے نزدیک قرآن میں داخل نہیں یا یہ کہ قرآن کی موجودہ ترتیب ابی ابن کعب اور حضرت علی کے قرآن کی ترتیب کے خلاف ہے" —
لایق مصنف نے ان تمام احادیث و آثار پر بحیثیت روایت و درایت بحث و تنقید کر کے انکو ساقط الاعتبار قرار دیا ہے اور اُن کے مقابلے میں وہ صحیح روایتیں اور محققانہ اقوال پیش کئے ہیں اور اُن تمام گرد و پیش کے حالات کو پیش نظر رکھکر یہ ثابت کردیا ہے کہ عہد نبوی ہی میں قرآن نے بحیثیت کلام الہی اور دستورالعمل اسلام ہونے کے ہر مسلمان کے قلب و دماغ میں جگہ کرلی تھی' ہر زبان پر اُس کا ذکر تھا- نمازوں میں اس کی قرآت اور اوراد میں اس کی تلاوت تھی' نماز کی امامت میں اس کی شرط تھی- فوجی عہدوں کے تقرر میں خاص طور پر اس کا لحاظ کیا جاتا تھا- عہد نبوت میں نہ صرف قرآن کے حافظ ہی بہت سے تھے بلکہ ایسے صحابہ بھی موجود تھے جنھوں نے پورے قرآن کو ایک جا لکھا اور جمع کیا جیسے ابوالدرداء' ابی بن کعب' معاذ بن جبل' زید بن ثابت' عبادہ بن صامت وغیرہ —
مصنف نے یہ بھی ثابت کیا ہے کہ اس زمانہ میں سامان کتابت وغیرہ بھی موجود تھا' اُس وقت بجاے موجودہ کاغذ کے حریر اور باریک جھلی پر کتابت ہوتی تھی- لکھنے والوں کی بھی اسوقت میں کمی نہ تھی چنانچہ صرف قریش میں (۱۷) کاتب تھے اور آنحضرت صلعم نے مدینہ میں چونکہ باضابطہ کتابت کی تعلیم کا انتظام فرمایا تھا بہت سے لوگ لکھنا سیکھہ گئے تھے- ان لوگوں میں جن سے پیغمبر صاحب وحی وغیرہ کے لکھنے پڑھنے کا کام لیتے تھے ان کی تعداد (۲۴) تھی- بہر حال مصنف نے اس بات کو بخوبی ثابت کر دیا کہ قرآن مجید قرن اول میں اوراق و صحایف پر تمام وکمال لکھا اور جمع کیا گیا اور اُس کے نشر و اشاعت میں روز افزوں اضافہ ہوتا رہا یہاں تک کہ عہد عمری میں ہزارہا نسخے قرآن مجید کے لوگوں کے پاس موجود تھے —

پس قرآن کے اس تواتر اور توارث عملی کے مقابلہ میں کوئی خبر واحد خواہ وہ کتنی ہی صحیح کیوں نہ ہو کسی طرح قابل لحاظ اور لایق اعتبار

نہیں ہوسکتی''—

اس رسالہ میں کتابت کی بعض غلطیاں ایسی رہگئی ہیں جن سے کہیں کہیں مطلب خبط ہوجاتا ہے—

(منظور)

———:O:———

متفرق

— —:O:———

مینا بازار

یہ مولانا محمد عبدالحلیم صاحب شرر کا نیا تاریخی ناول ہے۔مولانا کے اکثر ناول تاریخی ہیں اور ان سے اردو داں طبقے میں تاریخ کا عجیب شوق پیدا ہوگیا ہے۔اگرچہ اس ناول سے مولانا شرر کے کمال کا اندازہ نہیں ہوسکتا لیکن مینا بازار کا جو نقشہ انہوں نے کھینچا ہے وہ پڑھنے کے قابل ہے—

دلگداز پریس لکھنؤ سے ایک روپیہ میں مل سکتا ہے --

———:O:———

تفریح دل

حاجی خطیب قادر بادشاہ صاحب المتخلص بہ بادشاہ مرحوم رئیس وانمباڑی (علاقہ مدراس) نے اپنی فرصت کے وقت میں کچھہ لطائف مختلف قسم کے جمع کئے تھے وہ اب ان کے فرزند خطیب محمد عبدالرشید صاحب نے ایک رسالے کی صورت میں طبع کرکے شائع کرادئے ہیں۔دل بہلانے کی اچھی چیز ہے۔مگر کوئی خاص بات نہیں۔قیمت ۶ آنہ خطیب محمد عبدالرشید نمبر۷۸ گودون اسٹریٹ مدراس سے مل سکتی ہے—

———: O :———

سراج المنیر (حصۂ چہارم)

یہ حافظ مظہرالدین احمد صدیقی سندیلوی منیر' بیرسٹر ایٹ لا کے اردو اور فارسی کلام کا مجموعہ ہے۔اس میں نعتیہ' صوفیانہ اور عاشقانہ سب قسم کی نظمیں

ہیں- کلام صاف ستھرا ہے اور حضرت ماہر کی طبیعت میں لگاؤ اور سوز ہے- معلوم ہوتا ہے کہ اس سے قبل ان کے کلام کے تین حصے شایع ہوچکے ہیں' یہ چوتھا حصہ ہے- سید محمد عبدالوحید رضوی منصرم ریاست سروھی (راجپوتانہ) سے آٹھہ آنے میں مل سکتا ہے—

بہارستان

سدرشن صاحب کے قصے اور ناول اس سے پہلے ملک میں شایع اور مقبول ہوچکے ہیں- اور ان میں سے بعض پر اس رسالے میں تبصرہ بھی ہو چکا ہے- یہ ان کی کہانیوں کا نیا مجموعہ ہے- جس میں پندرہ چھوٹے چھوٹے قصے اور ایک مختصر ڈراما ہے سدرشن صاحب کو مختصر قصے لکھنے کا بہت ہی اچھا سلیقہ ہے- اس مجموعے میں بعض قصے بہت پر درد اور دلچسپ ہیں- اور ان میں قابل مولف نے انسانی فطرت کے بعض راز اس خوبی سے بیان کئے ہیں کہ پڑھ کر جی خوش ہوتا ہے- انہوں نے صرف دلچسپی اور تفریح ہی کا سامان جمع نہیں کیا بلکہ ان کے مطالعہ سے اخلاقی سبق بھی حاصل ہوتے ہیں- ہمیں اس بات کی خوشی ہے کہ سدرشن صاحب اپنے فن میں ترقی کر رہے ہیں اور اپنے قلم سے ملک کو فائدہ پہنچا رہے ہیں- اس فن میں انہوں نے ملک کے نامور قصہ نویس منشی پریم چند کی تقلید کی ہے جنہوں نے بہارستان پر ایک مختصر دیباچہ لکھا ہے—

کتاب مجلد چھوٹی تقطیع پر ۳۲۷ صفحے کی ہے- قیمت ایک روپیہ چودہ آنے ہے رام کتھا بک ڈپو' لاہور سے مل سکتی ہے—

———:0:———

سفر نامۂ مظہری

یہ حاجی مظہرعلیم انصاری مرحوم کا سفرنامہ ہے جو اُن کے بڑے بھائی مولوی محمد حلیم صاحب انصاری نے اپنے عزیز بھائی کی وفات کے بعد اُن کے روز نامچوں وغیرہ سے مرتب کرکے شایع کیا ہے—

مرحوم کی زندگی عجیب و غریب تھی- ہمیشہ چلتے پھرتے اور کام کرتے گذری- دل میں سیاحت اور آزادی کی امنگ تھی، ایک جگہ بیٹھہ کر پابندی کے ساتھہ کام کرنے سے طبیعت اکتاتی تھی- اس لئے چند روز ملازمت کرکے اسے ترک کردیا تجارت کی طرف توجہ کی- ایسی تجارت نہیں کہ جسمیں دکان جماکر بیٹھنا

بڑے بانکہ مال لیکر شہر شہر پھرتے اور نیادانہ نھاپانی کھاتے پیتے اور کاروبار کرتے چلے جاتے تھے - لیکن ایک مدت بعد یہ مشغلہ بھی چھوٹ گیا، اور رسالہ مخزن میں ملازمت کی - یہاں بھی اُن سے زیادہ تر چلنے پھرنے ہی کا کام متعلق تھا - مخزن کو ان کی وجہ سے بڑی رونق ہوئی اور اس رسالہ کی مقبولیت اور عروج میں مرحوم کا بھی حصہ ہے - اس کے بعد مرحوم آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے سفیر ہوگئے اور کچھ عرصہ کے بعد انجمن ترقی اردو کے سفارت اختیار کی یہ میدان اُن کے لئے بہت وسیع تھا - خوب کام کیا - ہرملش اور ہر قماش کے شخصوں سے ملنے کا اتفاق ہوا - ہرملت اور ہرقوم کے لوگوں سے صحبت رہی - یہی وجہ تھی کہ وہ مردم شناس بھی تھے اور زمانہ شناس بھی - بعض ایسے ایسے لوگوں سے انھوں نے قومی کاموں کے لئے چندے وصول کئے جو آن کو جان پر اور جان کو مال پر قربان کردیتے ہیں - وہ بہت بے تکلف زندہ دل اور بے لاگ آدمی تھے - جہاں جاتے لوگوں کو اپنا گرویدہ کرلیتے اور اس لئے ان کے احباب کا حلقہ بہت وسیع تھا - اس سفرنامے میں جہاں جہاں وہ پہنچے ہیں اور جس جس سے ملے ہیں سب کا حال بے کم و کاست بیاں کردیا ہے - ہرمقام کے آثار قدیمہ، تاریخی حالات معاشرت، جن جن سے ملاقات ہوئی ہے اُن کی سیرت، مختصر مگر بہت سلیقے سے بیان کی ہے - جولوگ قومی کام کرنا چاہتے ہیں، یا جو ہندوستان کی سیاحت اس غرض سے کرنا چاہتے ہیں کہ وہ اپنے ملک کو صحیح طور سے سمجھیں، یا جو چاہتے ہیں کہ ایک سرگرم قومی سفیر کا کارنامہ پڑھیں تو انہیں یہ کتاب ضرور پڑھنی چاہئے --

(کتاب مولوی محمد حلیم صاحب انصاری ناظم دینیات مسلم ہوسٹل یونیورسٹی الہ آباد سے دو روپیہ آٹھ آنے میں ملسکتی ہے - صفحات ۲۴۶ مجلد -)

اردو کے جدید رسالے

-:o:———

نورس

جس طرح غلے اور میوے کی فصل ہوتی ہے یا شادیوں کا خاص موسم ہوتا ہے اسی طرح کتابوں کی بکری اور رسالوں کی اشاعت بھی فصلی ہونے لگی ہے -

گزشتہ دو سال سے اردو زبان میں رسالوں کی ایسی بوچھاڑ ہونی شروع ہوئی ہے کہ ہرمہینے کوئی نہ کوئی نیا رسالہ نکل آتا ہے۔ اگرچہ بڑھتی ہوئی تعداد دیکھہ کر جی خوش ہوتا ہے لیکن ساتھہ ہی اُن کی ناپائیداری سے دل کڑھتا بھی ہے۔ اب حال یہ ہے کہ جہاں کسی کو لکھنے پڑھنے کا شوق ہوا تو سب سے پہلے رسالہ نکالنے کا خیال آتا ہے۔ پڑھنے والے کم اور اخبار اور رسالہ روز افزوں۔ نتیجہ یہ ہے کہ بہت کم زمانے کے ہاتھوں پنپنے پاتے ہیں اور سارا روپیہ، محنت اور جد و جہد رائگاں جاتی ہے اور اس کا اثر اُن رسالوں پر بھی پڑتا ہے جن کی بقا ملک کے لئے ضروری ہے لیکن ایڈیٹری کی ہوس مجبور کردیتی ہے اور ابتدا میں اس جوش کا روکنا ایسا ہی مشکل ہے جیسے چڑھتے ہوے دریا کا۔اس کا نشہ دولت اور حکومت کے نشے سے بھی کہیں بڑھ کر ہے۔ جسے اس کا چسکا پڑ جاتا ہے پھر وہ کسی طرح چھڑائے نہیں چھوٹتا۔بعض اڈیٹر (جن میں سے بعض سے ہم ذاتی طور پر واقف ہیں) ایسے ہیں کہ وہ دنیا کی ہر شے ترک کرنے پر آمادہ ہیں، مگر نہیں ترک کر سکتے تو رسالہ۔ البتہ ایسے رسالے جو کسی خاص مقصد سے نکلتے ہیں اور ملک یاکسی جماعت یا خاص حصۂ ملک کی حقیقی خدمت انجام دے رہے ہیں اُن کا جاری رکھنا لازم ہے—

رسالہ نورس جو حال ہی میں اورنگ آباد کالج سے شایع ہوا ہے ایک خاص مقصد مد نظر رکھتا ہے۔اس کی غایت کالج کے طلبہ میں انشا پردازی اور ادب کا ذوق پیدا کرنا ہے۔ چنانچہ اس پہلے نمبر میں زیادہ تر مضامین طلبہ ہی کے لکھے ہوے ہیں۔ کالج کی عمر ابھی دو سال کی ہے اور اس لئے یہ نام بہت موزوں ہے اور اس کا مقصد قابل تحسین ہے۔ کالج میں پڑھ کر ہر شخص عالم و فاضل نہیں ہوسکتا، لیکن ایک تعلیم یافتہ شخص کے لئے یہ ضرور ہے کہ وہ اپنے مافی الضمیر کو شایستہ طریقے سے ادا کرسکے۔ اگر اس رسالے سے یہ مقصد حاصل ہوگیا تو سمجھنا چاہئے کہ اس نے اپنا فرض ادا کردیا۔شروع میں علمی خبریں ہیں جن کا جاننا طالب علموں کے لئے بہت ضروری ہے۔مضامین بھی دلچسپ اور مفید ہیں۔ آخر میں کالج کا ذکر ہے اور اس کے مختلف شعبوں میں جو کچھہ ہو رہا ہے اس کی تفصیل درج ہے طلبہ کے لئے یہ بہت اچھی چیز ہے۔ ہمیں امید ہے کہ کالج کے پروفیسر اور طلبہ اس کی ترقی میں کوشش کریں گے اور اس کا ہر نمبر پہلے سے اچھا ہوگا—

انجمن ترقی اردو کے مطابع میں ٹائپ میں بہت صاف ستھرا چھپا ہے رسالہ دو ماہی ہے اور سالانہ قیمت تین روپیہ—

:o:

قوس قزح

یہ بھی ایک نیا ماھواری رسالہ ھے جو محمد وحید گیلانی صاحب کی ادارت میں لاھور سے شایع ھوا ھے۔اردو میں نئے نئے رسالے اس کثرت سے نکل رھے ھیں کہ اڈیٹر کو اپنے رسالے کی تمہید یا مقصد بیان کرنے میں بڑی مشکل پیش آتی ھے اور یہ معلوم ھوتا ھے جیسے کوئی اپنے قصور کی معذرت کرتا ھے یا خجالت رفع کرنے کے لئے کچھ کہنا چاھتا ھے۔مگر ھمیں اڈیٹر صاحب قوس قزح کا یہ ابتدائی جملہ بہت پسند آیا ''جس حالت میں ملک میں ھفتہ وار، پندرہ روزہ اور ماھوار رسالے اس کثرت سے نکل رھے ھیں، مجھ سے گمنام شخص کا ایک اور رسالہ جاری کردینا بالکل بے حقیقت معلوم ھوتا ھے اور سوائے اس کے کہ یہ سمجھ لیا جائے کہ مجھے کوئی مفاد مد نظر ھو اور کیا ھو سکتا ھے ؟ لیکن میں کہتا ھوں کہ یونہی سہی ''مرگ انبوہ جشنے دارد'' آپ بھی سمجھ لیں کہ جو مطمح نظر دوسرے رسائل کا ھوتا ھے وھی قوس قزح کا ھے''—

لیکن یہ جملہ عام بد گمانی کی وجہ سے قلم سے نکل گیا ھے ورنہ اُن کا ارادہ بہت بلند ھے ''میرا عزم با لجزم ھے کہ قوس قزح میں ایسے نرالے، حیرت انگیز اور دلچسپ مضامین درج ھوا کریں گے جو کم سے کم پنجاب کے اور کسی اردو رسالے میں شایع نہیں ھوتے'' یہ محض دعویٰ ھی نہیں بلکہ اس مقصد کے پورا کرنے میں انھوں نے ایک حد تک کوشش بھی کی ھے۔شروع میں دنیا کے عجائبات اور دلچسپ معلومات کے تحت میں بہت سی کام کی اور دلچسپ باتیں جمع کر دی ھیں۔ افسانے بھی درج کئے گئے ھیں۔ظرافت کی چاشنی بھی دی گئی ھے لیتھو کی چند تصویریں بھی ھیں۔لکھائی چھپائی بھی اچھی ھے اور تا امکاں رسالے کو دلکش بنانے میں اھتمام کیا گیا ھے۔تاھم اس کے بعد بھی یہ سوال باقی رھتا ھے کہ کیا اس کے لئے درحقیقت کسی نئے رسالے کے جاری کرنے کی ضرورت تھی ؟—

سب سے نئی اور انوکھی بات یہ ھے کہ ''قوس قزح بفضلہ تعالیٰ مضامین کے بارہ میں اردو رسائل یا اجرتی مضامین کا محتاج نہیں، اس کے پاس اپنا ذخیرہ مضامین کا اس قدر ھے کہ انشاءاللہ کبھی ختم ھونے میں نہیں آئیگا''۔یہ بے نیازی اور ھمت ھر طرح قابل تعریف ھے۔سالانہ چندہ کی مقدار رسالے میں کہیں نظر نہیں پڑی—

———:o:———

حسن خیال

مشاعرہ ایک بہت دلچسپ صحبت ہوتی ہے - شاید اس کا وجود ہندوستان کے سوا کسی ملک میں نہیں - ان صحبتوں کی وجہ سے اردو شعر و سخن کو بہت فروغ ہوا' لوگوں کو زبان کی طرف توجہ ہوی اور تنقید کلام میں طرح طرح کی موشگافیاں کی گئیں - لیکن یہ ذوق لفظی تنقید سے آگے نہ بڑھا - مشاعرہ کا میدان ہمیشہ غزل تک محدود رہا اور اس تقلید میں کبھی اسے وسعت دینے کا خیال نہ ہوا البتہ ایک زمانے میں کرنل ہالرائڈ کے زیر ہدایت لاہور میں ایک مشاعرہ قائم ہوا تھا جسمیں بجاے مصرعۂ طرح کے نظم کے لئے کوی مضمون تجویز کیا جاتا تھا - چنانچہ مولانا حالی کی بعض بے مثل نظمیں اُس زمانے کی یادگار ہیں - بہر حال یہ صحبتیں اوستادوں کے زور سخن اور مبتدیوں کی مشق کے لئے خوب ہیں اور ہمارے زندہ دل شعرا کی بدولت اب تک قائم ہیں - کچھ عرصے سے ایک ایسا ہی مشاعرہ اورنگ آباد میں بھی قائم ہوا ہے اور اسی کی ایک صحبت میں جو کلام پڑھا گیا تھا اس کا انتخاب "حسن خیال" کے نام سے شایع کیا گیا ہے - یہ خوشی کی بات ہے کہ اس دور افتادہ اور اُجڑے شہر میں ابھی ایسے لوگ موجود ہیں جن کا کلام پڑھنے کے قابل ہے - سکرتری صاحب نے توقع دلای ہے کہ اگر یہ مشاعرہ مستقل طور سے قائم ہوگیا تو یہ رسالہ ماہانہ کردیا جائیگا - ہمیں امید ہے کہ مولوی محمد حسین صاحب محوی جنھوں نے یہ شوق پیدا کیا ہے اور دوسرے احباب مثلاً حضرات اثر و انیس و شمیم وغیرہ اسے کامیاب بنانے میں ضرور کوشش کریں گے —

الناظر کا انعامی مضمون

اڈیٹر صاحب الناظر نے ہمیں اپنے پرچے کے انعامی مضمون پر ریویو کرنے پر توجہ دلائی تھی' لیکن ہم نے تبصرہ سے عمداً احتراز کیا کیوں کہ یہ بحث ایسی نہیں جو چند سطروں میں طے ہو جاے - مگر اڈیٹر صاحب نے اس کے بعد خط کے ذریعہ سے تبصرہ کی فرمائش کی - لہذا تعمیل ارشاد میں ہم ایک سرسری نظر اس مضمون پر ڈالتے ہیں —

مضمون کا خلاصہ یہ ہے کہ آزاد کی اُردو شاعرانہ' نذیر احمد کی عامیانہ اور سوقیانہ اور حالی کی روکھی پھیکی ہے - اُردو میں اگر کوئی اعلیٰ ادیب اور انشا پرداز ہوا ہے تو وہ شبلی ہے - ظاہر ہے کہ ایسا فیصلہ بالغ نظر ادیبوں

کی نظر میں کیا وقعت رکھہ سکتا ہے —

علاوہ ادبی تنقید کے مضمون نگار نے مولانا نذیر احمد مرحوم کے حق میں سخت ناانصافی کی ہے - وہ شبلی کو علامہ، حالی کو مولانا، محمد حسین آزاد کو پروفیسر، (یہ بھی غنیمت) لکھتے ہیں - لیکن نذیر احمد کو ہر موقع پر ڈپٹی نذیر احمد لکھتے ہیں - جو شخص عربی کا اتنا بڑا جید عالم ہو، جس نے قرآن کا بے مثل ترجمہ کیا ہو اور اُصول و اخلاق اسلام پر اعلیٰ درجہ کی کتابیں لکھی ہوں وہ اتنا بھی حق نہیں رکھتا کہ اس کے نام کے ساتھہ مولوی یا مولانا کا لفظ لکھا جاے - حالانکہ فرنگی محل، ندوہ اور جامعۂ ملیہ کے معمولی طالب علموں کے ناموں کے ساتھہ بھی مولوی اور مولانا کے لفظ لکھے جاتے ہیں - ہم خوب جانتے ہیں کہ یہ لفظ عمداً لکھا گیا ہے اور اس سے لکھنے والے کی نفس کی کیفیت اور اس کی نیت کا پتہ چلتا ہے - ایسے شخص سے کسی صحیح تنقید کی توقع رکھنا عبث ہے - مولانا شبلی زندہ ہوتے تو اُن سے بڑہ کر کوئی اس پر نفریں نہ کرتا —

آج کل یہ عام دستور ہو گیا ہے کہ لوگ فصاحت و بلاغت، معنی و بیان، لفظ و محاورہ، ادب و انشا کے متعلق ادھر اُدھر سے چن کر اچھی خاصی باتیں لکھہ جاتے ہیں لیکن موقع و محل کو نہیں دیکھتے - وہ سمجھتے ہیں کہ اِن اُصول کو بیان کر کے اُن کے تحت میں جو لکھہ دیا وہ جائز ہے - اگر صحیح ذوق نہیں ہے تو اصول کچھہ کام نہیں آتے - یہ حقیقت ہمیں اس مضمون میں جگہ جگہ نظر آئی —

مولانا آزاد کی نثر کے نمونے دربار اکبری سے نقل کر کے لکھے گئے ہیں - حالانکہ معلوم ہے کہ اس میں بہت کچھہ تصرف کیا گیا ہے اور مولانا حالی کی تصانیف میں تو بقول مضمون نگار "بلند اور پر زور عبارت ملنی مشکل ہے" - جب آدمی کو بات کہنے کا سلیقہ نہیں ہوتا تو وہ چیخ پکار اور شور غل سے کام لیتا ہے - یہی بعض انشاپرداز کرتے ہیں اور خیال کیا جاتا ہے کہ وہ بہت بلند اور پر زور عبارت لکھتے ہیں - مولانا حالی جس طرح الفاظ کا صحیح اور برجا استعمال کرتے ہیں اور واقعات اور کیفیات بیان کرنے میں جیسا انہیں ڈھب آتا ہے اور جس طرح انہوں نے بیسیوں ٹھیٹ اُردو کے لفظوں کو رواج دیا ہے اور بر موقع استعمال کیا ہے اس کی نظیر ہماری انشا پردازی میں نہیں ملتی - ہمارے ایک فاضل بزرگ جو عربی فارسی اُردو انگریزی اور فرنچ میں اعلیٰ دستگاہ رکھتے ہیں اور اُن کا ادبی ذوق مسلم ہے، وہ فرماتے تھے کہ ہماری زبانوں میں نثر تھی ہی نہیں مولانا حالی پہلے شخص ہیں جنہوں نے متین اور پاکیزہ نثر لکھی - مگر الناظر کے مضمون نگار کی نظروں میں اُن کی نثر "بلا کی پھیکی اور بے مزہ" ہے —

قابل مضمون نگار نے جو بعض نمونے مولانا شبلی مرحوم کی تصانیف سے انتخاب کر کے لکھے ہیں اُن سے اندازہ ہوتا ہے کہ اُن کے ذہن میں " بلند اور پر زور " عبارت کا کیا مفہوم ہے مثلاً

" ایک طرف نود سالہ پیر ضعیف ہے جس کو دعا ہائے سحر کے بعد خاندان نبوت کا چشم و چراغ عطا ہوا تھا، جس کو وہ تمام دنیا سے زیادہ محبوب رکھتا تھا - اب اسی محبوب کے قتل کے لئے اس کی آستینیں چڑہ چکی ہیں اور ہاتھ میں چھری ہے "—

اس عبارت کو پڑہ کر اُردو کے ادنیٰ ناتک نظر کے سامنے پھر جاتے ہیں—

" اگر اس پہاڑ میں سخت سردی نہ ہوتی تو یہ غار بڑے بڑے اژدر اور موذی جانوروں کے دارالسلطنۃ ہوتے " دارالسلطنۃ کا لفظ یہاں کس قدر موزوں ہے !—

شاید یہی چیزیں قابل مضمون نگار کی زبان میں " اختراعات فائقہ " ہیں—

مضمون نگار صاحب ہلا ہوا، نواڑے، پٹخ پٹخ کر، کو متروک سمجھتے ہیں اور کھلنا، جھپٹنا، بکٹٹ، تھوُر، کو پڑھنے اور سننے والوں کے لئے گرانی اور ناگواری کا جب خیال فرماتے ہیں - اُن کے خیال میں چھڑ خانی، پھٹکنا، لتاڑ، چھدا رکھنا، تتو تھمو، تلپٹ، اولو، پتکھا پن اور اسی قسم کے دوسرے لفظ عامیانہ اور سوقیانہ اور ادبی مذاق کے لئے سخت ناگوار ہیں - انہیں یہ یاد رکھنا چاہئے کہ ہر لفظ ایک خاص حیثیت رکھتا ہے اور اس کی خوبی اور برائی کا انحصار استعمال کرنے والے کے ذوق پر ہے - لفظ بذاتہ نہ بھلا ہے نہ برا - ایک اچھے سے اچھے لفظ کا بے موقع استعمال اسے ناگوار اور برا بنا دیتا ہے اور ایک معمولی اور عامیانہ لفظ کا صحیح اور بر محل استعمال عبارت میں خاص شان پیدا کر دیتا ہے - متروکات کے متعلق مناسب ہوگا کہ وہ جناب پنڈت برجموہن دتا تریہ صاحب کیفی کا مضمون مطالعہ فرمائیں جو اسی رسالہ میں درج ہے —

قابل مضمون نگار نے بار بار اپنے مضمون میں " عام بول چال " عامیانہ اور سوقیانہ کا لفظ استعمال کیا ہے اور عام لوگوں کی بول چال کا ذکر بڑی حقارت سے کرتے ہیں - معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے زبان کتابوں سے سیکھی ہے - جو لوگ کتابوں سے زبان سیکھتے ہیں وہ زندہ زبان کی حقیقت سے ناواقف ہوتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ اصل زبان یہی ہے اور یہی رہے گی - مولانا شبلی مرحوم کا بھی یہی حال تھا - وہ دوسروں کے مقلد ہیں اور سب سے بڑے مقلد مولانا حالی کے - خاص کر سوانح

نویسی اور ادبی تنقید انہوں نے حالی ہی سے سیکھی ہے اور زبان میں آزاد، حالی اور نذیر احمد سے خوشہ چینی کی ہے۔یہی وجہ ہے کہ وہ اپنی نثر میں کوئی خصوصیت پیدا نہ کر سکے —

یہاں اس کے متعلق بحث کی زیادہ گنجائش نہیں، لیکن مختصر طور پر اس قدر عرض کرنا بیجا نہ ہوگا کہ عام یا عامیانہ بول چال کو حقارت سے دیکھنا ایک عالمانہ خود پسندی اور بے تہی کی علامت ہے۔یہی عام بول چال زبان کا سرچشمۂ قوت ہے جس سے وہ ہر وقت غذا اور تقویت حاصل کرتی رہتی ہے۔زبان کو عام انسانی معاشرت اور حالات سے دوش بدوش رہنا ضرور ہے۔ایسی صورت میں لازم ہے کہ وہ عوام کی بول چال سے فیض حاصل کرتی رہے، ورنہ وہ مردہ ہوجائے گی۔ ہندوستان کی اکثر زبانوں کا یہی حشر ہوا۔جب نحویوں نے اپنے قواعد و ضوابط کے جکڑ بند سے انہیں مقید کرنا شروع کیا اور وہ کتابوں میں محدود ہوگئیں تو اسی وقت سے ان میں انحطاط پیدا ہونے لگا اور کچھہ دنوں میں مردہ ہوکے رہ گئیں۔عام بول چال زندہ زبان کے لئے بمنزلہ دل کے ہے جس سے ہر وقت اُسے خون پہنچتا رہتا ہے اور جس وقت یہ رسد بند ہوجاتی ہے تو زبان سوکھنی شروع ہوجاتی ہے اور کتابوں کے اوراق میں بند ہوکے رہ جاتی ہے۔تمام دنیا کی زبانیں جو مردہ کہلاتی ہیں اسی طرح مردہ ہوئیں۔کیا ہم اردو کو ابھی سے محدود، مفلوج اور مردہ کرنا چاہتے ہیں؟

میں آخر میں مولانا نذیر احمد کی ایک عبارت نقل کرتا ہوں جو مضمون نگار صاحب نے اپنے مضمون میں لکھی ہے۔اُس کے آخر میں اُن کی رائے لکھوں گا۔اس سے اُن کی ادبی ذوق اور تنقید کی حقیقت معلوم ہوجائے گی —

"ادھر تو نصوح اور سلیم دونو باپ بیٹوں میں یہ گفتگو ہو رہی تھی، اُدھر اتنی ہی دیر میں فہمیدہ اور بڑی بیٹی نعیمہ میں خاصی ایک جھوڑ ہوگئی۔نعیمہ اس وقت دو برس کی بیاہی ہوئی تھی۔پانچ مہینے کا پہلونٹی کا لڑکا گود میں تھا۔ ناز و نعمت میں پلی، نانی کی چہیتی، ما کی لاڈو، مزاج کچھہ تو قدرتی تیز، باپ کے لاڈ پیار سے وہی کہاوت ہے، کریلا اور نیم چڑھا اور بھی چڑچڑا ہوگیا تھا۔ ساس نندوں میں بھلا اُس مزاج کی عورت کا کیوں گزر ہونے لگا تھا۔گھونگھٹ کے ساتھہ منہ کھلا اور منہ کا کھلنا تھا کہ سسرال کا آنا جانا بند ہوگیا۔اب چھہ چھہ مہینے سے ما کے گھر بیٹھی ہوئی تھی مگر رسی جلی پر بل نہ گیا۔باوجودیکہ اجڑی ہوئی میکے پڑی تھی، مزاج میں وہی طنطنہ تھا، کوار پنے ہی میں سوا گز کی زبان تھی۔کچھہ یوں ہی سا لحاظ بڑی بوڑھیوں کا تھا، سو بیاہے سے ان کو بھی

دھتکار بتائی - بھتا جلے پیچھے تو اور بھی کھل کھیلی ' مردوں کا لحاظ اٹھا دیا - فہمیدہ نے میاں کے روبرو بیٹھیں کا بھڑا اٹھاتے تو اٹھا لیالیکن نعیمہ کے تصور سے بدن پر رونگٹے کھڑے ہوجاتے ہیں اور جی ہی جی میں کہتی تھی کہ ذرا بھی اس بھڑوں کے چھتے کو چھیڑوں گی تو میرا سر مونڈ کر بھی بس نہ کرے گی "—

اس پاک صاف ستھری عبارت کے متعلق مضمون نگار صاحب کی یہ رائے ہے کہ " اس زبان کے بولنے سمجھنے کا پورا پورا لطف تو گزشتہ صدی میں دلی کے بعض محلے اور کوچے ہی کے لوگ اٹھا سکتے تھے " اس سے بڑھ کرنا انصافی اور بد مذاقی ہو نہیں سکتی - ہم نے یہ عبارت کئی بار پڑھی مگر ایک لفظ بھی ایسا نہ ملا جو اس وقت نہ بولا جاتا ہو یا ٹکسال باہر ہو - اس سے بہتر زبان اس موقع کے لئے ہو نہیں ہو سکتی - ہر جملہ موتیوں کی لڑی معلوم ہوتا ہے - اگر لائق مضمون نگار اُن الفاظ اور جملوں کی جگہہ جنہیں وہ قابل اعتراض سمجھتے ہیں دوسرے الفاظ اور جملے رکھہ کر دیکھتے تو انہیں اپنی تنقید کی ساری حقیقت معلوم ہو جاتی - مولانا نذیر احمد اور مولانا حالی کا بڑا احسان اردو زبان پر یہ ہے کہ انہوں نے ٹھیٹ اردو کے ایسے الفاظ اور محاورات جو صرف بول چال میں زبانوں پر تھے ' ادبی زبان میں داخل کردئے - ان سے زبان کی رونق دو بالا ہوگئی اور مطالب کے ادا کرنے میں خاص لطف پیدا ہوگیا - یہ بڑی جرأت کا کام تھا اور اُن کی یہ جرأت ' بہت ہی قابل تحسین ہے ' ورنہ خود پسند اور بے تہ انشا پردازوں کے ڈر سے جو بد قسمتی سے اپنے آپ کو ادیب بھی سمجھتے ہیں ہر شخص یہ جرأت نہیں کرسکتا - آج ان دونوں بزرگوں کی بدولت سیکڑوں نئے پر معنی اور پر مغز لفظ اور محاورے ہمارے ادب میں آ گئے ہیں جو اب ہر انشا پرداز استعمال کرتا ہے اور تو اور مولانا شبلی کی تصانیف ان الفاظ اور محاوروں سے بھری پڑی ہے جو اُنہیں ان دو حضرات کی بدولت حاصل ہوے ہیں—

بہر حال یہ مضمون ایک طالب علمانہ مشق کی حیثیت سے بہت اچھا ہے اور اڈیٹر صاحب الناظر کا جو اصل مقصد تھا ' یعنی رسالہ کا اشتہار ' وہ بھی اس سے حاصل ہوگیا ہے —

رسالہ تاج (حیدرآباد دکن) میں اسی پر ایک مضمون مولوی سید جلال صاحب نے تحریر فرمایا ہے ' اگرچہ اس کی اُٹھان اچھی ہے لیکن مضمون

تشنہ ہے۔ افسوس اڈیٹر صاحب تاج نے بوجہ عدم گنجائش زیادہ لکھنے کی اجازت نہیں دی - رسالۂ تاج ترقی کر رہا ہے - گزشتہ سے پیوستہ رسالہ میں ایک بہت بڑا مضمون قدیم اُردو پر چھپا ہے - اس کے مولف ہمارے دوست حکیم شمس اللہ صاحب قادری ہیں - انہوں نے اس کی تالیف میں بڑی تحقیق اور محنت سے کام کیا ہے اور یہ بہت قابل قدر مضمون ہے - اب کتاب کی صورت میں علیحدہ بھی چھپ گیا ہے - انجمن ترقی اُردو سے مل سکتا ہے —

—:O:—

تصحیح

جولائی کے رسالۂ اُردو میں اختر شیرانی صاحب کی ایک نظم " نوائے گل " کے عنوان سے چھپی تھی اُس کے اس مصرعے میں " بہار ہے "اگر" خدائے گل تو ہوئے گل کو جانئے دعائے گل " - یہ "اگر" مصرعے میں داخل نہ سمجھا جائے —
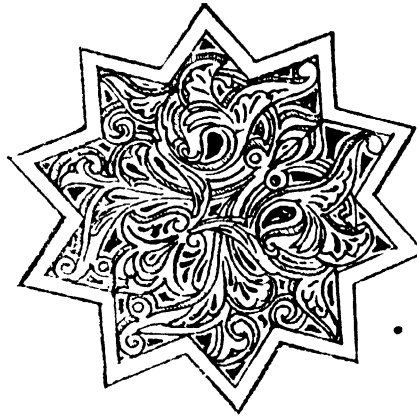
اس رسالہ کی طباعت میں حسب ذیل غلطیاں رہ گئی ہیں براہ کرم درست کر لی جائیں

صفحہ	سطر	غلط	صحیح	صفحہ	سطر	غلط	صحیح
۵۳۶	۱	عہد	عہدہ	۶۱۹	۷	کرتے	کرتے کرتے
۵۳۶	۹	مقربین	مقرهیں	۶۲۳	۳	مزاجی	مجازی
۵۵۹	۲۰	اُس خوب	اُس کو خوب	۶۲۴	۲۰	کہ لو گو	کہ گو
۵۶۴	۱	وڑے	کوڑے	۶۲۵	۱۶	و لاردری	ولاادری
۵۶۴	۲۲	گوی	گویا	۶۲۸	۳	پائدار	ناپائدار
۵۹۲	۲۲	و اور هم	وہ اور هم	۶۲۸	۱۰	جہالت	جہاد
۶۰۲	۱۱	پہلوتی	پہلو تھی	۶۲۹	۱۲	متغلی الفر	مستغنی الظفر
۶۰۳	۱۲	رکھا	رکھتا	۶۳۴	۱۲	باودرچیوں	باورچیوں
۶۰۴	۷	آفرین	آفرینی	۶۳۷	۳	مردہ رہ را	مردہ وا رہ
۶۰۵	۲۲	حبادو	جادو	۶۴۲	۲۰	اُن پر	اُن پہ
۶۰۶	۱۱	کو سمر	کو ثمر	۶۵۴	۳	متروکی	متروکات کی
۶۰۶	۲۱	سارہ	ساز رہ	۶۵۸	۲	کو کبھی	کے کبھی
۶۰۷	۲	ارارم	آرام	۶۶۰	۲۲	اتاع	اتباع
۶۰۸	۵	کے فلسفیانہ	کے انھیں فلسفیانہ	۶۶۲	۲	واجو	واجد
۶۱۵	۱۴	جمیعت	جمعیت	۶۶۳	۲	خوشی کی کسی	خوشی کسی
۶۱۶	۱۲	گرہ نی	گرنی	۶۶۴	۱۰	گرهیاں	غریباں
۶۱۷	۸	چپانے	چھپانے	۶۶۵	۲۳	ان کو چوتھی	ان کے چوتھے
۶۱۸	۴	نما	نماے	۶۷۳	۵	لئے	لیے

صفحہ	سطر	غلط	صحیح
۶۷۹	۱۶	فہم نے	فہم
۶۸۶	۱۹	عاج	عاجز
۷۰۱	۱۵	روش	روشلی
۷۰۲	۱۰	کہلا	کھیلا
۷۰۷	۱۴	شق	شوق
۷۰۸	۱۳	بھی تھیں	بھی ہیں
۷۰۸	۱۸	ہیں نا یہ	ہیں یہ
۷۰۸	۲۱	معمور	مصور
۷۱۲	۳	تخ	یخ
۷۱۲	۱۱	جتلے	جھٹے
۷۲۰	۱۵	ایسے	اسے
۷۲۲	۱۹	تریقہ	طریقہ
۷۲۳	۱۲	متشرقین	مستشرقین
۷۲۶	۲۰	میں مذکور	مذکور
۷۲۷	۱۹	سرد	سرو
۷۲۷	۲۸	دوادین	دواوین
۷۲۷	۲۹	دوادین	دواوین
۷۲۸	۱۷	دیوانی	دیوان
۷۲۹	۸	طربی	طبری
۷۲۹	۱۴	سے تاریخ طربی	نے تاریخ طبری
۷۳۰	۳۰	ثٔہ کا پوراہ	شاہ کا پورا
۷۳۱	۱۶	اراہ	ارادہ
۷۳۲	۵	لوز	نود
۷۳۲	۲۰	سجائد	محامد
۷۳۸	۶	مضامین	فضا میں
۷۳۸	۲۲	مسنح	مسخ
۷۳۸	۲۵	سمائیں	که ایں
۷۳۹	۱۶	دیدیہ	دے کر یہ

فہرست مضامین رسالۂ اُردو جلد پنجم بابتہ سنہ ۱۹۲۵ع

تاریخ اسلام جلد اول ۵۱۷ تاریخ القرآن ۷۴۵ تاریخ بنی هاشم ۳۴۱ تبصرة النهرست ۲۹۴ تبلیغ نامۂ وحدت و محبت ۵۲۵ تذکرۂ شعراے اُردو موسوم به گل رعنا ۵۰۷ تربیت حصه اول و دوم ۳۴۸ ترجمه تزک بابری اُردو معروفه بابر نامه ۳۳۰ تفریح دل ۷۴۷ تیغ کمال ۱۴۹ ثانی اثنین ۷۴۲ جام جہاں نما ۳۵۸ حسن خیال ۱۵۲ حضرت خواجه حسن نظامی کا روزنامچه ۵۲۴ حکایات پنجاب ۱۴۷ خانۂ حیرت ۵۱۱ خدائی انکم ٹیکس ۵۲۴ خمخانۂ کینی ۱۵۱ خیابان عرفان ۳۵۱ دختر سمرنا ۱۴۸ درس حیات ۳۴۷ دکن میں اُردو ۵۰۸ دو آتشه ۵۱۰ ذکری ۳۴۹ ذو النورین ۷۴۲ روئداد جلسه سالانه مطبع الطب لکھنؤ ۳۵۳ ساربان ۳۴۹ سالانه ریوٹ دار المعلومات مودی کامپٹی ۳۵۳ سراج المنیر حصه چهارم ۷۴۷ سرتاج ۵۲۸ سرگزشت وزیر خان لنکران ۷۳۵ سفرنامه مظهری ۷۴۸ سفیر التجار ۱۸۱ سلاطین بهمنی ۵۱۶ سودمند ۵۲۸ سیر الصحابه ۷۴۳ سیر المصنفین جلد اول ۱۳۹ سیرت علامه عبد الحکیم سیالکوٹی ۳۲۶ سیرت عمرو ابن العاص ۳۴۲ شادمان ۳۵۶ شراب عیش ۳۲۵ شمع ۳۵۴ شمع شبستان ۵۰۹ شہاب کی سرگزشت ۷۳۶ ظہیر فاریابی ۵۱۶ عندلیب ۳۵۵ فتنه خلق قرآن ترجمه کتاب الحیدہ ۵۲۳ فطرت نسوانی ۳۲۶ فہرست مخطوطات فارسی مخزونه کتب خانه ایشیاٹک سوسائٹی بنگال ۷۲۳ قاموس المشاهیر ۷۱۷ قوس قزح ۷۵۱ کشاف ۱۸۱ کشاف الهدیٰ ۱۷۵ کشمیر کی رانیاں ۳۴۶ ککے زئی ۳۵۸ کلام شاد حصه اول ۱۳۰ گوتم بدھ ۷۳۵ گوهرین نامه ۳۲۲ لیلیٰ (یا محاصرہ غرناطه) ۱۵۷ مثنوی اسرار هستی ۳۲۴ محمد کی سرکار ۵۱۵ مرزا غالب کی شاعری ۵۱۴ مسکوکات قدیمه ۵۱۶ مصرف جنگلات و تربیت جنگلات ۳۵۲ ملتقطات نظم اُردو ۵۱۴ مینا بازار ۷۴۷ ناٹک ساگر ۱۲۷ نقش فرنگ ۱۴۱ نور اللغات ۱۴۳ نورس ۷۴۹ نور هدایت ۳۴۹ نوید ۱۸۰ نیرنگ ارض ۵۲۱ Wit, Humour and Fancy of Persia ۱۷۹ وحید العصر ۵۲۸ وہ جاندار جو نظر نہیں آتے ۵۲۰ همارا گهر ۱۵۲ هند عهد اورنگ زیب میں ۱۶۲ هندو تیوهاروں کی اصلیت اور اُن کی جغرافیائی کیفیت ۵۰۵ یسرنا القرآن ۱۷۷

(کل قیمتیں سکۂ انگریزی میں ہیں)

کتاب	قیمت
نیرنگ ارض	۱ روپیہ ۴ آنہ
سیر المصنفین	۲ روپیہ
Hindustani Simplified (اردو آموز)	
دنیش چندر دت صاحب ایم اے	۳ روپیہ
شرح Hindustani Simplified	۱ روپیہ
رسالہ نماز Prayer Book	۱ روپیہ
معراج العاشقین	۶ آنہ
ابتدائی تعلیم کی رام کہانی	۱ روپیہ ۴ آنہ
ہندو تیوہاروں کی اصلیت اور ان کی	
جغرافیائی کیفیت	۶ آنہ
وہ جاندار جو نظر نہیں آتے	۴ آنہ
جہان آرا بیگم	۸ آنہ
(تصانیف نور الہی و محمد عمر صاحبان)	
موجودہ لندن کے اسرار	۱ روپیہ
ناٹک ساگر یعنی دنیا کے ڈراما کی تاریخ مجلد	۳ روپیہ
تین توپیاں	۸ آنہ
ظفر کی موت	۴ آنہ
قزاق	۸ آنہ
بگڑے دل	۸ آنہ
(دار الاشاعت پنجاب لاہور کی کتابیں)	
صبح زندگی	۱ روپیہ ۸ آنہ
شام زندگی	۱ روپیہ ۴ آنہ
شب زندگی ہر دو حصہ	۲ روپیہ ۴ آنہ
مذاق السائرہ	۱ روپیہ
سنجوگ	۱۰ آنہ
جوہر قدامت	۱ روپیہ ۸ آنہ
تحفہ سائنس	۲ روپیہ ۸ آنہ
مشاہیر ہند	۲ روپیہ ۸ آنہ
نیلی چھتری	۱ روپیہ ۴ آنہ
بہرام کی گرفتاری	۱ روپیہ
اختر النسا بیگم	۱ روپیہ ۸ آنہ
دکھ بھری کہانی	۲ آنہ ۶ پائی
روشنک بیگم	۲ روپیہ
رانی کرونارت	۱ آنہ
رسوم دہلی	۴ آنہ ۶ پائی
ان پورنا دیوی کا مندر	۱ روپیہ ۸ آنہ
ایام غدر	۱ روپیہ ۴ آنہ
نقش فرنگ	۱ روپیہ ۴ آنہ
پریم پچیسی مکمل	۳ روپیہ
پریم بتیسی حصۂ اول	۱ روپیہ ۸ آنہ
بانگ درا مجلد	۵ روپیہ ۸ آنہ
بانگ درا غیر مجلد	۴ روپیہ
نعمت خانہ	۱ روپیہ ۴ آنہ
خواب راحت	۴ آنہ
چندن ہار	۲ آنہ
انمول موتی	۱ آنہ ۶ پائی
سوکن کا جلاپا	۶ آنہ
گوہر مقصود	۶ آنہ
لیلیٰ	۲ روپیہ
سواء السبیل	۱ روپیہ
سخندان پارس	۱۰ آنہ
قوانین دولت	۴ آنہ
مینا	۱۲ آنہ
چترا	۱۲ آنہ

——*——

مطبوعات انجمن

جاپان اور اس کا تعلیمی نظم و نسق

سرکار نظام نے نواب مسعود جنگ بہادر ناظم تعلیمات ممالک محروسہ سرکار عالی کو جاپان کے تعلیمی نظام کے مطالعہ اور تحقیق کے لئے بھیجا تھا-نواب صاحب موصوف نے وہاں رہ کر اس عجیب و غریب ملک کے حالات اور خاصکر تعلیمی نظم و نسق کو نہایت غور اور تحقیق سے مطالعہ فرمایا-کتاب کے ابتدائی حصہ میں جاپان کی تاریخ اور اس کی ترقی کے اسباب پر نہایت دلچسپ اور فاضلانہ بحث کی ہے-جو ہمارے اہل وطن کے لئے بہت سبق آموز ہے-اردو میں یہ پہلی کتاب ہے جو جاپان پر اس طرز میں لکھی گئی ہے-ہر محب وطن کا فرض ہے کہ اس کتاب کو شروع سے آخر تک پڑھے جو علاوہ دلچسپ ہونے کے پر از معلومات ہے-خاصکر ان لوگوں کے لئے اس کا مطالعہ ناگزیر ہے جو ملک کی تعلیم سے تعلق رکھتے ہیں(حجم ۴۸۲صفحہ)

قیمت فی جلد مجلد تین روپیہ کلدار

سرگزشت حیات یا آپ بیتی

اس کتاب میں حیات کے آغاز اور اس کے نشو ونما کی داستان نہایت دلچسپ طرز پر بہت ہی سلیس زبان میں بیان کی گئی ہے-حیات کی ابتدائی حالت سے لے کر اس کا ارتقا انسان تک پہنچایا گیا ہے اور تمام تاریخی مدارج کو اس سہل طریقہ سے بتایا گیا ہے کہ ایک معمولی پڑھا لکھا ہوا آدمی بھی سمجھ سکے اور اگرچہ جدید سے جدید علمی تحقیقات بھی اس میں آگئی ہے مگر بیان کی سلاست میں فرق نہیں آیا-یہ کتاب جدید معلومات سے لبریز ہے اور ہر شخص کو اس کا مطالعہ کرنا لازم ہے

(حجم ۳۰۰ صفحہ)

قیمت فیجلد مجلد دو روپیہ آٹھ آنہ کلدار—

تذکرۂ شعرائے اردو

مولفۂ میر حسن دہلوی-میر حسن کے نام سے کون واقف نہیں-اُن کی مثنوی بدر منیر کو جو قبول عام نصیب ہوا شاید ہی اردو کی کسی کتاب کو نصیب ہوا ہو-یہ تذکرہ اسی مقبول اور نامور استاد کی تالیف ہے-یہ کتاب بالکل نایاب تھی بڑی کوشش سے بہم پہونچا کر طبع کی گئی ہے-میر صاحب کا نام اس تذکرہ کی کافی شہادت ہے-اس پر مولانا محمد حبیب الرحمن خاں صاحب شروانی نے ایک بسیط نقادانہ اور عالمانہ تبصرہ لکھا ہے جو قابل پڑھنے کے ہے-قیمت فی جلد مجلد ایک روپیہ ۱۴ آنہ کلدار-غیر مجلد ایک روپیہ ۹ آنہ کلدار—

تاریخ تمدن

سرٹامس بکل کی شہرۂ آفاق کتاب کا

ترجمہ ہے - الف سے ی تک تمدن کے ہر مسئلہ پر کمال جامعیت سے بحث کی گئی ہے اور ہر اصول کی تائید میں تاریخی اسناد سے کام لیا گیا ہے اس کے مطالعہ سے معلومات میں انقلاب اور ذہن میں وسعت پیدا ہوتی ہے۔ حصۂ اول غیر مجلد ایک روپیہ ۸ آنہ مجلد دو روپیہ کلدار حصۂ دوم مجلد ۲ روپیہ کلدار —

مقدمات ا طبیعات

یہ ترجمہ ہے مگر انگلستان کے مشہور سائنس دار حکیم ہکسلے کی کتاب کا جس کا نام کتاب کی کافی ضمانت ہے - اس میں مظاہر فطرت کی بحث درج ہے لیکن کتاب علم و فضل کا مرقع ہے قیمت غیر مجلد دو روپیہ کلدار - مجلد دو روپیہ ۱ آنہ کلدار ---

انقرل الاظہر

امام ابن مسکویہ کی معرکۃ الارا تصنیف فوزالاصغر کا یہ اردو ترجمہ ہے - یہ کتاب فلسفۂ الہیین کے اصول پر لکھی گئی ہے اور مذہب اسلام پر انہیں اصول کو منطبق کیا گیا ہے قیمت غیر مجلد ۸ آنہ کلدار مجلد ایک روپیہ کلدار —

القمر

قوانین حرکت و سکون اور نظام شمسی کی صراحت کے بعد چاند کے متعلق جو جدید انکشافات ہوئے ہیں ان سب کو جمع کر دیا ہے طرز بیان دلچسپ اور کتاب ایک نعمت ہے قیمت غیر مجلد ۱۰ آنہ کلدار - مجلد ا روپیہ کلدار —

قاعدہ و کلید قاعدہ

یہ قاعدہ مدت کے غور و خوض کے بعد اور بالکل جدید طرز پر لکھا گیا ہے جن اصول اور طریقہ پر اس کی تعلیم ہونی چاہئیے ان کی تشریح کے لئے ایک کلید بھی تیار کی گئی ہے - قاعدہ غیر مجلد ۲ آنہ کلدار - کلید قاعدہ غیر مجلد ۴ آنہ کلدار —

فلسفۂ تعلیم

ہربرٹ اسپنسر کی مشہور تصنیف اور مسئلۂ تعلیم کی آخری کتاب ہے غور و فکر کا بہترین کارنامہ - والدین و معلم کے لئے چراغ ہدایت ہے - تربیت کے قوانین کو اس قدر صحت کے ساتھ مرتب کیا ہے کہ کتاب الہامی معلوم ہوتی ہے - اس کا نہ پڑھنا گناہ ہے - قیمت مجلد ۳ روپیہ کلدار - غیر مجلد ۲ روپیہ ۸ آنہ کلدار —

دریاے لطافت

ہندوستان کے مشہور سخن سنج میر انشاالله خاں کی تصنیف ہے - اردو صرف و نحو اور محاورات اور الفاظ کی پہلی کتاب ہے اس میں زبان کے متعلق بعض عجیب و غریب نکات درج ہیں - قیمت غیر مجلد ایک روپیہ ۸ آنہ کلدار مجلد ۲ روپیہ کلدار —

طبقات الارض

اس فن کی پہلی کتاب ہے - تین سو صفحوں میں تقریباً جملہ مسائل

قلم بند کئے ہیں۔کتاب کے آخر میں
انگریزی مصطلحات اور ان کے
مرادفات کی فہرست بھی منسلک
ہے۔قیمت غیر مجلد ۲ روپیہ کلدار
مجلد ۲ روپیہ ۸ آنہ کلدار —

مشاہیر یونان و رومہ

ترجمہ ہے۔سیرت نگاری اور انشاپردازی
میں اصل کتاب کا مرتبہ دو ہزار برس
سے آج تک مسلم الثبوت چلا آتا ہے۔
ادیبان عالم بلکہ شکسپیر تک نے اس
چشمہ سے فیض حاصل کیا ہے۔وطن
پرستی اور بے نفسی عزم وجواں مردی
کی مثالوں سے اس کا ہر ایک صفحہ
معمور ہے۔قیمت جلد اول غیر مجلد
۳ روپیہ کلدار۔مجلد ۴ روپیہ کلدار
جلد دوم مجلد ۲ روپیہ ۸ آنہ کلدار —

اسباق النحو

ملک کے ادیب کامل مولانا حمیدالدین
صاحب بی اے کی تالیف ہے اختصار
کے باوجود عربی صرف و نحو کا ہر ایک
ضروری مسئلہ درج ہے۔قیمت حصۂ
اول غیر مجلد ۶ آنہ کلدار حصۂ دوم
غیر مجلد ۴ آنہ کلدار —

علم المعیشت

اس کتاب کی تصنیف سے پروفیسر
محمد الیاس صاحب برنی ایم اے نے
ملک پر بہت بڑا احسان کیا ہے۔
معیشت پر یہ کتاب جامع و مانع ہے۔
مبہم و مشکل مسائل کو پانی کر دیا ہے
اس کے اکثر باب نہایت عجیب و غریب
ہیں۔اشتراکیت کا باب قابل دید ہے۔
حجم ۸۸۵ صفحے قیمت مجلد ۵ روپیہ
۸ آنہ کلدار —

تاریخ اخلاق یورپ

اصل مصنف پروفیسر لیکی کا نام علم
و تبحر۔تحقیق و صداقت کا مرادف ہے۔
یہ کتاب کئی ہزار برس کے تمدن۔
معاشرت – اصول – اخلاق – مذاہب
و خیالات کا مرقع ہے۔حصۂ اول مجلد
۳ روپیہ کلدار حصۂ دوم مجلد ۲ روپیہ
۸ آنہ کلدار —

تاریخ یونان قدیم

یہ کتاب مطالب کے لحاظ سے مستند
کتابوں کا خلاصہ ہے اور زبان کے لحاظ
سے سلاست و شگفتگی کا نمونہ۔اس کا نقطۂ
خیال خالصاً ہندوستانی ہے۔ایف اے
کلاس کے طلبا جو یونان قدیم کی تاریخ
سے گھبراتے ہیں اس کتاب کو انتہا درجہ
مفید پائیں گے۔قیمت مجلد ۲ روپیہ
کلدار —

انتخاب کلام میر

میر تقی میر تاج شعرائے اردو کے
کلام کا انتخاب ہے۔مولوی عبدالحق
صاحب سکریٹری انجمن ترقی اردو
نے یہ انتخاب ایک مدت کی سعی
و محنت کے بعد کیا ہے اورشروع میں
میر صاحب کی خصوصیات شاعری پر
۴۰ صفحہ کا ایک عالمانہ مقدمہ
بھی لکھا ہے۔قیمت مجلد ۲ روپیہ
کلدار —

رسالۂ نباتات

اس موضوع کا پہلا رسالہ ہے۔علمی اصطلاحات سے معرا۔طلباء نباتات جس مسئلہ کو انگریزی میں نہ سمجھہ سکیں وہ اس رسالہ میں مطالعہ کریں قیمت مجلد ایک روپیہ چار آنہ کلدار—

دیباچۂ صحت

اس کتاب میں مطالبات صحت پر (مثلاً ہوا۔پانی۔غذا۔لباس۔مکان وغیرہ) مبسوط اور دلچسپ بحث کی گئی ہے۔ زبان عام فہم اور پیرایہ موثر و دلپذیر ہے ملک کی بہترین تصنیف ہے۔اس کا مطالعہ کئی ہزار نسخوں سے زیادہ قیمتی ثابت ہوگا۔حجم ایک ہزار صفحے۔قیمت مجلد چار روپیہ کلدار—

قواعد اردو

ارباب فن کا اتفاق ہے کہ اردو زبان میں اس سے بہتر قواعد نہیں لکھے گئے۔ بسط و شرح کے علاوہ اس میں بڑی خوبی یہ ہے کہ فارسی قواعد کا تتبع نہیں کیا گیا ہے قیمت غیر مجلد دو روپیہ کلدار—

نکات الشعراء

یہ اردو کا تذکرہ استادالشعرا میر تقی مرحوم کی تالیفات سے ہے۔اس میں بعض ایسے شعرا کے حالات بھی ملیں گے جو عام طور پر معروف نہیں۔نیز میر صاحب کی رائیں اور زبان کے بعض بعض نکات پڑھنے کے قابل ہیں۔مولانا محمد حبیب الرحمن خاں صاحب شروانی صدرالصدور امور مذہبی سرکار عالی نے اس پر ایک ناقدانہ اور دلچسپ مقدمہ لکھا ہے۔قیمت مجلد دو روپیہ ۴ آنہ کلدار—

فلسفۂ جذبات

کتاب کا مصنف ہندوستان کا مشہور نفسی ہے۔جذبات کے علاوہ نفس کی ہر ایک کیفیت پر نہایت لیاقت اور زبان آوری کے ساتھہ بحث کی گئی ہے۔ متعلمان نفسیات اسے مفید پائیں گے قیمت مجلد دو روپیہ ۸ آنہ کلدار غیر مجلد دو روپیہ کلدار—

وضع اصطلاحات

یہ کتاب ملک کے نامور انشا پرداز اور عالم مولوی وحیدالدین سلیم (پروفیسر عثمانیہ کالج) نے سالہا سال کے غور و فکر اور مطالعہ کے بعد تالیف کی ہے۔ بقول فاضل مولف "یہ بالکل نیا موضوع ہے۔میرے علم میں شاید کوئی ایسی کتاب نہ آج تک یورپ کی کسی زبان میں لکھی گئی ہے نہ ایشیا کی کسی زبان میں"۔ اس میں وضع اصطلاحات کے ہر پہلو پر تفصیل کے ساتھہ بحث کی گئی ہے اور اس کے اصول قائم کئے گئے ہیں۔مخالف و موافق رایوں کی تنقید کی گئی ہے اور زبان کی ساخت اور اس کے عناصر ترکیبی مفرد و مرکب اصطلاحات کے طریقے۔سابقوں اور لاحقوں۔اردو مصادر اور ان کے

مشتقات-فرض سیکڑوں دلچسپ اور علمی بحثیں زبان کے متعلق آگئی ہیں۔ اردو میں بعض اور بھی ایسی کتابیں ہیں جن کی نسبت یہ کہا جا سکتا ہے کہ زبان میں ان کی نظیر نہیں-لیکن اس کتاب نے زبان کی جڑیں مضبوط کردی ہیں اور ہمارے حوصلے بلند کر دئیے ہیں-اس سے پہلے ہم اردو کو علمی زبان کہتے ہوئے جھجکتے اور اس کی آیندہ ترقی کے متعلق دعویٰ کرتے ہوئے ہچکچاتے تھے-مگر اس کتاب کے ہوتے یہ اندیشہ نہیں رہا-اس نے حقیقت کا ایک نیا باب ہماری آنکھوں کے سامنے کھول دیا ہے-تعداد صفحات ۳۰۵ قیمت مجلد تین روپیہ ۱۲ آنہ کلدار—

نفح الطیب

یہ کتاب اسلامی عہد کی تاریخ اسپین کے معلومات کا خزانہ ہے-خلافت اسپین کے ہر مورخ کو اس کی خوشہ چینی کرنی پڑی ہے-علامۂ مقری کی نامور اور مشہور آفاق کتاب ہے جو پہلی دفعہ اردو میں ترجمہ ہوئی ہے-یہ کتاب عثمانیہ یونیورسٹی کے نصاب میں بھی داخل ہے صفحات ۶۰۴ قیمت مجلد چھہ روپیہ ۸ آنہ کلدار —

محاسن کلام غالب

ڈاکٹر عبدالرحمن بجنوری مرحوم کا معرکۃالارا مضمون ہے-اردو زبان میں یہ پہلی تحریر ہے جو اس شان کی لکھی گئی ہے-یہ مضمون اردو کے پہلے نمبر میں طبع ہوا تھا-صاحب نظر قدر دانوں کے اصرار سے الگ بھی طبع کیا گیا ہے- قیمت غیر مجلد ۸ آنہ کلدار —

ملل قدیمہ

ایک فرانسیسی کتاب کا ترجمہ ہے- اس میں بعض قدیم اقوام-سلطنت کلدانی-آشوری-بابل-بنی اسرائیل و فنیقیہ کی معاشرت-عقائد-صنعت و حرفت وغیرہ کے حالات دلچسپی اور خوبی کے ساتھہ دئیے ہیں-اردو میں کوئی ایسی کتاب نہ تھی جس سے ان قدیم اقوام کے حالات صحیح طور سے معلوم ہوسکیں اس لئے انجمن نے اسے خاص طور پر طبع کرایا ہے حالات کی وضاحت کے لئے جا بجا تصویریں دی گئی ہیں-صفحہ ۲۷۴-قیمت مجلد دو روپیہ ۶ آنہ کلدار—

بجلی کے کرشمے

یہ کتاب مولوی محمد معشوق حسین خاں صاحب بی اے نے مختلف انگریزی کتابوں کے مطالعہ کے بعد لکھی ہے- برقیات پر یہ ابتدائی کتاب ہے اور سہل زبان میں لکھی ہے-ہمارے بہت سے ہم وطن یہ نہیں جانتے کہ بجلی کیا چیز ہے-کہاں سے آتی ہے-کیا کام آسکتی ہے-یہ کتاب ان تمام معلومات کو بتاتی ہے-لڑکے لڑکیوں کے لئے بھی مفید ہے- قیمت دو روپیہ ۴ آنہ کلدار—

-:o:-

حسب ذیل کتابیں بھی انجمن ترقی اُردو اورنگ آباد دکن سے مل سکتی ہیں (کل قیمتیں سکۂ انگریزی میں ہیں)

(دارالمصنفین اعظم گڈھ)

۱- سیرۃالنبی حصۂ اول ۴ روپیہ
۲- سیرۃالنبی حصۂ دوم ۳ روپیہ ۸ آنہ
۳- سیرۃالنبی حصۂ سوم ۶ روپیہ
۴- شعرالعجم مکمل ۵ حصے ۱۳ روپیہ
۵- سفرنامہ مولانا شبلی ۲ روپیہ
۶- علم الکلام ۲ روپیہ
۷- الکلام ۲ روپیہ
۸- کلیات شبلی ۱ روپیہ ۸ آنہ
۹- اسوۂ صحابہ مکمل دو حصہ ۸ روپیہ
۱۰- انقلاب الامم ۲ روپیہ
۱۱- برکلے ۱ روپیہ ۸ آنہ
۱۲- مکالمات برکلے ۱ روپیہ ۸ آنہ
۱۳- مثنوی بحرالمحبت ۱۲ آنہ
۱۴- تفسیر ابومسلم اصفہانی (عربی) ۲ روپیہ
۱۵- سیرالصحابیات ۲ روپیہ ۴ آنہ
۱۶- روح الاجتماع ۲ روپیہ
۱۷- ابن رشد ۴ روپیہ
۱۸- گل رعنا ۵ روپیہ
۱۹- سیرالانصار ۳ روپیہ ۸ آنہ

(مطبع کاویانی - برلن)

۱- موش و گربہ (فارسی) ۵ آنہ ۹ پائی
۲- زادالمسافرین (فارسی) ۸ روپیہ
۳- گلستان (فارسی) ۲ روپیہ ۸ آنہ
۴- تیاتر (فارسی) ۲ روپیہ ۸ آنہ
۵- تاریخ سنی ملوک الارض (عربی) ۲ روپیہ ۸ آنہ
۶- نصاب الصبیان (فارسی) ۱ روپیہ
۷- رہنمائے پسران (فارسی) ۱ روپیہ ۸ آنہ
۸- تلغراف بی سیم (فارسی) ۱ روپیہ
۹- ہزار و یک سخن (فارسی) ۱۱ آنہ

(جامعہ ملیہ - علی گڈھ)

۱- الخلافت الکبریٰ ۵ روپیہ
۲- الصراط المستقیم ۲ روپیہ
۳- بصائر ۶ آنہ
۴- سیرۃالرسول ۱ روپیہ ۸ آنہ
۵- خلافت راشدہ ۲ روپیہ
۶- خلافت بنی امیہ ۱ روپیہ ۸ آنہ
۷- خلافت عباسیہ ۲ روپیہ
۸- خلافت عباسیہ بغداد ۲ روپیہ
۹- مبادی معاشیات ۱ روپیہ
۱۰- انتخاب میر (از نورالرحمن صاحب) ۱ روپیہ
۱۱- قواعد عربی ۲ روپیہ
۱۲- عرض جوہر ۸ آنہ
۱۳- مجموعہ کلام جوہر ۶ آنہ
۱۴- اسلامی تہذیب و قومی تعلیم ۴ آنہ
۱۵- ازہارالعرب ۸ آنہ

۱۶- انتخاب مضامین جوہر ۱ روپیہ
۱۷- ترکوں کی کہانیاں ۴ آنہ
۱۸- خطبہ شیخ الہند ۲ آنہ
۱۹- خطبہ حکیم اجمل خاں صاحب ۲ آنہ
۲۰- ہمارے نبی ۸ آنہ
۲۱- تاریخ ہند قدیم ۱ روپیہ
۲۲- اورنگ زیب عالمگیر پر ایک نظر ۱۲ آنہ

(نظامی پریس - بدایون)

۱- قاموس المشاہیر جلد اول ۲ روپیہ
۲- نکات غالب مجلد ۱ روپیہ
۳- دیوان غالب مشرح مجلد دو روپیہ ۸ آنہ
۴- دیوان جان صاحب مجلد ۱ روپیہ ۸ آنہ
۵- دیوان درد ۱ روپیہ ۴ آنہ
۶- دیوان غالب (لائبریری ایڈیشن) ۱ روپیہ ۸ نہ
۷- خطوط سرسید قسم اول ۳ روپیہ
۸- خطوط سرسید قسم دوم ۲ روپیہ
۹- لیتھوگرافی مجلد ۲ روپیہ ۸ آنہ
۱۰- انتخاب زرین مجلد ۲ روپیہ
۱۱- مراثی انیس جلد اول مجلد ۱۰ روپیہ
۱۲- مراثی انیس جلد دوم قسم اول ۸ روپیہ قسم دوم ۴ روپیہ
۱۳- تذکرۃ الصلحا ۸ آنہ
۱۴- کنز التاریخ ۱ روپیہ ۸ آنہ

(دائرۂ ادبیہ - لکھنؤ)

۱- یادگار غالب ۳ روپیہ
۲- مکاتیب امیر مینائی ۲ روپیہ ۸ آنہ
۳- مکاتیب اکبر ۱ روپیہ
۴- مینائے سخن ۱ روپیہ
۵- حزن اختر ۸ آنہ
۶- درس عمل ۴ آنہ
۷- خواتین انگورہ ۱ روپیہ
۸- بیگمات بنگال ۶ آنہ
۹- اسلام کا اثر یورپ پر ۴ آنہ
۱۰- مشرقی ترکستان ۶ آنہ
۱۱- سیاحت زمین ۱ روپیہ
۱۲- سیاحت ہوا ۱ روپیہ

الناظر پریس - لکھنؤ

۱- تاریخ عرب ۷ روپیہ ۸ آنہ
۲- موازنہ انیس و دبیر ۳ روپیہ
۳- مقدمہ شعر و شاعری ۱ روپیہ ۴ آنہ
۴- اصول النسخ ۶ آنہ
۵- مسلمانان اندلس ۱ روپیہ ۸ آنہ
۶- اسرار رنگون ۱ روپیہ
۷- ہوم رول ۵ آنہ
۸- خوان دعوت ۱ روپیہ
۹- مصنوعی شوہر ۲ آنہ
۱۰- وکرم اروسی ۱ روپیہ ۸ آنہ
۱۱- مسلمانوں کی تہذیب ۶ آنہ
۱۲- الاحسان ۸ آنہ
۱۳- ارض نہریں ۴ آنہ
۱۴- تذکرۂ حزیں ۴ آنہ
۱۵- حیات نظامی ۴ آنہ
۱۶- خطاب ۴ آنہ

جلد پنجم

جنوری سنہ ۱۹۲۵ع

حصۂ ہفت دہم

اُردو

انجمن ترقی اُردو اورنگ آباد (دکن)

کا

سہ ماہی رسالہ

فردوسی کا مذهب

(از جناب محمود خاں شیرانی صاحب پروفیسر اسلامیه کالج لاهور)

جس طرح فردوسی کے حالات کے متعلق همارى معلومات ناکافی اور غیر یقینی هے۔فردوسی کے مذهب کے متعلق بهی همارا علم ناقابل اعتبار هے۔ هم نے یه مان لیا هے که وه شیعه تها اور اسی پر مطمئن هیں لیکن تحقیقات کی روشنی میں همارا یه اعتقاد وهم و خیال سے زیاده وقعت نهیں رکهتا—

پرانی روایات اس کو شیعه بیان کرتی هیں۔شاهنامه اس باره میں متضاد اور متناقض شهادت پیش کرتا هے جس کی رو سے فردوسی شیعه بهی مانا جا سکتا هے اور سنی بهی اور یه ظاهر هے که ایک شخص شیعه اور سنی دونوں هو نهیں سکتا۔البته ایک امر یقینی هے که جهاں شاعر کو اس کے دشمنوں نے مجوسی۔فلسفی۔دهریه۔ملحد۔کافر اور معتزلی کها هے وهاں اس کو رافضی بهی کها هے۔اب دشمنوں کے بیانات پر کهاں تک اعتماد کیا جا سکتا هے۔اگر وه ملحد اور مجوسی تها تو شیعه بهی تها۔اگر یه نهیں تها تو وه بهی نهیں تها—

همیں یه بهی یاد رکهنا چاهئے که دنیا ان ایام میں مذهبی نوعیت کے افترا اور بهتان لگانے پر بهت آماده رهتی تهی۔حسنک میکال آخری وزیر سلطان محمود غزنوی پر بهی ملحد اور قرمطی هونے کا الزام لگایا گیا تها اور خلیفۂ بغداد نے سلطان محمود سے اس کا سر طلب کیا تها۔اصلی واقعه صرف اسی قدر تها که جب حسنک حج بیت الله کے لئے گیا تها فاطمیئین مصر نے اس کے اور سلطان کے لئے چند تحائف بهیجے تهے جن کو اس نے قبول کر لیا تها۔سلطان محمود نے جو اپنے وزیر کے مذهب سے خلیفه کی به نسبت زیاده صحیح واقفیت

رکھتا تھا جواب میں کہلا بھیجا کہ حسنک میرے سامنے کا بچہ ھے میں نے اس کو تربیت کیا ھے اگر وہ تمہارے نزدیک قرمطی ھے تو سمجھہ لو کہ میں پہلے قرمطی ھوں۔ لیکن محمود کی آنکھہ بند ھوتے ھی سلطان مسعود کے دور میں حسنک میکال کو اسی جرم میں سولی دی جاتی ھے —

قدیم روایات جن کے متعلق ایما ھو چکا ھے حقیقت میں فردوسی کو شیعہ مانتی ھیں۔ ان میں سب سے پرانی دیباچۂ قدیم کی روایت ھے۔ جس کی رو سے سلطان محمود کے دربار میں فردوسی کی محرومی کا اولین محرک اِس کا مذھب تھا لیکن صاحب دیباچہ یہ ذکر نہیں کرتا کہ وہ مذھب کیا تھا۔ اس کے الفاظ ھیں : —

" اما بر سر شاھنامہ شَرط ادب نگاہ نداشتہ بود و سخن در مذھب خود گفتہ —

گرت زیں بد آید گناہ منست   چنیں است ایں رسم و راہ منست

سلطان را ناخوش آمد و سیاست فرمود۔ پس عنصری و جملہ شاعراں زمیں بوس کردنند و اورا از سیاست خلاص دادند "۔ نظامی عروضی کی شہادت کی رو سے فردوسی صریحاً شیعی اور معتزلی ھے اس کا بیان ھے کہ خواجہ کے دشمنوں نے سلطان کو فردوسی کے انعام کے لئے مشورہ دیتے وقت کہا کہ صرف پچاس ھزار (درم) کافی ھوں گے اس لئے کہ وہ رافضی اور معتزلی ھے۔ دوسرے موقعہ پر نظامی فردوسی کی شیعیت کا اس وقت ذکر کرتا ھے جب فردوسی سلطان محمود کی ھجو لکھہ کر اور فرار ھو کر طبرستان میں اسپہبد شہریار کے پاس جو آل باوند کا ایک رکن تھا پناہ گزیں ھوتا ھے۔ جب شاعر شہریار کے نام پر شاھنامہ منسوب کرنے کا ارادہ کرتا ھے اسپہبد شہریار جواب میں اس وقت کہتا ھے کہ اسے استاد محمود کو دشمنوں نے بہکا دیا ھے اور تیری کتاب کا ذکر مناسب موقعہ پر نہیں کیا بلکہ تیری بد گوئی کی گئی۔ دوسرے تو شیعہ طبقہ سے تعلق

۳

رکھتا ہے اور جس کو خاندان پیمبر سے محبت ہوتی ہے۔ دنیاوی معاملات میں سرسبز نہیں ہوتا اس لئے کہ اهل بیت کو خود کامیابی نہیں ہوئی۔ نظامی کی اصل عبارت ذیل میں نقل کی جاتی ہے —

(۱) اما خواجۂ بزرگ (احمد بن حسن میمندی) منازعان داشت که پیوسته خاک تخلیط در قدح جاه او همی انداختند۔ محمود با آں جماعت تدبیر کرد که فردوسی را چه دهم۔ گفتند پنجاه هزار درم و ایں خود بسیار باشد که او مردے رافضی است و معتزلی مذهب و ایں بیت بر اعتزال او دلیل کند که او گفت —

به بینندگاں آفریننده را ● نه بینی مرنجاں دو بیننده را

و بر رفض او ایں بیتها دلیل است که او گفت —

خردمند گیتی چو دریا نهاد	بر انگیخته موج ازو تند باد
میانه یکے خوب کشتی عروس	بر آراسته همچو چشم خروس
اگر خلد خواهی بدیگر سرائے	بنزد نبی و وصی گیر جائے
چو هفتاد کشتی درو ساخته	همه بادبانها بر افراخته
پیمبر بدو اندروں با علی	همه اهل بیت نبی و وصی
گرت زیں بد آید گناه منست	چنیں داں و ایں راه راه منست
بریں زادم و هم بریں بگذرم	یقیں داں که خاک پئے حیدرم

(چهار مقاله طبع یورپ صفحه ۴۹)

(۲) و شاهنامه بر گرفت و بطبرستان شد بنزدیک اسپهبد شهریار که از آل باوند در طبرستان بادشاه او بود و آں خاندانے است بزرگ نسبت ایشان بیزدگرد شهریار پیوندد و پس محمود را هجا کرد در دیباچه بیتے صد و بر شهریار خواند و گفت من ایں کتاب را از نام محمود با نام تو خواهم کردن۔ که ایں کتاب همه اخبار و آثار جدان تست۔ شهریار او را بنواخت و نیکوئیها فرمود و گفت یا استاد محمود را برآں داشتند و کتاب را بشرطے عرضه نکردند

و ترا تغلیط کردند و دیگر تو مرد شیعیئی و هر که تولی بخاندان پیمبر کند او را دنیاوی هیچ کارے نرود کہ ایشانرا خود نرفته است۔ محمود خداوندگار منست تو شاهنامه بنام او رها کن و هجو او بمن ده تا بشویم و ترا اندک چیزے بدهم (چهار مقاله صفحه ۴۹ و ۵۰)۔ لیکن نظامی کے بیانات پر زیادہ اعتبار نہیں کیا جا سکتا اس لئے کہ خواجہ احمد بن حسن میمندی کی سرپرستی کی روایت کی جس کا نظامی مدعی ہے شاهنامہ تائید نہیں کرتا۔ البتہ سلطان کے وزیر اول ابوالعباس خواجہ فضل بن احمد کا ذکر دو مقام پر شاهنامہ میں ملتا ہے اور فردوسی اس کا شکر گذار بھی معلوم ہوتا ہے —

ز دستور فرزانۂ دادگر   پراگندہ رنج من آمد بسر

(شاهنامہ صفحہ ۲۴۴ طبع بمبئی سنہ ۱۲۷۵ ہجری)

نیز فردوسی کے شیعہ تذکرہ نگار خواجہ احمد بن حسن میمندی کو جسے غلطی سے وہ عام طور پر حسن میمندی لکھنے کے عادی ہیں۔ بالعموم فردوسی کا دشمن بیان کرتے ہیں۔ فردوسی کے ان دوستوں میں خواجہ کی نسبت اظہار دشمنی میں اس قدر مبالغہ کیا گیا ہے کہ غریب خواجہ کو خارجی مشہور کر دیا گیا ہے چنانچہ عبارت ذیل ملاحظ ہو —

" و چنیں گویند ارکان دولت سلطان از شهر و نواحی با فردوسی انواع خلق و محبت و کرم همی نمردند و فروسی در مدح ایشان سخن گفتے ر حسن میمندی ازیں جهت با فردوسی مظنه داشتے و غبارے درمیان ایشان شده بردے و هیچ نوع چنانچه فرمودۂ سلطان بود با او بجا نیاوردے تا بعدیکه فردوسی گفت که حضرت حق عزشانه در ازل چناں تقدیر فرموده بود که ایں کتاب بر زبان من تمام شود ر مرا در مال سلطان طمعے نیست و بجاه و تقرب حسن میمندی احتیاجے ندارم میگفت مثنوی (کذا)

من پیش کز مبادے فطرت نبوده ام   مائل بمال هرگز و طامع بجاه نیز

سوئے در وزیر چرا ملتفت شوم چوں فارغم ز بارگہ بادشاہ نیز

و گویند حسن میمندی در طبع خوارج بود و فردوسی کہ تشیع بطبیعت داشت او را عدم الوجود میدانست و ہر چند احبا و اودا فردوسی را بر موافقت و ترک مخالفت وزیر تحریص میکردند او اجتناب و اعتراض زیادہ نمودہ میگفت—

بدل ہر کہ بغض علی کرد جاے ز مادر بود عیب آں تیرہ راے

کہ ناپاک زادہ بود خصم شاہ اگر چند باشد بایوان و گاہ

ز میمندی آئین مردی مجوئے ز نام و نشانش مکن جستجوئے

قلم بر بسر او بزن ہمچو من کہ گم باد نامش بہر انجمن

(دیباچۂ بایسنغر خانی)

یہ بیانات اگرچہ تاریخی لحاظ سے بے سر و پا ہیں نہ فردوسی ایسا خود پسند اور مغرور تھا نہ خواجہ احمد بن حسن میمندی خارجی اور نہ یہ اشعار فردوسی کے۔ لیکن میں نے اس غرض سے یہاں ان کو نقل کیا ہے تا کہ یہ معلوم ہو جائے کہ شیعہ حلقوں میں خواجہ کس نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں—

فردوسی کی انتہاے پیری اور جسمانی کمزوریوں کا خیال کرتے ہوئے اسی سال کی عمر میں طبرستان جیسے دور دراز ملک کا سفر اختیار کرنا اور جاتے ہی شہریار کے ہاں رسائی پیدا کرلینا غیر اغلب معلوم ہوتا ہے۔ جس طرح کہ خود شہریار کی شخصیت غیر یقینی ہے—

اسپہبد شہریار

تاریخ میں اس کی شخصیت نہایت عجیب ہے۔ نہ صرف اس کے نام بلکہ اس کی ہستی کو مشتبہ نظروں سے دیکھا جانا چاہئے اس کی زندگی کے کارناموں سے ہمیں اسی قدر علم ہے کہ—

شہریار شروین بن رستم بن سرخاب بن قارن بن شہریار کا فرزند ھے جو ماکان بن کاکی کا معاصر تھا اور شہریار خود رکن الدولہ بویہ اور وشمگیر بن زیار کا ھمعصر تھا-اس کا فرزند جو ۵۱۵۱ کے نام پر شروین کے نام سے موسوم تھا اس کی حین حیات میں وفات پا جاتا ھے اور شہر یار-قابوس بن وشمگیر اور سلطان محمود کے زمانہ تک زندہ رھتا ھے اور فردوسی اسی کے دربار میں شاھنامہ لے کر جاتا ھے—

یہ بیان میں نے ابن اسفند یار کی تاریخ طبرستان کے انگریزی ترجمہ سے لیا ھے جس کو پروفیسر براؤن نے شایع کیا ھے-مرزا محمد قزوینی شہر یار کے زمانہ کے متعلق صاحب مرزبان نامہ کے ذکر میں کہتے ھیں—

" پدر مرزبان اسپہبد رستم بن شہریار بن شروین معاصر شمس المعالی قابوس بن وشمگیر ۳۶۶ ھجری بود در فریم (پریم) وشهر یار کوه قائم مقام پدرشد وپدرش شہریار بن شروین معاصر سلطان محمود غزنوی بود و در ۳۳۷ ھجری (بقول شیفر-معلوم نیست از روے چہ ما خذے) بتخت نشست و مدتے دراز بماند وزمان سلطان محمود را درک نمود واوست کہ فردوسی بعد از قرار از دربار سلطان محمود نبزد وے رفت و خواست شاھنامہ بنام او کند و آنحکایت معروفست"— (مرزبان نامہ مقدمۂ مصحح صفحہ واو)

اس کی تاریخ وفات کے لئے مرزا موصوف لکھتے ھیں—

" تاریخ وفات ایں شہریار معلوم نیست ھمیں قدر ابن اسفندیار گوید " شہریار مدتے دراز بماند-تادر عہد شمس المعالی قابوس بن وشمگیر وھم در عہد سلطان یمین الدولہ محمود بماند" وچوں تاریخ اتمام شاھنامہ در ۴۰۰ ھجری است در ھر حال وفات شہریار بعد ازاں واقع شدہ است" (چھار مقالہ صفحہ ۱۹۰)-گویا ۳۳۷ ھجری میں شہریار تخت نشین ھوکر ۴۰۰ ھجری کے بعد تک زندہ رھا-یہ طویل مدت سلطنت بجاے خود ایک حیرت خیز امر ھے

اور تریسٹھ سال سلطنت کرنے کے باوجود اس دراز مدت میں وہ کوئی ایسا کام نہیں کرتا جس کا تاریخیں ذکر کرتیں-اس کے معاصر وشمگیر اور رکن الدولہ جبکہ ۳۵۷ ھجری اور ۳۶۶ ھجری میں وفات پاتے ھیں شہریار فردوسی کے انتظار میں پانچویں صدی کے آغاز تک مرنے کا نام نہیں لیتا-مرزا محمد کا بیان اور بھی عجیب ھے-وہ کہتے ھیں کہ رستم شہریار کا فرزند شمس المعالی قابوس کا ھمعصر ھے اور خود شہریار سلطان محمود ۳۸۸ ھجری و ۴۲۱ ھجری کا ہم عہد ھے-اس طرح بیٹا باپ سے پہلے تخت نشین ھوجاتا ھے اس سے عجیب وہ بیان ھے جو ابن اسفندیار دے رہا ھے-وہ کہتا ھے:—

"شہریار کا جانشین اسپہبد دارا ھوا جس نے صرف تھوڑی مدت حکومت کی-دارا کے بعد اس کا فرزند اسپہبد شہریار* برسر تخت آیا جو قابوس بن وشمگیر کے ساتھ اس کی اٹھارہ سالہ مہاجرت میں شریک رہا-جرجان میں قابوس کے ساتھ واپس آیا اور یہاں آکر اس نے کارھائے نمایاں کئے-شہریار کوہ فتح کیا اور باقی بن سعید کی اعانت سے ۳۸۷ ھجری میں اس نے فیروزان بن حسن کو شکست دی اور قابوس کے لئے ملک کو پاک وصاف کرکے جب خود طاقتور ھوگیا تو قابوس سے بغاوت کی اور رستم بن مرزبان کے ھاتھ پر گرفتار ھوکر باقی عمر قید میں گذاری"—

اب ایک نئی دشواری پیش آتی ھے-یعنے ایک شہریار کے بجاے ایک ھی وقت میں دو شہریار ماننا پڑتے ھیں-یعنے شہریار ثانی اور شہریار ثالث (آل باوند میں تین شہریار گذرے ھیں) شہریار ثالث اگرچہ دارا کا فرزند اور جانشین ھے اور شہریار ثانی اگرچہ دارا کا مورث ھے دونوں ھمعصر بن جاتے ھیں کیونکہ بقول ابن اسفندیار دونوں قابوس اور سلطان محمود کے معاصر

* یہ یاد رھے کہ اسی شہریار کو تاریخ یمینی میں "اسپہبد شہریار بن شروین" کہا گیا ھے-دیکھو صفحہ ۱۷۳ تاریخ یمینی-مطبع محمدی-لاھور—

ھیں۔ شہریار ثالث قابوس کے لئے اس کا آبائی ملک فتح کرتا ھے لیکن شہریار ثانی کسی اور ضرورت سے نہیں صرف فردوسی کی خاطر سنہ ۴۰۰ ھجری کے بعد تک زندہ مانا جاتا ھے —

ان مشکلات کو مدنظر رکھکر میں یہی مناسب سمجھتا ھوں کہ شہریار ثانی کی وفات کو قابوس کی جلا وطنی کے زمانہ سے قبل جو سنہ ۳۷۰ ھجری سے شروع ھوکر سنہ ۳۸۸ ھجری پر ختم ھوتا ھے مان لیا جائے اور اس کے دربار میں فردوسی کے جانے کے قصہ کو بے بنیاد تصور کیا جائے —

ایک فرانسیسی کتاب میں (مملوکۂ پروفیسر محمد شفیع ایم۔اے وائس پرنسپل اورینٹل کالج لاہور) جس کا نام اس وقت میری یاد سے اتر گیا ھے۔ شہریار ثانی۔دارا اور شہریار ثالث کے سنین سلطنت حسب ذیل ملتے ھیں —

شہریار ثانی جلوس سنہ ۳۱۷ ھجری م سنہ ۹۲۹ عیسوی — وفات سنہ ۳۵۵ ھجری م سنہ ۹۶۹ عیسوی — دارا جلوس سنہ ۳۵۵ ھجری م سنہ ۹۶۹ عیسوی — وفات سنہ ۳۶۲ ھجری م سنہ ۹۷۲ عیسوی — شہریار ثالث جلوس سنہ ۳۶۲ ھجری م سنہ ۹۷۲ عیسوی — وفات سنہ ۳۹۷ ھجری م سنہ ۱۰۰۶ عیسوی —

ان سنین پر بظاھر کوئی اعتراض وارد نہیں ھوتا۔اب ظاھر ھے کہ شہریار ثانی کے پاس فردوسی کا سنہ ۴۰۰ ھجری میں جانا ناممکن ھے۔ رھا شہریار ثالث۔اول تو اس کے دربار میں فردوسی کا جانا تسلیم نہیں کیا جاتا۔اگر مان لیا جائے کیونکہ تاریخ عتبی میں اسی شہریار کو اسپہبد شہریار بن شروین کے نام سے یاد کیا گیا ھے۔اس لئے احتمال ھوسکتا ھے کہ فردوسی اس کے پاس گیا ھو۔لیکن فردوسی کو اس کے پاس جانے کے لئے کوئی وقت نہیں ملتا۔شہریار ثالث سنہ ۳۹۷ ھجری میں وفات پاتا ھے لیکن وفات سے قبل ایک عرصہ قید میں گذارتا ھے اس لئے سنہ ۴۰۰ ھجری میں فردوسی اس کے ھاں بھی نہیں جاسکتا —

ایک اور امر قابل توجہ ھے۔مرزا محمد حاشیۂ چہار مقالہ صفحہ ۱۹ میں

لکھتے ھیں کہ چھار مقالہ کے تمام نسخوں میں شہریار کے بجاے شہرزاد اور طہران کے مطبوعہ چھارمقالہ میں شیرزاد اور ابن اسفندیار کی تاریخ طبرستان کے نسخوں میں شہریار تھا چونکہ تاریخ میں کسی شہرزاد یا شیرزاد کا سراغ نہیں چلا اس لئے انھوں نے ابن اسفندیار کی سند پر شہریار اختیار کر لیا۔ بہرحال یہ شہریار یا شیرزاد خواہ ھم اس کو کسی نام سے پکاریں ایک ایسی عجیب ھستی ھے جس کے نام اور شخصیت پر پردہ پڑا ھوا ھے اور کوئی تعجب نہیں اگر نظامی عروضی نے اپنے قصہ کو نمکین بنانے کے لئے تراش لیا ھو—

بقول نظامی شہریار محمود کو اپنا آقا تسلیم کرتا ھے اور کہتا ھے "محمود خداوندگار منست" لیکن ھمیں معلوم ھے کہ ان ایام میں سلطان محمود کا طبرستان سے کوئی تعلق نہیں تھا ان ممالک کا بادشاہ قابوس بن وشمگیر تھا اور شہریار اس کا محکوم تھا۔ان حدود میں محمود کے سیاسی اثرات قابوس کی وفات کے ایک عرصہ بعد پھیلتے ھیں—

حق یہ ھے کہ فردوسی نہ طبرستان گیا نہ اور کہیں بلکہ جب سلطان محمود سے مایوس ھوا امیر ابوالمظفر نصر بن ناصرالدین برادر سلطان محمود کے پاس خراسان یا سجستان چلا گیا۔ میرا یہ عقیدہ خود شاھنامہ کے بیانات پر مبنی ھے نصر ان ایام میں یا امیرالجیوش خراسان تھا یا والی سجستان۔اس کا ایک درھم ضرب سجستان سنہ ۴۰۱ ھجری راقم کے پاس موجود ھے—

داستان شیریں خسرو کی تمھید میں فردوسی شاھنامہ کے ذکر کے بعد سلطان سے اپنے تعلقات کی برھمی کا تذکرہ یوں بیان کرتا ھے—

بود بیت شش بار بیور ھزار سخنہاے شایستۂ غمگسار
نہ بیند کسے نامۂ پارسی نوشتہ بابیات صد بار سی
اکر باز جویند ازو بیت بد ھمانا نباشد کم از پنج صد

چنیں شہریارے و بخشندۂ　　بگیتی ز شاہاں درخشندۂ
نکرد اندریں داستانہا نگاہ　　ز بدگوے و بخت بد آمد گناہ
حسد برد بدگوئی در کار من　　تبہ شد بر شاہ بازار من

اور سالار شاہ یعنے امیر نصر کی خدمت میں شاہنامہ پیش کر کے صلہ کا امیدوار ہوتا ہے ساتھہ ھی امیر نصر سے استدعا کرتا ہے کہ امیر سلطان سے اس کی سفارش کر دے - چنانچہ شاہنامہ —

چو سالار شہ ایں سخنہاے نغز　　بخواند ببیند بپاکیزہ مغز
ز گنجش من ایدر بوم شادماں　　کزو دور باد ابد بدگماں
وزاں پس کند یاد بر شہریار　　مگر تخم رنج من آید ببار
کہ جاوید باد افسر و تخت او　　زخورشید تابندہ تر بخت او

اشعار بالا میں فردوسی سلطان کی نا قدردانی کا شاکی ھے جو دشمن کی سعایت اور بدگوئی کا نتیجہ ھے اس بدگوئی کی تشریح اور تاویل تذکرہ نگاروں نے فردوسی کے اعتزال اور شیعیت سے کی ھے لیکن ان اشعار پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ھے کہ یہ تاویل بالکل غیر موزوں ھے اور میرا ذاتی عقیدہ ھے کہ اس بدگوئی کا فردوسی کے مذھب سے کوئی تعلق نہیں تھا - عام اس سے کہ وہ شیعہ ہو یا معتزلی یا سنی مختصر یہ کہ مذھب سے اس کو کوئی تعلق نہیں ھے —

حقیقت نفس الامر یہ ھے کہ قدما بھی فردوسی کے مذھب سے اسی قدر تاریکی میں ھیں جس قدر کہ ھم اور ھمارے اھل عصر - ذیل میں شاھنامہ سے وہ اشعار نقل کئے جاتے ھیں جو ھمارے شاعر کی شیعیت کے ثبوت میں پیش کئے جا سکتے ھیں - دیباچۂ شاھنامہ میں خلفاے راشدین کا نام بنام ذکر کے بعد جیسا کہ اھل تسنن کا دستور ھے یہ اشعار آتے ھیں —

حکیم ایں جہانرا چو دریا نہاد　　بر انگیختہ موج ازو تند باد
چو ھفتاد کشتی برو ساختہ　　ھماں بادبانہا بر افراختہ

یکے پہن کشتی بسان عروس   بیا راستہ ھمچو چشم خروس

محمد بدو اندروں با علی   ھماں اھل بیت نبی و وصی

خردمند کز دور دریا بدید   کرانہ نہ پیدا نہ بن ناپدید

بدانست کو موج خواھد زدن   کس از غرق بیروں نخواھد شدن

بدل گفت اگر با نبی و وصی   شوم غرقہ دارم دو یار وفی

ھمانا کہ باشد مرا دستگیر   خداوند تاج و لوا و سریر

خداوند جوے و می وانگبیں   ھماں چشمۂ شیر و ماء معیں

اگر چشم داری بدیگر سراے   بنزد نبی و علی گیر جاے

گرت زیں بد آید گناہ منست   چنیں است ایں رسم و راہ منست

دلت گر براہ خطا مایل است   ترا دشمن اندر جہاں خود دلست

نباشد جز از بے پدر دشمنش   کہ یزداں بآتش بسوزد تنش

خلفاے راشدین کی منقبت کے بعد ھی دیباچہ میں ان اشعار کا ایراد ان کی حثیت کو مشتبہ کر رھا ھے۔ پچھلے تین اشعار جن میں غیر ضروری جوش دکھایا گیا ھے رھا سہا پردہ فاش کر دیتے ھیں۔ فردوسی سے سخت اشتعال کے موقعوں پر بھی ایسی سخت زبان کی مشکل سے امید کی جاتی ھے۔ وہ جس طرح نرم گفتاری اور شیریں زبانی کی تلقین کرتا ھے اُسی طرح اس پر عمل بھی کرتا ھے۔ اس بارہ میں اس کا مقولہ ھے ——

درشتی زکس نشنود نرم گوئے   سخن تاتوانی بآزرم گوئے

اور جو لوگ شاھنامہ کے ذریعہ فردوسی کے اخلاق خصائل اور سیرت سے واقف ھیں ھرگز یقین نہیں کرسکتے کہ فردوسی ان اشعار کا مصنف ھے۔ نیز شاھنامہ کا دیباچہ تنگ چشمانہ مذھبی جوش دکھلانے کے لئے قطعی غیر موزوں مقام ھے۔ اظہار عقیدت کی غرض سے میں مانتا ھوں کہ فردوسی شیعہ ھونے کی بنا پر محبت و تفضیل حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے لئے جو چاھتا لکھتا لیکن نہ

یسی زباں میں جس سے دوسرے فریق کی دل آزاری کا احتمال ہو۔سلطان محمود ایک سنی بادشاہ تھا اور شیعہ حلقوں میں کٹا سنی مانا جاتا ہے۔بلکہ نظامی عروضی کہتا ہے "سلطان محمود مردے متعصب بود" (چہار مقالہ صفحہ ۴۹) ایسے بادشاہ کے دربار میں اول تو سلاطین بویہ و دیالمہ کو چھوڑ کر فردوسی کا جانا کیا ضرور تھا اور اگر گیا تھا تو اپنے مذہب کا آشکارا کرنا کیا فرض تھا اور اگر کیا تھا تو صورت حالات میں سب سے معقول اور سنجیدہ طریقہ یہی تھا کہ اپنے مذہب کا ایسے الفاظ میں ذکر کرتا جس سے کم سے کم درباری مذہب کو یا وہ مذہب جس کا سلطان پیرو تھا صدمہ نہ پہونچتا کیونکہ سلطان کے ہاں فردوسی (اور اس امر پر تمام اسناد متفق ہیں) انعام اور صلہ کی امید میں گیا تھا نہ اس کے مذہب پر سب وشتم کرنے اور اپنے مذہب کی تلقین کرنے۔میرا مقصد اسی قدر ہے کہ فردوسی کو معقول پسند انسان ہونے کے لحاظ سے سلطان کے مذہبی جذبات کو کسی طرح برافروختہ کرنا نہیں چاہئے تھا۔اس قدر جاننے کے بعد جب ہم شاہنامہ میں ایسے اشعار دیکھتے ہیں:— دلت گر براہ خطا مائلست— ترا دشمن اندر جہاں خود دلست— نباشد جزاز بے پدر دشمنش— کہ یزداں باتش بسوزد تنش— تو ہمارا استعجاب اس کے انتہائی درجہ تک پہونچ جاتا ہے۔اگر فردوسی ان اشعار کا مالک ہے تو ہم کو ماننا ہوگا کہ یا تو اس کو سلطان سے صلہ کی کوئی توقع تھی ہی نہیں یا یہ کہ مذہبی جنوں اس پر غالب تھا جن کے اثرات میں اس نے محمود جیسے جابر بادشاہ کے تعصبات مذہبی کی پروا نہ کر کے اس کے جلال اور دبدبہ اور کرو فرو مطلق العنانی کو یک قلم فراموش کر کے صاف صاف اس کو خارجی بنا دیا اور اس کے منہ پر کہہ بھی دیا۔تم اگر راہ خطا پر چلتے ہو تو تم خود اپنے دشمن ہو۔حضرت علی کا دشمن ایک بے پدر ہی ہو سکتا ہے جس کو خدا آتش جہنم میں جھونکے۔اب یہ راہ خطا کیا ہے اور حضرت علی کرم اللہ وجہہ کا دشمن کون ہے! خارجی فرقہ! فردوسی صلہ کی

امید میں دربار سلطانی میں جاتا ہے نہ اس کو خارجی المذہب بیان کرنے اور بلا وجہ اشتعال دینے۔ اگر اس کو جنون نہ کہا جائے تو کیا سمجھا جائے —

ہماری خوش عقیدگی کو اس کے انتہائی مدارج تک پہونچا دینا ہے اگر ہم سے اس اعتقاد کی امید کی جائے کہ یہ اشعار فردوسی نے واقعتاً سلطان کو خطاب کرکے پڑھے تھے۔ اس سے میں یہ مان لینا ہزار درجہ بہتر سمجھتا ہوں کہ وہ الحاقی ہیں اور فردوسی نے ہرگز نہیں لکھے —

دیباچہ کے علاوہ شاہنامہ میں دو تین مقام اور ایسے ہیں جہاں شیعیہ رنگ کے اشعار ملتے ہیں۔ مثلاً خاتمۂ داستان سیاوش کے یہ ابیات —

بداں گیتیم نیز خواہش گر است　　　که با ذوالفقار است و با منبر است
منم بندۂ اہل بیت نبی　　　سر افگندہ بر خاک پائے وصی

اور داستان نوش زاد کے خاتمہ کے یہ ابیات —

اگر در دلت ہیچ مہر علی است　　　ترا جد شبیر بخواہش گریست
بہیندو بدو رستہ گردیم و بس　　　در رستگاری جز او نیست کس
اگر در دلت زو بود ہیچ ریغ　　　بداں کو بہشت از تو دارد دریغ
دل شہریار جہاں شاد باد　　　ہمیں گفتۂ من ورا یاد باد
جہاندار محمود جویاے حمد　　　کزو در همه دل بود جاے حمد
سر تاج او شد ستون سپہر　　　ہمیشه ز فرش فروزندہ مہر

داستان نوشزاد فردوسی کے غزنوی کلام سے تعلق رکھتی ہے جیسا کہ سلطان کے مدحیہ ابیات سے صاف ظاہر ہے۔ یہاں پھر فردوسی سلطان کو اپنے مذہب کی تلقین کر رہا ہے اور بد قسمتی سے ایسی طرز میں جو ایک معمولی مستمع کو بھی ناگوار گذرے چہ جائیکہ ایک سلطان جابر و قاہر کو جو محمود کے پایہ کا ہو اور خود اپنے مذہب میں سخت ہو۔ حضرت علی سے کینہ رکھنے والا خوارج کے سوا اور کوئی نہیں —

ان اشعار کو بھی پہلے اشعار کی طرح میں الحاقی مانتا ہوں۔مذکورۂ بالا وہ تمام عنصر ہے جس پر شاہنامہ میں فردوسی کی شیعیت کی شہادت ختم ہو جاتی ہے —

ہجو میں اس کی شیعیت کے اثبات کا مواد شاہنامہ سے بھی زیادہ ملتا ہے یہاں میں وہ اشعار بھی حوالۂ قلم کرتا ہوں —

۱- مرا غمزہ کردند کاں بد سخن — بمہر نبی و علی شد کہن
۲- ہر آنکس کہ دردلش کین علیست — ازو خوار تر در جہاں گو کہ کیست
۳- منم بندۂ ہردو تا رستخیز — اگر شہ کند پیکرم ریز ریز
۴- من از مہر این ہردو شہ نگذرم — اگر تیغ شہ بگذرد بر سرم
۵- نباشد جز از پے پدر دشمنش — کہ یزداں بآتش بسوزد تنش
۶- منم بندۂ اہل بیت نبی — ستایندۂ خاکپائے وصی
۷- نترسم کہ دارم ز روشندلی — بدل مہرجان نبی و علی
۸- چہ گفت آں خداوند تنزیل و وحی — خداوند امر و خداوند نہی
۹- کہ من شہر علمم علیم دراست — درست این سخن قول پیغمبر است
۱۰- گواہی دہم کین سخن راز اوست — تو گوئی دو گوشم بر آواز اوست
۱۱- چو باشد ترا عقل و تدبیر و رائے — بنزد نبی و وصی گیر جائے
۱۲- گرت زین بد آید گناہ منست — چنین است و این رسم و راہ منست
۱۳- بایں زادہ ام ہمبریں بگذرم — چناں داں کہ خاک پئے حیدرم
۱۴- ابا دیگراں مر مرا کار نیست — بدیں در مرا جائے گفتار نیست
۱۵- چو بر تخت شاہی نشاند خدائے — نبی و علی را بدیگر سرائے
۱۶- گر از مہر شاں من حکایت کنم — چو محمود را صد حمایت کنم
۱۷- جہاں تا بود شہریاراں بود — پیامم بر تاجداراں بود
۱۸- کہ فردوسی طوسی پاک جفت — نہ این نامہ بر نام محمود گفت

۱۹- بنام نبی و علی گفته ام گہر ھاے معنی بسے سفته ام

سلطان محمود کی ھجو بقول نظامی برباد کردی گئی تھی-موجودہ ھجو ایک مجعول * دستاویز ھے اور فردوسی سے کوئی علاقه نہیں رکھتی اور نه فردوسی کے عہد تک اس کی سراغرسی ھو سکتی-اشعار نمبر ۵-۸-۹-۱۰-۱۱-۱۲-۱۳-۱۴-شاھنامه کے دیباچه سے منقول ھیں-بیت نمبر (۶) داستان سیاوش کے خاتمه پر ملتا ھے-نمبر (۱۵) شاھنامه کے قلمی نسخوں میں مل جاتا ھے اور یوسف زلیخا سے فردوسی کے دیباچه میں بھی منقول ھے-ابیات نمبر (۱) و (۸) نظامی کے چہار مقاله میں ملتے ھیں—

کیا یه امر قابل حیرت نہیں که فردوسی شاھنامه میں امیر نصر کے سامنے جیسا که اوپر دیکھا جاچکا ھے صرف دشمن کی بدگوئی کے بیان پر قناعت کرتا ھے اور کوئی تشریح نہیں کرتا که وہ بدگوئی کس نوعیت کی تھی-دیباچۂ قدیم صرف اس بیان پر قناعت کرتا ھے "که سخن در مذھب خود گفته" لیکن یه بیان نہیں کرتا که وہ مذھب کیا تھا- فردوسی سے ایک اور نصف صدی بعد نظامی دعوے سے کہتا ھے که وہ بدگوئی فردوسی کا اعتزال اور شیعیت تھی جو ھجو کے اشعار میں محبت نبی وعلی کے نام سے یاد کی گئی ھے-حقیقت میں اگر فردوسی کو اس بدگوئی کی اصلی نوعیت سے اطلاع ھوتی تو وہ امیر نصر کو ضرور اس سے واقف کرتا اگر کوئی جھوتی تہمت تھی تو اس کی تردید کرتا-اگر راست تھی تو عذر اور معافی کا خواستگار ھوتا-اس قدر ضرور ھے که وہ بدگوئی خواہ کسی قسم کی کیوں نه ھو فردوسی اس اتہام سے اپنے آپ کو بے قصور سمجھتا تھا- سلطان کی ناقدردانی کے باوجود وہ سلطان کی توجه اپنے معاملات میں مبذول کرنے کا ساعی تھا کیونکه امیر نصر سے وہ ملتمس ھے که آپ بھی میری اس محنت

---

* اس مضمون پراکتوبر سنه ۱۹۲۱ع کے رسالۂ اردو میں مفصل بحث کی جا چکی ھے—

کی داد دیں اور سلطان سے سفارش کرکے میرے نہال امید کو بارور کریں اگر یہ ناقدری فردوسی کے مذہب کی بنا پر تھی تو فردوسی امیرنصر کے ہاں ہرگز نہ جاتا کیونکہ خود امیرنصر اسی مذہب سے تعلق رکھتا تھا جو فردوسی کے نزدیک مذہب خوارج تھا—

اعتزال اور شیعیت کی تہمت اگر واقعی فردوسی ایسا تھا تو کوئی ایسا گہرا راز نہیں تھا جو امیرنصر سے چھپایا جاتا کیونکہ نصر سے فردوسی کے تعلقات خوشگوار تھے-شاہنامہ میں کئی موقعوں پر فردوسی اس کی مدح سرائی کر رہا ہے اور اسی وجہ سے اس موقعہ پر وہ اس کے پاس جاتا ہے-شیعہ یا معتزلی ہونا ان ایام میں کوئی جرم نہیں تھا پھر کیا وجہ ہے کہ فردوسی نصر سے چھپاتا اور ہجو میں اس کو بیان کرتا ہے-میری دلیل یہی ہے کہ فردسی اپنے بدگو اور اس کی بدگوئی کی نوعیت سے ناواقف محض تھا اس لئے وہ نہ جان سکا-لیکن فردوسی کے بعد میں آنے والی نسلوں نے ان اشعارکی تاویل کی غرض سے جو امیرنصر کے ذکر میں اس سے قبل مذکور ہوچکے ہیں اس کو مذہبی رنگ دیدیا کیونکہ یقین کے ساتھہ کہا جاسکتا ہے کہ محض ان اشعار کی تشریح میں تذکرہ نگاروں اور فردوسی پرستوں نے یہ تمام طوفان بے تمیزی اٹھایا ہے ورنہ ہمعصر تاریخیں فردوسی اور مذہبی بنا پر سلطان کی اس کے ساتھہ بدسلوکی کا ایک حرف بھی نہیں کہتیں—

یہ بھی یاد رہے کہ فردوسی نے ہجو کے ایک سو اشعار میں اونیس بیس ابیات اپنی شیعیت کے اظہار میں صرف کئے ہیں-اگر مختلف ہجوؤں سے یہی اشعار فراہم کئے جائیں تو ان کی تعداد ساٹھہ تک پہونچے گی-لیکن شاہنامہ کے ساٹھہ ہزار ابیات میں اسی رنگ کے اشعار کلہم اٹھارہ اونیس ملتے ہیں-ہجو کے میدان میں فردوسی کا یکایک اس قدر جوشیلا شیعی ہو جانا نہایت غیر معمولی معلوم ہوتا ہے-اگر یہ کہا جائے کہ شاہنامہ کے دوران میں وہ اپنے

اصلی جذبات کا اظہار سلطان محمود کے تعصب کی بنا پر نہیں کرسکتا تھا تو یہ کوئی سنجیدہ عذر معلوم نہیں ہوتا۔اس لئے کہ شاہنامہ کے ضمن میں بعض موقعوں پر نہ صرف اپنے مذہبی جذبات کا ذکر کرتا ہے بلکہ ساتھ ہی سلطان کو اس طرح سے خطاب کرتا ہے کہ گویا وہ خارجی تھا—

شاہنامہ کا اکثر حصہ طوس میں لکھا گیا ہے جہاں کوئی چیز فردوسی کو اپنے مذہبی جذبات کے اظہار سے مانع نہیں تھی لیکن تعجب سے دیکھا جاتا ہے کہ اس حصۂ شاہنامہ میں (جو موجودہ شاہنامہ کی ڈھائی جلدوں سے زیادہ ہے) صرف ایک موقعہ پر اس نے دو بیت منقبت میں لکھے ہیں۔ جو داستان سیاوش کے خاتمہ میں ملتے ہیں اور جن کو میں اوپر نقل کر آیا ہوں۔شاہنامہ کا باقی حصہ (قریباً ڈیڑھ جلد) غزنی میں لکھا گیا ہے چنانچہ دیباچہ اور داستان نوشزاد اس نے غزنیں ہی میں لکھی ہیں۔انہی دو مقام پر منقبت کے سلسلہ میں اس نے ایسے شعر بھی لکھے ہیں جن پر ہر سنی اعتراض کر سکتا ہے تو کیا اس سے یہ سمجھا جائے کہ فردوسی کو غزنیں پہنچ کر جو اہل تسنن کے زیر اثر تھا یہ بات یاد آئی کہ مذہباً میں شیعہ ہوں اور مجھ کو اپنے مذہب کا اظہار کرنا بھی ضروری ہے اور وہ بھی اس طریقہ پر کہ جس سے دوسرے فرقہ کی دل آزاری ہو۔میں کہتا ہوں کہ ایسی تنگ خیالی فردوسی کے مذاق اور اخلاق سے بعید بلکہ ابعد ہے—

ذیل میں اس قصیدہ کا ذکر کیا جاتا ہے جو مجالس المومنین میں قاضی نوراللہ شوستری نے فردوسی کی طرف منسوب کیا ہے۔مجالس المومنین میں شیعہ شعرا کی فہرست میں فردوسی کو سب سے اول جگہ دی گئی ہے۔قاضی صاحب کا عقیدہ ہے کہ شاہنامہ فردوسی نے طوس میں بنام نبی و علی لکھا تھا اور سلطان محمود کی خاطر اصحاب ثلثہ کا ذکر تقیہ کر کے کر دیا ہے۔نبی و وصی کے نام پر شاہنامہ لکھے جانے کا ثبوت قاضی صاحب ہجو کے ان اشعار سے دیتے ہیں —

که فردوسی طوسی پاک جفت   نه این نامه بر نام محمود گفت
بنام نبی و علی گفته ام   گهر هاے معنی بسے سفته ام

اب موقعه آگیا هے که میں اس قصیده کو هدیهٔ ناظرین کروں:—

اگر بری بخم زلف تابدار انگشت
ز زلف خویش برآری بزینهار انگشت
مگر شمارهٔ زلف تو میکند شانه
که کرده در خم زلف تو بیشمار انگشت
گره کشود ز رگهاے جان خسته دلاں
چو کرده زلف سیاه تو تا تار انگشت
بحرف قتل من انگشت کش نهادي دوش
سرم فداے تو زین حرف بر مدار انگشت
سزاے شهد شهادت شهید عشق بود
جو یار تیغ بر آرد دلا برار انگشت
پے نظارهٔ مشکیں هلال تو هر ماه
کشدمه نو ازیں نیلگوں حصار انگشت
بمستي آرزوئے پایبوس او کردم
نهاد بر لب چوں نوش خود نگار انگشت
دلا چو پیر شدی بگذر از هوا و هوس
ز بهر آرزوے نفس خود برار انگشت
بگو که بود که شد فتحیاب خیبر ازو
که کرد بر در آں قلعه استوار انگشت
که پاره کرد کمند نفاق و رشتهٔ کفر
بکاهواره که زد دردهاں مار انگشت

علی عالی اعلی که دست همت او
هزار پے زدہ در چشم ذوالخمار انگشت
شہے که تا بدو انگشت در ز خیبر کند
برآمد از پئے اسلام صد هزار انگشت
شہے که زو بدو انگشت مرہ را بدونیم
برائے قتل عدو ساخت ذوالفقار انگشت
شہے که دلدل او را گه خرامیدن
بخارہ در شدیش دست و پا چهار انگشت
ز تیغ دست تو جان بردوز جهان ایمان
هر آنکه کرد بدین تو استوار انگشت
ز دست تیغ تو جان بروے ار برآوردے
پئے شهادت دین تو ذوالخمار انگشت
کسے که حب تواش نیست تا بروز شمار
بهرزہ گوی به تسبیح بیشمار انگشت
کسیکه دست بدامان حیدر و آلش
نزد بسا که بدندان کند فگار انگشت
شہا تراست مسلم کرم که گاہ رکوع
کند برائے تو انگشتری نثار انگشت
کمینه چاکر و مداح تست فردوسی
همیشه با قلمش گشته دستیار انگشت
قبول کردہ غلامی قنبر تو بجان
نهادہ از مژہ بر چشم اشکبار انگشت
بزرگوار خدا یا بحق حیدر و آل
در آن نفس که رود خلق را زکار انگشت

موالیان علی را ز روے لطف و کرم
ز هول روز جزا بر قراردار انگشت
شہا غلام غلام تو ام مرا مگزار
برائے فاقه برآرم بزینهار انگشت *

قاضی صاحب نے فردوسی کی شیعیت کا اس قصیدہ سے ثبوت دیا هے جس میں لطف یه هے که فردوسی کا تخلص تک موجود هے- معلوم ایسا هوتا هے که شاهنامه کی رو سے فردوسی کی شیعیت کی شہادت قاضی صاحب کی نگاہ میں ناکافی تهی اس لئے یه قصیدہ چونکه میں واقف هوں قاضی صاحب نے اکثر سنی مشاهیر کو اپنی جماعت میں شامل کر لیا هے اس لئے مجهکو شبهه هوتا هے که کہیں فردوسی کے ساتهه بهی وهی سلوک مرعی نه کیا گیا هو لیکن میں اس قصیدہ کے متعلق چند نکات پیش کرتا هوں—

(۱) تمام دنیا تلاش میں هے که فردوسی کا کلام به صورت قطعه و قصیدہ و غزل دستیاب هو لیکن نو صدیاں گزرنے کے باوجود چند قطعات کے سوا جو اکثر قدیم و جدید تذکروں میں ملتے هیں ایک شعر بهی نہیں ملتا- قاضی صاحب نہایت خوش قسمت هیں که ان کو پورا قصیدہ مل گیا- لیکن بدقسمتی سے انہوں نے اس کا کوئی ماخذ نہیں دیا- اس لئے یه شبهه کرنے کے لئے کافی گنجائش هے که کہیں وہ مجعول نه هو—

(۲) کلام پر نظر ڈالتے هوئے کہا جا سکتا هے که قصیدۂ بالا کی زبان فردوسی کے عهد اور کلام سے کوئی علاقه نہیں رکهتی- زبان کی یه روانی- بندشوں کی چستی- ترکیبوں کی لمبی نشست- کنایات و محاورات و اضافات زیادہ تر قاضی صاحب کے عهد میں پائے جاتے هیں—

* از مجالس المومنین—

(۳) ردیف جو فارسی شاعری کا اسلوب خصوصی ہے انگشت نمائی کر رہی ہے کہ فردوسی کے عہد میں عام طور پر اس کا رواج نہیں تھا اور نہ ایسی سنگلاخ زمینوں میں جس میں یہ قصیدہ لکھا گیا ہے ان ایام میں قصیدے لکھے جانے کا دستور تھا۔ دواوین عنصری۔ فرخی اور منوچہری کے تتبع سے یہ نکتہ آسانی کے ساتھ پایۂ ثبوت کو پہونچ سکتا ہے—

(۴) تخلص کی موجودگی اس کی حالت کو اور بھی مشتبہ کئے دیتی ہے کیونکہ شعرا ان ایام میں اپنے تخلص کے استعمال کے پابندی کے ساتھ عادی نہ تھے۔ بالخصوص فردوسی اس بارہ میں نہایت بے پروا ہے۔ شاهنامہ میں دقیقی کے اشعار کے آغاز واختتام پر دو جگہ اس کا تخلص ملتا ہے۔ لیکن قدیم نسخوں میں انہی اشعار میں " گویندہ " تھا جس کی بجاے متاخرین نے فردوسی بنا دیا ہے —

ایک اور مجعول قصیدہ جو فردوسی کی طرف منسوب ہے ذیل میں حوالۂ قلم کیا جاتا ہے —

اے دل ار داری ہواے جنت الماوی بیا
در حریم کبریا بے کینہ و کبر و ریا
گر بقائے جاوداں خواہی رہ عقبی گزیں
ور سرائے خلد خواہی بگذر از دار الفنا
نعمت اسلام عامست ونہ خاص از بہر عام
خوان دیں گستردہ و دردادہ مردم را صلہ
جہد کن تا ناسزا ہرگز نہ گوئی با کسے
ور بگوئی نا سزا یابی جزا روز جزا
عاقل دنیا و دینی آنکہ از علم و عمل
سنت احمد بجاآری و فرض کبریا

سنت احمد بود از حب اولاد رسول
زانکه فرض کبریا باشد ز حب مرتضیٰ
بگذرانی پایۂ قدر خود از ایوان عرش
گر بجا آری زایماں شرح شرع مصطفا
کے رسی هرگز بسر حکمت عهدالست
تانخوانی معنئے ایات قرآں هل اتیٰ
معنئے قراں کلام الله اگر دانی بحق
از پئے فصل ولی الله بر خوان انما
گر هنر از تیغ میجوئی مجو جز ذوالفقار
ور حدیث از جود میگوئی مگو جز لافتیٰ
لافتیٰ الا علی لاسیف الا ذوالفقار
مادر شبیر و شبر فاطمه خیرالنسا
پس بریں معنی نظیرش در جهاں هرگز نبود
گر تو گوئی بود در گیتی کدا میں کے کجا
رو بتوریت کلیم و بشنو ازیچوں که چوں
خواند احمد میت میت و مرتضیٰ را عیلیا
دیدۂ تحقیق بکشا و به بیں عین‌الیقیں
در ولایاتش نشان معجزات انبیاء
گر خلیل‌الله نبود معجز اندر منجنیق
کاں زماں آمد درون نار نمرود از هوا
گر شد اندر نار ابراهیم هم خوش درگذشت
از سه فرسنگ آتش مدین علی مرتضیٰ
هم شنودی کزپئے فتح سلاسل بوالحسن
رفت اندر منجنیق و شد دراں حصن از قضا

گر کلیم حق بمعجز از سر چاہ شعیب
بر گرفت و باز پشت افگند سنگ آسیا
لام و جیم الف من از حصن حیدر در بکند
مرتضیٰ در باز پشت افگند چل گام از قضا
گر بموسیٰ داد بعد از مدتے دختر شعیب
در زمان دختر بحیدر داد شاہ انبیا
داد گرگے پاسخ یعقوب چون پرسید ازو
بهر فرزند عزیز آن یوسف زیبا لقا
نیز با شیر خدا هم گرگ آمد در سخن
از براے گوسفند آن زن پیر دغا
صالح پیغمبر از معجز اگر پیش گروہ
یک شتر آورد بیرون از صیل گاہ دعا
حیدر از تل حصا آورد بیرون اشتران
یک قطار او داد در قرض نبی فخر رجا
پس بسان موسیٰ و هارون بقرب و منزلت
ابن عم خواند او بمعنی او ز خود داماد را
ذوالفقار از بهر دفع کفر حیدر را بداد
همچنان از بهر دفع سحر موسیٰ را عصا
گر شد اندر دست داؤد نبی آهن چو موم
از براے درع و دفع تیر در روز وغا
پیل آهن نیز حیدر ساخت در حال آوژہ
خو زده شد هم سنگ خارا در کفش چون توتیا
راستی را گر بملک اندر سلیمان نبی
مور را دانست دفعاً زد مرغا نرا ندا

بوالحسن مفتی مور و مار و ماهی بود و درغ
قاضی باز و کبوتر میر نمل و اژدها
گر ز روے معجز مطلق بهر حدے مگر
از دم عیسیٰ مریم مردہ یا بیدے بقا
جمجمه اندر زمیں با آب و ابقا کبر کرد
زندہ شد از نطق حیدر بعد چندیں سالها
اندریں گردون گرداں قرص ماہ نور بخش
شد دونیم از معجزات مصطفاے مجتبا
از براے طاعت عصرش علی را بازگشت
خسرو سیارگاں خورشید در اوج سما
چشم بر کندہ بریدہ دست قصاب از دمش
شد درست و بهتر از اول بفرمان خدا
اینهمه برهاں و صد چندیں ز روے راستی
گر براے دیگراں داری بیاور انما
کهربا گر زانکه با قیمت بود اماں ولے
نزد عاقل قیمت گوهر ندارد کهربا
گر بدانی نور حیدر همچو نور مصطفیٰ
از خداوند جهاں آید بجانت مرحبا
چوں کنم شرحش چگویم چوں همی نالم ز درد
هر زماں از درد جانسوز شهید کربلا
بر نگردم از رہ حب علی و آل او
از رہ حیدر بگردیدن خطا باشد خطا
هر که بر گشت از رہ حب علی و آل او
رفت و ماند او جاودانی در محنت و رنج و عنا

دولت جاویہ فردوسی طوسی را بہ بیں
گفت مدح خانداں از ھمت آل عبا

میں اس قصیدہ کے متعلق کوئی راے دینا نہیں چاھتا یہ بالکل روشن ھے کہ اس قصیدہ کو فردوسی سے کوئی علاقہ نہیں ھوسکتا۔قصہ مختصر یہ وہ تمام شہادت ھے جس کی رو سے فردوسی کی شیعیت کا ادعا کیا جاتا ھے لیکن اس میں بھی شک نہیں کہ یہ شہادت زیادہ تر ناقص اور غیر معتبر ھے۔

:o:-

فردوسی کا اعتزال

شاھنامہ کے دیباچہ میں حمد باری میں ایک شعر وارد ھوتا ھے—

بہ بنیندہ گاں آفرینندہ را نہ بینی مرنجاں دو بینندہ را

اور شعر کی معنی یہ ھیں کہ خدا کی ذات پاک کا مشاھدہ باصرہ کے ذریعہ سے ممکن نہیں اس لئے اپنی آنکھوں کو اس کے دیدار کی جستجو میں زحمت نہ دے اور شاعر کا مطلب یہ ھے کہ ذات باری کا اور ایک حواس کی معرفت نہیں ھوسکتا—

علاوہ اور تفریقی مسائل کے جو اشاعرہ اور معتزلہ میں بحث و جدال کے مورث ھوئے ھیں ایک مسئلہ رویت باری ھے اشاعرہ کا اعتقاد ھے کہ قیامت کے روز خدا کا دیدار بلا کیف ھوگا وہ اپنے مذھب کی تائید میں یہ آئیۃ کریمہ پیش کرتے ھیں وجوہ یومئذ نا ضرۃ الی ربہا ناظرہ معتزلہ جن کا اعتقاد اس کے بالکل برعکس ھے اس آیۃ شریفہ سے متمسک ھوتے ھیں لاتدرکہ الابصار وھو یدرک الابصار و ھو اللطیف الخبیر-اس آیت کی دلیل پر یہ معتزلی عقیدہ کو دینا و عقبیٰ میں خدا کا دیدار نا ممکن ھے—

شعر بالا کے استدلال پر نظامی عروضی فردوسی کو اھل اعتزال سے مانتا ھے-میرے خیال میں کسی مسلسل نظم سے منفردہ شعر لے کر خاص معنی پہنا

دینا اور پھر شاعر پر اعتراض کرنا صریح بے انصافی ہے بھلا اس شعر سے کون خیال کرسکتا ہے کہ فردوسی رویت کا منکر ہے۔شاعر کا صحیح مفہوم دریافت کرنے کی نیت سے ہم کو شعر مذکور اس کے اور اشعار کے ساتھہ ملاکر پڑھنا چاہئیے تاکہ تسلسل قائم رہے یعنے اس طرح —

خرد گر سخن بر گزیند همی — همانرا گزیند که بیند همی

به بینند گاں آفرینندہ را — نه بینی مرنجاں دوبینند را

نیاید بدو نیز اندیشه راه — که او بر تر از نام واز جائگاه

اور شاعر کا مفہوم یہ ہے کہ ہم ذات باری کے ادراک سے قاصر ہیں اس لئے کہ ہمارا تعقل انہی اشیا کے وجود کا قائل ہوسکتا ہے جو حواس کی معرفت اس تک پہونچے لیکن ذات باری کا مشاہدہ آنکھوں سے نہیں ہوسکتا۔حواس ایک طرف خدا کی ذات تو دائرہ تخیل کے تفرقات سے بھی بالا ہے —

نظامی گنجوی جو اہل تسنن سے ہیں فردوسی کی تقلید میں قریب قریب یہی خیال ادا کر رہے ہیں چنانچہ —

بآنچیز ها یا بد اندیشه راه — که باشد بد و دیده را دستگاه

خدا را نشاید باندیشه جست — که درتست هرچه آں زاندیشه رست

(سکندر نامه بحری)

اب فردوسی ایک شعر کی بنا پر جس کا تسلسل توڑ دیا گیا ہے کیونکر معتزلی مانا جاسکتا ہے اس قسم کے استدلال کی ایسی مثال ہے جیسے کوئی کہے کہ میں نماز اس لئے نہیں پڑھتا کہ قرآن مجید میں لا تقربوا لصواۃ آیا ہے اور وانتم سکارا ے کو بالکل چھوڑ جائے۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ فردوسی کے ہاں یہ ایک مقبولہ خیال رہا ہے۔ شاہنامہ میں کسی موقعہ پر فلاسفہ کی تردید اور بطلان میں کوشش کرتا ہوا فردوسی قریب قریب یہی مطلب یوں ادا کرتا ہے —

ایا فلسفه دان بسیار گوئے نپویم برا هے که گوئی بپوے
ترا هرچه بر چشم بر بگذرد بگنجد همی درد لت باخرد
چنا نداں که یزدان نیکی دهش جز آنست وزیں بر مگر داں منش
سخن هیچ بهتر ز توحید نیست نبا گفتن و گفتن ایزد یکے است

فلاسفه کے نزدیک وهی باتیں قابل قبول هیں جو حواس کی معرفت ادراک میں آسکیں اور جس کو عقل باور کر لے-فردوسی کا یه مقصد هے که ذات باری کے ادراک کے لئے یه طریقه غلط هے وہ سرحد ادراک اور اندیشه سے بری هے—

———:o:———

فردوسی کا تسنن

فردوسی کے تسنن کے متعلق اگرچه کسی تاریخ میں کوئی شهادت نهیں اور نه سنیوں میں کوئی ایسی روایت هے-شاهنامه میں کچه ایسا ذخیرہ ملتا هے جس کی بنا پر کها جا سکتا هے که وہ سنت جماعت تها-سب سے پیشتر دیباچه کے یه اشعار ملاحظه هوں—

اگر دل نخواهی که باشد نژند نخواهی که دایم بوی مستمند
چو خواهی که یابی ز هر بد رها سر اندر نیاری بدام بلا
بوی درد و گیتی ز بد رستگار نکو نام باشی بر کردگار
بگفتار پیغمبرت راہ جوے دل از تیرگیها بدیں آب شوے
ترا دین و دانش رها ند درست رہ رستگاری بیا یدت جست
چه گفت آں خداوند تنزیل و وحی خداوند امر و خداوند نهی
که خورشید* بعد از رسولان مه نتابید برکس چو بوبکر به

---

* تلمیح هے اس حدیث کی طرف "ماطلعت الشمس ولاغربت علی احد بعد النبین افضل من ابی بکر—

عمر کرد اسلام را آشکار | بیا راست گیتی چو باد بہار
پس از ہر دو آں بود عثماں گزیں | خداوند شرم و خداوند دیں
چہارم علی بود جفت بتول | کہ او را بخوبی ستاید رسول
کہ من شہر علمم علیم در است | درست ایں سخن قول پیغمبر است
گواہی دہم کیں سخن راز اوست | تو گوئی دو گوشم بر آواز اوست
بداں باش کو گفت و زیں بر مگرد | چو گفتار و رایت نیاید بدرد
علی را چنیں گفت و دیگر ہمیں | کزایشاں قوی شد بہر گونہ دیں
نبی آفتاب و صحاباں چو ماہ | بہم نسبتے یکدگر راست راہ

ان کے علاوہ یہ اشعار شاہنامہ میں اور ملتے ہیں—

(۱) بدو آفریں کو جہاں آفرید | ابا آشکارا نہاں آفرید
خداوند دارندۂ ہست و نیست | ہمہ چیز جفتست و ایزد یکیست
بپیغمبرش بر کنم آفریں | بیارانش بر ہر یکے ہمچنیں

(ساختن سیاوش کنگ وژ صفحہ ۱۲۰ جلد اول شاہنامہ)

(۲) وزو بر روان محمد درود | بیارانش بر ہر یکے بر فزود
ہمہ پاک بودند پرہیزگار | سخنہاے شاں بر گزشت از شمار

(خاتمہ داستان اردشیر بابکاں-نیایش آفرینندۂ بے نیاز و مدح و ثنائے سلطان محمود صفحہ ۹۳ جلد سوم)

(۳) وزو بر روان محمد درود | بیارانش بر ہر یکے بر فزود

(خاتمہ داستان سکندر گلۂ فردوسی از آسماں و نیایش خداے را صفحہ ۷۸ جلد سوم)

(۴) سپاس خداوند دانا کنم | زبان و خرد را توانا کنم
توانا خداوند بر ہرچہ ہست | خداوند بالا و داراے پست
فرستم درود فرستادہ اش | گزین گزینان آزادہ اش

محمد که بر بود نیها سر اوست　　خداوند را از همه اوے دوست
که ایزد ز یارانش خوشنود باد　　روان بد اندیش پر دود باد

(خاتمه شاهنامه قلمی) یه اشعار ایسے نسخوں میں ملتے هیں جن میں اختتام شاهنامه کی تاریخ سنه ۴۰۰ هجری کے بجاے سنه ۳۸۹ هجری دی گئی هے چنانچه-

اگر سال نیز آرزدت آمدست　　نهم سال هشتاد با سیصد است
مه بهمن و آسماں روز بود　　که کلکم بدیں نامه پیروز بود

(۵) حضرت عمر خلیفۂ ثانی کے حق میں داستان یزد جرد کے آغاز میں یه اشعار آتے هیں —

چناں بد کجا سرفراز عرب　　که از تیغ او روز گشتے چو شب
عمر آنکه بد مومناں را امیر　　ستوده* و را خالق بے نظیر

یه تمام وه مواد هے جس کی رو سے فردوسی کو سنی کہا جا سکتا هے-لیکن شاهنامه میں ان متضاد عناصر کی حاضری کیا استعجاب کا پہلو لئے هوئے نہیں هے- اس عقده کا حل یوں هی ممکن هے که یا تو فردوسی کو اهل تسنن و تشیع نے اپنے اپنے مذهب کا رکن بنا نے کی کوشش کی هے اور نتیجه یه هوا هے که دونوں مذهبیت کے اشعار شاهنامه میں ملنے لگے هیں لیکن سنیوں کی فارسی ادبیات سے عام بے اعتنائی خصوصاً اپنے هم مذهبوں کے خلاف ان کا تعصب ادنی ادنی اختلاف پر الحاد اور کفر و زندقه کا الزام اور تهمت تراشنے کا ان کا عام انداز بھلا ان کو کب اجازت دیتا که مطعون فردوسی کی تصنیف میں وه اپنے رنگ کے اشعار اضافه کر نے کی زحمت گوارا کرتے-نظامی عروضی نے جب که اس کو شیعه اور معتزلی بنانے پر قناعت کی تھی آشوب تورانی نے تو کوئی دقیقه اٹھا

---

* اس آیت کی طرف اشاره هے-یا ایها النبی حسبک الله و من اتبعک من المومنین-من اتبعک سے مراد فاروق اعظم هیں—

نہ رکھا*۔ہر قسم کی سب و شتم فردوسی کے حق میں استعمال کرتا ہے ——
میں چند اشعار پر قناعت کرتا ہوں شاعر فردوسی کو خطاب کر رہا ہے۔

نہ سنی نہ شیعی نہ مغ نے جہود — نہ ترسا ندانم ترا دیں چہ بود
ز ہر مذہبے فارغ از ملحدے — زدیرے بروں خارج از مسجدے
بہر مذہب و پیشہ جنگ و جدل — ز بعثت فگندن بہر دیں خلل
بہر علت از مرتدی و بدی — نجس بودی اکنوں نجس تر شدی
ازیں پیشتر سعدے بے بدل — بحق تو گویا سرود ایں مثل
کہ گر چاہ نصرانیاں نیست پاک — بشوئی اگر مردہ گبرے چہ باک+

ازیں پیش شاید سخن گوے طوس — بدوغ سخن آبش از جوے طوس
مغ مغ نسب گبر آتش پرست — بہ بیعت بہر موے بد دادہ دست
کہیں موے بد وجہ نان مجوس — بہر و خمہ مرثیہ خوان مجوس
دلش گبر و جاں گبر و گبری زباں — ز گبراں بگبری زباں قصہ خواں
دل و دیں بفرمان کسریٰ کیش — ز اسلام بیگانہ با کفر خویش
با نکارش از کعبہ گم کردہ راہ — ترا شیدہ آتش کدہ قبلہ گاہ
ز زردشت احکام دینش ستد — پرستندۂ ہیر چوں ہیر بد
ز پاژند و ژندش بدل وعظ و پند — مفسر بتفسیر استاد و ژند
بوخشوری مژدک و زردھشت — دروں دامن اعتقادش بہشت
مرادش ز زردشت پیر مغاں — براہیم پیغمبر اندر جہاں

---

* لیکن با خبر سنیوں میں وہ ہمیشہ مقبول رہا ہے چنانچہ امام احمد الغزالی۔نظامی گنجوی۔صاحب راحت الصدور۔صاحب مرزبان نامہ صاحب جہاں گشا۔شیخ سعدی اور مولانا جامی اس کے مداح ہیں ——

+ سعدی:— اگرچہ چاہ نصرانی نہ پاک است
جہود مردہ می شویم چہ باک است

شب و روز تا زندہ بر تخت و عاج　　بزرینہ کفش و بزرینہ تاج
نویسندۂ داستان مغاں　　بزرگی دہ خاندان مغاں *

شاهنامه کے متعلق بھی آشوب کی راے قابل ملاحظه هے کہا هے —

ندانم جہاں را چه ونگی گرفت　　که ملک سخن مست تنگی گرفت
زفہم سخن دور بر رفتگاں　　بتقاید هم سر بسر رفتگاں
نه پسے بردہ بر قبح گفتار تو　　نه بے لطفی و لطف اشعار تو
ز ترکیب یک چند لفظ دری　　ترا موجدے دیدہ در شاعری
بنظمت نخوا ندہ حروت زیاد　　ز شہنامه ات قصہا کردہ یاد
همه غافل از جاو بیجاے حرت　　لقب دادہ ات اوستاد شگرت
مگر شعر فہما همه مردہ اند　　ویا رفت فہم بیاں بردہ اند
کز ایراں و توراں و هندوستاں　　یکے بر نیامد ز دا نشوراں
که بر سقم گفار توراہ یاب　　کند آگہت از خطا و صواب
با لفاظ سست و ز معنت و کرخت　　چه لازم شدت نظم شہنامه گفت
ابا و ابر رستہا بیژنا　　حکیم ایں الفہاے زائد چرا
ضیافتگر نکته سنجان دهر　　نه فرمود تمئیز پا زهر و زهر
چنیں بد خورش خوانے آراستن　　چنیں بزم بیلطف پیراستن
بطعن دقیقی ز گفتار تو　　پسندم شدایں بیت ز اشعار تو
"دهاں گربماند ز خوردن تہی　　ازاں به که ناساز خوانے نہی"

+ صولت فاروقی)

---

* صولت فاروقی

+ ایک روایت سے معلوم هوتا هے که شاعر اپنے همو طنوں میں بوجه تصنیف شاهنامه جسکوادب و شعرکی خدمت کے بجاے صریحاً مجوسیوں کی خدمت کے ساتھ تعبیر کیا گیا تھا - بدنام تھا اور اسی بنا پر شیخ ابوالقاسم طوسی نے (جنکو متاخرین نے

باقی صفحه آئندہ -

یا بقول قاضی نوراللہ شوستری فردوسی نے تقیہ کرکے سنی رنگ کے اشعار بخوف سلطان محمود داخل کر دیے ہیں۔ لیکن اگر واقعہ ایسا ہوتا تو

ابوالقاسم خرقانی لکھا ہے) اسکے جنازہ کی نماز پڑھنے سے انکار کردیا تھا وغیرہ۔ یہ قصہ اگرچہ دیباچۂ بایسنغر خانی کیوجہ سے ہمارے ہاں عام طورپر مشہور ہے لیکن اسکا کوئی قدیمی ماخذ معلوم نہ تھا۔ شیخ عطار کا اسرارنامہ ہماری موجودہ معلومات کی روشنی میں اس روایت کا سب سے قدیم ماخذ ماناجاسکتا ہے جس میں یہ تمام قصہ درج ہے۔ میں یہاں بعینہ اسکو حوالۂ قلم کرتا ہوں

شنودم من کہ فردسی طوسی — کہ کرداو در حکایت بے فسوسی
بہ بست و پنج سال از نوک خامہ — بسر می برد بیت شاہنامہ
بآخر چوں رسیدش دم بآخر — ابوالقاسم کہ بد شیخ الاکابر
اگرچہ بود پیر پر نیاز او — نکرد از راہ دیں بروے نماز او
چنیں گفت او کہ فردوسی بسے گفت — ہمہ درحق گبرے نا کسے گفت
بمدح گبرگاں عمرے بسر برد — چو وقت مردن آمد بے خبر مرد
مرا درکار او برگ ریا نیست — نمازم برچنیں شاعر روا نیست
چوفردوسی مسکیں را ببردند — بزیر خاک تاریکش سپردند
درآنشب شیخ اورا دید در خواب — کہ پیش شیخ آمد دیدہ پر آب
زمرد رنگ تاجے سبز برسر — لباسے سبزتر از سبزہ در بر
بہ پیش شیخ بنشست و چنیں گفت — کہ اے جان تو با نور یقیں جفت
نکردی آں نماز از بے نیازی — کہ بے ننگ آمدت زیں بے نمازی
خداے ما جہانے پر فرشتہ — ہمہ از فیض روحانی سرشتہ
فرستادا نیست لطف کارسازی — کہ تا گروند برجانم نمازی
خطم دادند بر فردوس اعلیٰ — کہ فردوسی بفردوس است اولیٰ
خطاب آمد کہ اے فردوسی پیر — اگر راندت زپیش آنطوسی پیر
پذیرفتم منت تاخوش بخفتی — بدآں یک بیت توحیدم کہ گفتی
مشو نومید از فضل الٰہی — مدہ بر فضل ما بخلے گواہی
یقیں میداں چوہستی مرد اسرار — کہ عاصی اندک است و مرد بسیار
گر آمرزد بیکرہ خلق را پاک — نیامرزیدہ باشد جز کف خاک
خداوندا تو میدانی کہ عطار — ہمہ توحید میگوید در اشعار
ز نور تو مساعی می نماید — چوفردوسی. فقاعی می کشاید

باقی صفحہ آئندہ۔

شاهنامه میں صرف سنی رنگ کے اشعار پائے جاتے نه شعیه رنگ کے کیونکه ایسی صورت میں فردوسی اپنے مذهب کو پوشیدہ رکھنے پر مجبور رهتا-پھر جب کہ ایک طرف فردوسی سلطان کے تعصب کے خوف سے اپنے آپ کو سنی لباس میں ظاهر کررها هے-دوسری طرف شعیه رنگ میں ایسے اشعار لکھه رها هے جس سے سلطان کو خارجی بنایا جارها هے تو اس متضاد عنصر کی موجودگی میں تقیه کا نظریه ایک لمحه کے لئے بھی تسلیم نہیں کیا جاسکتا-یا وہ سلطان سے خائف تھا یا نہیں تھا اگر خائف تھا تو وہ سلطان کو خارجی کہنے کی جرأت نہیں کرسکتا تھا اور اگر خائف نہیں تھا تو اس کو اپنے مذهب کے چھپانے کی ضرورت هی نہیں تھی اور نه سنی عقیدہ کے اشعار کہنے کی حاجت —

غزنین میں فردوسی کے تعلقات سلطان کے ساتھه جب تک که دشمن کی بدگزئی کا واقعه پیش نه آیا نہایت خوشگوار تھے-شاهنامه کی بعض داستانوں سے ثابت هے که وہ سلطان کے سامنے سنائی گئی تھیں-داستان هفتخوان اسفندیار سلطان کے سامنے پڑھی گئی هے اس داستان کے خاتمه پر فردوسی کہتا هے —

اگر شاہ پیروز بپسندد ایں نہادیم بر چرخ گردندہ زیں

داستان اردشیر کی تمہید میں ایک شعر یوں آتا هے —

ز ساسان و بابک چه داری خبر بخواں هیں بشه برهمه سر بسر‡

اور سلطان سے فردوسی کی اس قدر بے تکلفی هو گئی تھی که اس سے فائدہ اٹھا کر اس نے بعض اوقات سلطان کو وعظ و نصیحت بھی کی هے چنانچه داستان اردشیر میں شاعر اور اردشیر کے انتظامات ریاست و قواعد ملکی بیان کر کے سلطان کو ان الفاظ ذیل میں خطاب کرتا هے —

چو فردوسی به بخشش رائگاں تو بفضل خرد بفردوسش رساں تو

بفردوسی که علیلیش خوانند مقام صدق و نور و نهش خوانند

لطف اسوقت تھا جب یه بیان آشوب کی نگاہ سے گذرتا —

‡ از شاہنامۂ قلمی سنه ۷۵۲ هجری—

زدانای سخن بشنو اے شہریار　　جہانرا بدیں گونہ آباد دار
چو خواهی کہ آزاد باشی ز رنج　　بے آزار و آگندہ بیرنج گنج
بے آزاری زیر دستاں گزیں　　کہ یابی ز هر کس بداد آفریں

داستان مہبود وزیر نوشیرواں کے اختتام پر شاعر ایک مرتبہ اور سلطان کو نصیحت کرنے میں مصروف ہے - کہتا ہے —

اگر دادگر باشی اے شہریار　　نمانی و نامت بود یادگار
تن خویش را شاہ بیدادگر　　جز از گور نفریں نیارد بسر
اگر پیشہ دارد دلت راستی　　چنانداں کہ گیتی تو اراستی
چو خواهی ستایش پس مرگ تو　　خرد باید اے نامور برگ تو
چناں کز پس شاہ نوشیرواں　　بگفتار من داد او شد جواں

نوشیرواں جب اپنے ملک کو چار حصوں میں منقسم کر کے رعایا و مزارعین کی بہبود کے لئے فرامین جاری کرتا ہے اس ذکر میں بوڑھا شاعر ایک مرتبہ اور سلطان کو خطاب کر کے کہتا ہے —

اگر دادگر گیتی اے شہریار　　بگیتی بمانی یکے یادگار
کہ جاوید هرکس کند آفریں　　بر آں شاہ کا باد دارد زمیں

فردوسی اس پایہ کا شخص ہے کہ اپنے مذہب کو چھپانا یا تقیہ کرنا اس کے لئے ایک ہتک کہا جا سکتا ہے دوسرے سلطان محمود کے دربار میں ہر ملت و مذہب کے شخص کا گذر تھا - جو پادشاہ هندوؤں کو اپنے لشکر میں اعلیٰ عہدے دے سکتا تھا کیا وہ ایک شیعہ شاعر کی موجودگی کا اپنے دربار میں روادار نہوتا - بالخصوص جب کہ ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ اسی سلطان نے ایک اور شیعہ شاعر یعنی غضاتری رازی کو پیلبار انعام بخشی کی ہے - غضاتری کہتا ہے —

امیدوارم کیں بار صد هزار تمام　　بمن بیارد بر پاے فیل بر فیاں*

* مسعود سعد سلمان کہتا ہے - مصرع " چوں لطف شاہ ماضی بر شاعر غضاری "

ابو ریحان البیرونی ایک اور شیعہ فاضل کو خود محمود نے خواهش کر کے اپنے دربار میں بلایا ہے۔محمود کی دو لڑکیاں شیعہ شہزادوں منوچہر بن قابوس اور عنصر المعالی کیکاؤس کو بیاهی گئی هیں۔اس لئے فردوسی کے متعلق تقیہ کا خیال میرے نزدیک بالکل غیر موزوں ہے۔شاهنامہ میں ایسے اشعار کی موجودگی جو سلطان محمود پر خارجی ہونے کی تعریض کرتے هیں صاف ظاهر کر رهی ہے کہ فردوسی ان اشعار کا قائل نہیں ہو سکتا کیونکہ فردوسی حقیقت میں اگر ایسا دیوانہ ہوتا تو محمود کے دربار سے اپنی جان سلامت نہیں لے جا سکتا تھا اس لئے میں اس عقیدہ پر آیا هوں کہ شاهنامہ میں شیعہ عقیدت کے اشعار کا ادخال کسی غیر فردوسی کا کام ہے اور خود فردوسی سے ان کو کوئی تعلق نہیں۔جن حضرات نے فردوسی کے نام پر قصائد شائع کئے هیں کیا چند اور اشعار نہیں لکھہ سکتے تھے—

لیکن فردوسی کے مذهب کا مسئلہ طے کرنے کے لئے هم کو کسی اور جدید شہادت کی ضرورت ہے جو بالکل غیر مشتبہ اور معتبر ہو۔یہ شہادت بھی شاهنامہ میں موجود ہے اور میں اس کا ذیل میں ذکر کرتا هوں—

(۱) اشاعرہ و معتزلہ میں مسئلۂ جبر و قدر سنگ تفرقہ انداز رہا ہے۔ متکلمین کے نزدیک جبر ضد عدل ہے۔اس سے ان کی مراد بندوں کی مقهوریت اور مغلوبیت ہے جس کے اثر میں ان کے تمام افعال مہد سے لے کر لحد تک گویا اقوال و افعال خدا هیں جو ان کے هاتھہ اور زبان سے ان کے اختیار اور ارادہ کے بغیر جاری کرتا ہے یعنے اعمال خیر و شر میں جو کچھہ اس زندگی میں هم سے سرزد ہونے والا ہے خدا نے اپنے علم ازلی کے مطابق هماری تقدیر میں لکھہ دیا ہے اور اس سے سر مو تجاوز نہیں کیا جا سکتا—

سعدی:- به بدبختی و نیکبختی قلم
بگردید و ما همچنین در شکم

نظامی:- اگر نیکم و گر بدم در سرشت
قضائے تو ایں نقش بر من نوشت

اورخواجہحافظ:- گناہ اگرچہ نبود اختیار ما حافظ
تو در طریق ادب کوش و گو گناہ منست

دیگر در کوئے نیک نامی مارا گذر ندادند
گر تو نمی پسندی تغییر کن قضارا

یہ اشاعرہ کا مسئلۂ جبر ہے۔صاحب گلشن راز کہتے ہیں—
ہر آنکس را کہ مذہب غیر جبر است
نبی فرمود کو مانند گبر است

یہ اس حدیث کی طرف اشارہ ہے کہ۔القدریۃ مجوس ھذہ الامۃ —

لیکن معتزلہ کا مختار یہ ہے کہ عباد اپنے اقوال و افعال میں فاعل و موجد ہیں- جبر یہ کہتے ہیں کہ عباد فاعل بالایجاب ہیں نہ فاعل بالارادہ و اختیار-خلاصہ یہ کہ معتزلہ انسانوں کو اپنے افعال کا مختار مانتے ہیں اور یہی ان کا مسئلۂ قدر ہے اور اسی بنا پر ان کو قدریہ کہا جاتا ہے-اب شیعوں اور معتزلیوں کا چولی دامن کا ساتھہ ہے اکثر مسائل ان میں عام ہیں چنانچہ اس مسئلہ میں دونوں فرقے متفق ہیں—

محمد باقر بن محمد تقی فرماتے ہیں:—

" و بندگان در فعل خود مختار اند و خود فاعل فعل خود اند خواہ اطاعت باشد خواہ معصیت و اکثر امامیہ و معتزلہ باین قول قائل اند اشاعرہ کہ اکثر اہل سنت اند میگویند فاعل ہمہ افعال بندۂ خداست و بندگان مطلق در آنہا اختیار ندارند بلکہ خدا بر دست ایشان افعال را جاری میکند و در آنفعل مجبو راند اما بعضے ازیشاں میگویند کہ ارادہ از بندہ مقارن فعل می باشد اما آں ارادہ مطلقاً دخلے در وجود آں فعل ندارد واین مذہب

باطل است''—(از حق الیقین)—

یہ شیعہ نقطۂ نظر ہے-ان مسائل پر نظر ڈالتے ہوئے معلوم ہوتا ہے کہ فردوسی معتزلہ کے بر خلاف اشاعرہ کا ہم زبان ہے تقدیر کے بارے میں فردوسی کا اعتقاد ہے کہ مشیت الہی نے جو کچھہ ازل کے دن ہمارے مقدرات میں لکھہ دیا ہے انہی احکام کے مطابق ہم چلتے ہیں وہ احکام ایسے طاقت ور اور زبردست ہیں کہ نہ ہم ان پر چوں و چرا کرسکتے ہیں اور نہ ان سے احتراز کرسکتے ہیں ان میں رد و بدل-تغیر و تبدل کے لئے گنجایش نہیں-اس کے حکم کے بغیر سانس تک نہیں لیا جا سکتا اور نہ پاے مور حرکت کر سکتا-تقدیر الہی کے آگے تدبیر انسانی کوئی چیز نہیں-نوشتۂ تقدیر امٹ اور اٹل ہے حیلہ اور پرہیز سے کوئی تبدیلی اس میں پیدا نہیں کی جاسکتی گویا انسان تقدیر خداوندی کے ہاتھہ میں ایک کٹھہ پتلی ہے وہ جس طرف اور جس طرح چاہتی ہے اس کو توڑتی اور موڑتی ہے—

امثال از شاہنامہ—

(۱) بدانگہ کہ لوح آفرید و قلم　　بزد بر ہمہ بود نیہا رقم

(صفحہ ۳۴ جلد اول)

(۲) کہ ہر چیز کو آفرید از بوش　　بدانسو کشد بندگاں را روش

(صفحہ ۲۳ جلد چہارم-فرستادن خاقان دختر خود را بانامہ و خواستہ ہمراہ مہران فزد نوشیرواں)

یعنے جیسا ازل میں تقدیر کردیا گیا ہے-اسی کے مطابق ہم چلتے ہیں—

(۳) اگر زو مرا رنج خواہد فزود　　قلم رفت و ایں بودنی کار بود

یعنے جس بات پر قلم جاری ہوگیا ہے وہ ہوکر رہے گی—

(صفحہ ۱۳۰ جلد اول بخواب دیدن پیراں سیاؤش را و پیدا شدن خسرو)

(۴) ہمہ بندگانیم و او پادشا است　　خرد بر توانائی او گوا است

نفس جز بفرمان او نگذرد   پئے مور بے او زمیں نسپرد

(صفحہ ۲۱ جلد چہارم پاسخ نامہ خاقان ازانوشیروان)

اس کی قدرت ایسی زبردست ہے کہ اس کی مشیت کے بغیر سانس تک نہیں لیا جاسکتا اور رینگنے والی چیونٹی کا پانو تک نہیں ہل سکتا—

(۵) از وگر نوشتہ بمن بر بدی است   نگردد بپر ہیز کاں ایزدی است

(جلد اول صفحہ ۱۳۰)

اگر ہماری تقدیر میں کوئی برائی لکھی ہے تو ہمارے پرہیز سے وہ بدی ٹل نہیں سکتی—

(۶) کہ کار خدائی نہ کاریست خورد   قضائے نبشتہ نشاید سترد

نوشتۂ تقدیر مٹایا نہیں جاسکتا—

(۷) نبشتہ بسر بردگر گونہ بود   ز فرماں نکاهد نخواهد فزود

قضا چوں ز گردوں فرو ہشت پر   ہمہ زیرکاں کور گردند و کر

مولانا روم اس شعر کو یا اس کے عربی ماخذ کو مد نظر رکھکر کہتے ہیں—

چوں قضا بیروں کند از چرخ سر   عاقلاں گردند جملہ کور و کر

(صفحہ ۲۴ جلد اول- پرسیدن سہراب نام و نشاں سرداران ایران از ہجیر)

یعنے خدا کے حکم میں کوئی کمی و بیشی واقع نہیں ہو سکتی جب قضائے الہی آتی ہے تو دانشمند اند ہے اور بہرے ہوجاتے ہیں—

(۸) نوشتہ چنیں بود ماں در بوش   برسم بوش اندر آید روش

(صفحہ ۲۱ جلد اول)

(۹) چو یزداں چنیں راند اندر بوش   بر ینگونہ پیش آوریدم روش

(صفحہ ۲۵ جلد اول)

(۱۰) چنیں گفت دستاں کہ دانا یکیست   بتقدیر او راہ تدبیر نیست

(صفحہ ۶۴ جلد اول)

یعنے تقدیر کے آگے ہماری تدبیر بیکار ہے —

(۱۱) بکوشیم و از کوشش ماچہ سود کز آغاز بود آنچہ مایست بود

(صفحہ ۱۵۲ جلد اول)

ہماری کوشش بیکار ہے جو ہونا ہے ازل کے دن مقرر ہو چکا ہے —

(۱۲) نوشتہ چنیں بود و بود آنچہ بود ز فرماں نکاہد نخواہد فزود

(صفحہ ۹۲ جلد چہارم کشتہ شدن بہرام چوبین بدست قلوں)

(۱۳) ز بخش جہاں آفریں بیش و کم نگردد بخرہ پیمائے دم

خدا نے جو ہمارا نصیبہ مقرر کردیا ہے اس میں کوئی تبدیلی واقع نہیں ہو سکتی اس پر گفتگو کرنا فضول ہے گویا ان معاملات میں فردوسی بحث کرنا بھی پسند نہیں کرتا چنانچہ ایک اور مقام پر کہتا ہے —

نوشتہ چنیں بود و بود آنچہ بود سخن بر سخن چند خواہی فزود

(صفحہ ۹۷ جلد چہارم - رسیدن خسرو و بہرام چوبین بہمدیگر و گفتگو با یک دگر کردن)

میں بخوف طوالت صرف انہی چند امثال پر قناعت کرتا ہوں ورنہ شاہنامہ میں یہ جذبات و خیالات قدم قدم پر ملتے ہیں —

(۲) معتزلہ جو اپنے آپ کو عدلی کہتے ہیں یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ خدائے تعالیٰ حکیم ہے اور حکیم سے خیر و صلاح کے سوا اور کچھہ صادر نہیں ہوسکتا اور بحکم عقل رعایت مصالح عباد اس پر واجب ہے پس خدا کی نسبت یہ اعتقاد کرنا کہ وہ اپنے بندوں کو اعمال خیر و شر پر اول تو مجبور کرے اور بعد میں ان کی پاداش میں سزا دے قبیح معلوم ہوتا ہے —

محمد باقر بن محمد تقی فرماتے ہیں :-

" حق تعالیٰ حکیم است و کار ہاے او منوط بحکمت و مصلحت است و فعل عبث و بیفائدہ ازو صادر نمی شود او رادر افعال اغراض صحیح

و حکمت ھاے عظیمہ ملحوظ می باشد ولیکن غرض در افعال الہی عاید بہ بندگان میگردد غرض او تحصیل نفع از برائے خود نیست و بریں قول اتفاق کردہ اند امامیہ و معتزلہ و حکما۔ و اشاعرہ گفتہ اند کہ افعال خدا معلل با غراض نیست و آیات و احادیث بسیار بر بطلان ایں قول دلالت میکند۔

و اکثر امامیہ را اعتقاد آنست کہ آنچہ اصلح باشد از براے خلق و نظام عالم فعلش بر حق تعالیٰ واجب است''

(از حق الیقین)

بر خلاف اس کے اشاعرہ کا عقیدہ ھے کہ بروے عقل خدا پر کچھہ واجب نہیں وہ قادر مطلق اور فعال مایشاء ھے۔ وہ جو چاھے اور جب چاھے کرے کسی کو اس پر قدرت نہیں وہ چاھے تو چھوٹی چیز کو وسیع کر دے اور وسیع کو سمیٹ دے جس کو چاھے بلند کرے اور جس کو چاھے پست کرے۔ ذلیل کو عزت دے اور عزت والے کو ذلیل کر دے جس کو چاھے راہ راست پر لائے اور جس کو چاھے سیدھی راہ سے الگ کر دے جسے جو چاھے دے اور جو چاھے چھین لے۔ وہ جو کچھہ کرتا ھے یا کرے گا وھی عدل اور انصاف ھے۔ نفع و ضرر اس کے ھاتھہ میں ھے اس کی مشیت اور ارادہ کے بغیر کچھہ ھو نہیں سکتا اللہ عز و جل پر ثواب یا عذاب یا بندے کے ساتھہ لطف یا اس کے ساتھہ وہ کرنا جو اس کے حق میں بہتر ھو کچھہ واجب نہیں۔ مالک علی الاطلاق ھے جو چاھے کرے اور جو چاھے حکم دے اس پر کوئی جور و حیف لازم نہیں آتا۔

اس روشنی میں دیکھتے ھوے فردوسی اشاعرہ کا ھم زبان ھے اس کے نزدیک ذات باری قادر علی الاطلاق ھے نہ شیعہ اصحاب کی طرح اس کا یہ عقیدہ ھے کہ اللہ عز و جل پر اصلح واجب ھے اور نہ وہ یہ مانتا کہ نیکیوں کا خالق اللہ ھے اور برائیوں کا خالق انسان ھے ان میں سے ھر مسئلہ میں وہ فرقۂ سنت و الجماعت کا پیرو ھے۔ ذیل کے اشعار ملاحظہ ھوں۔

(۱) یکے را بر آری بچرخ بلند — یکے را کنی خوار و زار و نژند
یکے راز ماہ اندر آری بچاہ — یکے راز چاہ اندر آری بماہ
یکے رابر آری و شاهی دهی — یکے را بدریا بماهی دهی
نه با آنت مهر و نه با اینت کین — که به دان توئی ایجهان آفرین
جهان را بلند و پستی توئی — ندانم چۂ هرچه هستی توئی

(صفحه ۱۹۴ جلد دوم - گرفتار شدن خاقان و شکست خوردن تورانیان)

(۲) غم و اندوه و رنج و تیمار و درد — ز نیک و ز بد هر چه آید بمرد
کمی و فزونی و نیک اختری — بلندی و پستی و کلند آوری
ز داد تو بینم همی هرچه هست — دگر کس ندارد دریں کار دست

یعنی غم و رنج - درد و تکلیف - نیکی بدی - کمی بیشی - نیک بختی اور بدبختی - بلندی اور پستی جو انسان پر عارض ہوتی ہیں سب خدا کی طرف سے ہیں اور انصاف ہیں —

(صفحه ۷۰ جلد اول کشتن رستم ار ژنگ دیو را)

(۳) توانائی او راست ما بنده ایم — هم از راستیهاش گوینده ایم
یکے را دهد تاج و تخت بلند — یکے راکند خوار و زار و نژند
نه با آنش مهر و نه با اینش کین — نمید اند ایں جز جهاں آفریں

(صفحه ۹۴ جلد چهارم)

(۴) وزو یست پیروزی و هم شکست — به نیک وبه بد زان بود کام دست
زمان و مکان و جهان آفرید — پے مور و کوه گران آفرید
خرد داد و جان و تن زورمند — بزرگی و دیهیم و تخت بلند
رهائی نیابد سر از بند او — یکے را بود فرو اورند او
یکے را دگر شور بختی بود — نیاز و غم و درد و سختی بود
زرخشنده خورشید تا تیره خاک — همه داد بینم زیزدان پاک

(صفحه ۱۶۲ جلد اول)

(۵) بدو نیک زان‌داں کش انباز نیست   بکاریش فرجام و آغاز نیست

(صفحه ۴۰ جلد چهارم) دیگر

ازویست نیک و بد و هست‌ونیست   همه بندگانیم ایزد یکیست

(صفحه ۳۹ جلد اول) دیگر

تو مگزار هرگز ره ایزدی   که نیکی ازو یست و هم زو بدی   دیگر

بزرگی و خوردی به پیمان اوست   همه بودنی زیر فرمان اوست   دیگر

جز او را مخواں کردگار بلند   کزو شادمانی وزو مستمند   دیگر

بد و نیک بیند ز یزدان پاک   وزو دارد اندر جهاں ترس و باک

(صفحه ۱۰۳ جلد چهارم)

(۳) فرقۂ اهل تسنن و تشیع میں هاروت و ماروت کے متعلق بھی اختلاف هے۔ان فرشتوں کی بابتہ وہ قصہ جس سے ان کا بشری حیثیت اختیار کر کے دنیا میں آنا۔لوگوں کو جادو کی تعلیم دینا۔زهرہ پر عاشق هونا اور اس کو اسم اعظم سکھانا مفہوم هوتا هے اور جو اهل سنت و جماعت میں مقبول هے اهل تشیع نہیں مانتے۔فردوسی کے هاں شاهنامہ میں ایک سے زیادہ موقعوں پر هاروت کا ذکر آتا هے اور اس طریقہ سے آتا هے جس سے ظاهر هوتا هے کہ اس قصہ پر اس کا اعتقاد تھا۔کیونکہ ان کی جادوگری کا وہ ذکر کرتا هے۔چنانچہ—

گہے میگسارید و گہ چنگ ساخت   تو گفتی کہ هاروت نیرنگ ساخت

(تمہید داستان بیژن)

شیعہ هونے کی حیثیت سے فردوسی اس تلمیح کا استعمال نہیں کرسکتا تھا—

(۴) سکندر کے حالات جو فردوسی نے شاهنامہ‌میں دئیے‌هیں ایسا معلوم هوتا هے کہ زیادہ ترسنی مآخذ سے لئیے گئے هیں کیونکہ اهم واقعات میں اسکے بیانات ثعلبی اور نظامی کے بیانات سے مطابق هیں جبکہ تاریخ طبری اور *روضۃ الصفا سے موافق نہیں—

(۵) اسیطرح صوفیوں کے متعلق اسکی راے اھل سنت والجماعت کے مطابق ھے-وہ انکا ذکر موقرا لفاظ میں کرتا ھے-سکندر کی داستان میں کہتا ھے

غریباں که برشهر ما بگذرند چها نندہ پاے ولباں نا چرند

دل از عیب صافی و صوفی بنام بدرویشی اندر شدہ شاد کام

زخواهندگاں نام شاں بر کنید شمار اندر آغاز دفتر کنید

(صفحه ۶۰ جلد سوم)

واضح رھے که شیعه جماعت میں ابتداھی سے اھل تصوف کی نسبت معاندانه راے قائم کر لی گئی تھی حتیٰ که انکو مجوس اور نصاریٰ کے ساتھه تشبیهه دیجاتی تھی-جناب امام علی نقی کا قول ھے—

"الصوفیه کلهم مخالفونا و طریقهم مغایرة لطریقنا و ان هم الا نصاریٰ اومجوس هذہ الامه" فرقۂ صوفی یه سب ھمارے مخالف ھیں انکا طریقه ھمارے طریقه سے جدا ھے اور وہ اس امت کے نصاریٰ اور مجوس ھیں—

امام جعفر صادق کی راے بھی ملاحظه ھو:—

"قال رجل الصادق ع خرج فی هذا الزمان قوم یقال لهم الصوفیه فما تقول فیهم فقال ع انهم اعداءنا فمن مال الیهم فهو منهم و یحشر معهم و سیکون اقوام یدعون حبنا و یمیلون الیهم و یتشبهون بهم و یلقبون انفسهم بلقبهم ویاولون اقوالهم الافمن مال الیهم فلیس منا وانامنه براء و من انکرهم و ردعلیهم کان کمن جاهد الکفار مع رسول الله صلے الله علیه و آله"

(ترجمه) امام صادق سے ایک شخص نے پوچھا که اس زمانه میں ایک فرقه مبعوث ھوا ھے جسکو صوفی کہاجاتاھے آپکی ان کے بابته کیا راے ھے آپنے جواب دیا که وہ ھمارے دشمن ھیں جو ان کی طرف مائل ھوا وہ انھی میں سے ھے اور انھی کے ساتھه محشور ھوگا اور عنقریب ایسے لوگ بھی ھوں گے جو ھماری محبت کا دعویٰ کریں گے اور ان کی طرف میل کریں گے ان کے ساتھه مشابهت

کریں گے ان کے القابات سے اپنے آپ کو ملقب کریں گے اور اُن کے اقوال کی تاویلیں کریں گے-لیکن جو شخص ان کا مائل ہوا وہ ہماری جماعت سے تعلق نہیں رکھتا اور ہم اس سے بری ہیں اور جس نے ان کا انکار کیا اور ان کی تردید کی اس کا رتبہ ایسا ہے گویا رسول اللہ صلی اللہ علیہ و صلم کے ساتھہ شریک ہو کر کفار کے ساتھہ جہاد کیا—

ابو ہاشم کوفی صوفی کے متعلق جو بقول جامی سب سے پیشتر صوفی کے لفظ کو رواج دیتے ہیں بروایت امام حسن عسکری امام جعفرالصادق کی راے حسب ذیل ہے—

"قال سئل الصادق ؑ عن حال ابوالہاشم الکوفی الصوفی قال ؑ انہ فاسدالعقیدۃ جداً"

امام جعفرالصادق سے ابوالہاشم الکوفی صوفی کے متعلق استفسار کیا گیا آپ نے فرمایا کہ وہ بد عقیدہ ہے—

ان محترم ہستیوں کے اس قسم کے صریح اعلانات کے بر خلاف شیعہ حلقوں میں تصوف کے لئے کسی سرسبزی کی امید رکھنا نا ممکن تھا ایک مدت دراز تک یہی حالت قائم رہی لیکن پچھلے چند قرون میں سیاسی اسباب کے زیر اثر متصوفین کے لئے احترام کے آثار صفویہ کے زمانے سے شروع ہو جاتے ہیں کیونکہ اس خاندان کے اجداد شیخ صدرالدین موسیٰ اور شیخ صفی الدین اسحق بن جبرئیل خود صوفی تھے—

(۹) یہاں ایک اور غیر متعلقہ امر کے متعلق چند الفاظ کہنا مناسب ہوں گے-کتاب یوسف و زلیخا بقول جمہور فردوسی کی تصنیف ہے اگرچہ اس اعتقاد میں میں شریک نہیں ہوں تاہم اگر یہ مان لیا جائے کہ وہ فردوسی کی تصنیف ہے تو یہ بھی ظاہر ہے کہ اس کے ذرائع وہی روایات ہیں جو اصحاب سنت و جماعت کے ہاں شائع ہیں-جس کا یہ مطلب ہے کہ اس کا مصنف سنی ہے

نہ شیعہ میں ان متعدد دلائل سے جو مصنف کتاب کے سنی ہونے کے نظریہ کے حق میں پیش کی جاسکتی ہیں بخوف طوالت صرف ایک روایت پر اکتفا کرتا ہوں۔

مثلاً وہ موقع جہاں زلیخا عشرت خانہ طیار کروا کر حضرت یوسف کو بلواتی ہے اور طالب وصال ہوتی ہے۔اس موقعہ پر حضرت یوسف کے مائل ہونے اور ازاربند کی ساتوں گرھیں کھولنے وغیرہ کے جو تفصیلی حالات اس تصنیف میں ملتے ہیں ان کا ناقل کوئی شیعہ نہیں ہو سکتا کیونکہ یہ تمام روایت اہل تشیع کے ہاں مردود ہے۔جہاں شیعہ اصحاب نے سنیوں کے خلاف اور اعتراض کئے ہیں وہاں یہ اعتراض بھی کیا ہے۔میں ان کی تصنیف "تبصرۃالعوام" سے ذیل کی عبارت نقل کرتا ہوں جہاں مولف نے سنیوں کے بیانات دے کر ان پر جرح کی ہے —

" روایت کنند کہ چوں زلیخا قصد یوسف کرد ودرخانہ بہ‌بست۔یوسف نیز قصد فجور کرد۔ناگاہ یعقوب را دید انگشت بدنداں گرفتہ وگفت یایوسف ترا از انبیا می‌شمارندوتو قصد فجور میکنی و از سفیان بن عتبہ روایت کنند کہ گفت یوسف قصد فجور کرد بازلیخاو در موضعے نشست کہ مرداں بازناں بقصد مجامعت نشینند و بروایت دیگر چناں درقدمہاے زن نشست کہ مرد در حال مجامعت با حلال خود نشیند۔این حکایت جملہ (سنیاں) در تفاسیر خود یادکردہ اند و ایں فواحش از تاویلات آیات قرآن استنباط کنند وبر انبیا ورسل بندند وگویند مذہب اہل سنت وجماعت است و ہرکہ خلاف ایں گوید اورا رافضی ومتبدع گویند "

میں یہاں مثنوی یوسف و زلیخا کے وہ اشعار بھی درج کرتا ہوں —

چناں آتشے بردلش برفروخت	کہ مرشرم اورا سرا سر بسوخت
چودل بر ہوا جستنش میل کرد	سہ‌بند از گرہ زود بکشاد مرد
پس از کنج خانہ یکے دست دید	کشیدہ بکرد ار سیم سپید

همی برکف او نوشته عیان ۔ که بیند همی کردگار جہان
فروخواند یوسف و لیکن ہواش ۔ نکرد از گرہ برکشادن جداش
دو بند دگر بر کشاد از میان ۔ بفرمان اهریمن تیرہ جان
زگنجے دگر باز دستے بدید ۔ هنر مند یوسف درو بنگرید
بداں بد نوشته که ایں کار زشت ۔ امیدت ببرد ز حور بہشت
فروخواند یوسف و لیکن نداشت ۔ بدان کزهوا کام بیروں گذاشت
دل از کام جستن همی بر نتافت ۔ سوے بند دیگر کشادن شتافت
ببخشود بروے جہاں آفریں ۔ فرستاد دروقت روح الامیں
بصورت چو یعقوب پرهیزگار ۔ هم از کنج خانه شدش آشکار
بیوسف چنیں گفت کاے گنج هوش ۔ زد و زخ تن خویشتن دار گوش
زیعقوب آزردہ بشنو سخن ۔ بدینساں گنه زرد رویم مکن
بدیں گر شود چهرہ زردم زتو ۔ بیزداں که بیزار گردم زتو
چو یوسف رخ و چشم یعقوب دید ۔ بدانساں سخن گفتن ازوے شنید
چناں لرزش افتاد در دست و پائے ۔ که در تن نماندش دل رهنمائے*

(صفحه ۱۲۷ دارالطباعۂ خاصۂ مدرسۂ مبارکه دارالفنون طہران)

---

* اسکے علاوہ جب ہم امام احمد غزالی طوسی (برادر امام غزالی) شیخ عطار اور نظامی گنجوی کے بیانات پر غور کرتے هیں توقرائن سے فردوسی کا اهل تسنن سے تعلق رکھنے کا استدلال صاف مترشح ہے۔یہ تینوں بزرگ اهل سنت و الجماعت کے هاں اپنے اپنے مرکز میں بلحاظ شهرت وتقدس نہایت بلند پایہ رکھتے هیں۔انمیں سے هرایک کا مذهب کے ساتهه بهت قریبی تعلق رها ہے۔فردوسی کا ذکریه بزرگوار عزت کے ساتهه کرتے هیں جس سے مفہوم هوتا ہے کہ فردوسی انکے نزدیک اهل تسنن سے تها۔ امام احمد غزالی کا بیان مرزبان نامه-باب سوم-داستان سه رهزن انباز-صفحه ۷۷ و صفحه ۷۸ طبع یورپ میں ملتا ہے-عطار کا حواله اسی مضمون کے ایک حاشیه میں گزرچکا ہے-نظامی کے بیانات اقبال نامه-شرف نامه-اور بهرام نامه میں ملتے هیں- راحة الصدور-جهان کشاے جوینی اور مرزبان نامه وغیرہ میں شاهنامه کے اشعار کا کثرت کے ساتهه نقل کیاجانا اسی عقیدہ کی تصدیق کا ایک اور قرینه ہے—

ان بعض مسائل میں جو اتفاقیہ شاھنامہ میں آگئے ھیں دیکھا جاتا ھے کہ فردوسی بالکل اھل تسنن کے ھمراے ھے اسلئے انکے اثرات میں میں اسکو سنی عقیدہ کا مانتا ھوں—

فردوسی کے اور عقائد کے متعلق جو شہادت شاھنامہ سے مل سکتی ھے ناظرین کی خدمت میں پیش کی جاتی ھے-اگرچہ شاھنامہ بلحاظ مضمون ایسی کتاب نہیں جس میں مصنف کو اپنے عقائد کے اظھار کا زیادہ موقعہ ملتا تاھم اسقدر یقینی ھے کہ اسکے معتقدات وھی تھے جو عام مسلمانوں کے ھوتے ھیں- وہ دین اسلام کو سب سے بہتر مذھب مانتا ھے اور نور ایمان سے اپنے دل کو روشن کرنا چاھتا ھے—

بگیتی درآں کوش چوں بگذری | سرانجام اسلام باخود بری
دل از نور ایمان گرآگندۂ | ترا خامشی بہ کہ گویندۂ

خدائے پاک کی ستائش اور اسکی توحید کی اشاعت فردوسی کا پہلا اور آخری سبق ھے جسکی تکرار سے وہ کبھی تھکتا نظر نہیں آتا-توحیدی مضامین کی کثرت سے اگر کسی نے شاھنامہ کو قرآن العجم کہا ھے تو غیر موزوں نہیں کہا ھے فارسی میں مشکل سے کوئی ایسی کتاب ھوگی جس میں توحیدی مضامین اس کثرت سے پائے جائیں

جبکہ فلاسفہ کی زبان میں فردوسی خدا کو روح اور عقل کا خالق مانتا ھے جسنے مکان اور زمان خلق کئے جو خورشید-قمر-زحل اور زھرہ کا مالک ھے- آسمانوں اور جہانوں کا خدا ھے-خاک-آب-آتش اور ھوا جس کی ھستی پر شہادت دیتے ھیں-فقہا کے ھمزبان بن کر گویا ھے کہ اس نے ایک کن سے دونوں جہانوں کی تخلیق کی اور لوح و قلم پیدا کئے-وہ بے نیاز-دانا اور توانا بے سہیم و شریک اور بے مانند ھے اس کے احکام میں چوں و چرا نہیں کی جاسکتی- ھم اس کے مجبور بندے ھیں-ھمارا فرض اس کی عبادت اور اس کے احکام کی

تعمیل ہے۔خدا کی جناب میں اظہار عجز و نیاز کی تاکید وہ بار بار کرتا ہے۔
فردوسی کہتا ہے —

وہ قادر مطلق ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گا۔نہ اس کے یار ہے۔نہ جفت ہے۔
وہ کبھی بہار پیدا کرتا ہے اور کبھی خزاں۔درخت انگور کو وہی میوہ دیتا ہے
کبھی اس کو بہاریں کرتا ہے اور کبھی زرد رو۔تمام عناصر اس کی ہستی کی
گواہی دیتے ہیں۔دستور۔گنجور۔تاج و تخت۔کمی بیشی۔خوش اقبالی اور
بد اقبالی سے وہ بے نیاز ہے۔خشکی میں پیل اور آب میں نہنگ اس کے فرمان سے
سرتابی نہیں کر سکتے۔بدی اور نیکی سب اس کے طرف سے ہے شمس و قمر اور
زحل کا مصور۔تخت و تاج کو رونق بخشنے والا۔خاشاک سے شیر و پیل تک اور
پائے مور کی گرد سے رود نیل تک اگر زمین سے آسمان تک پہونچ جائیں سب
اسی کے حکم میں ہیں نہ اس کے حکم کی انتہا ہے اور نہ اس کی پادشاہی کو
زوال ہے۔دنیا کی چھوٹی بڑی چیز کا صانع۔خاشاک سے عرش تک ہر ایک چیز اس
کی ہستی کی شہادت دیتی ہے۔چیونٹی سے شیر کو سزا دلواتا ہے۔پیل زبردست
پر پشہ کو غالب کرتا ہے۔وہ کیوان و بہرام و خورشید کا خداوند جس سے ہم کو
امید و بیم ہے اگرچہ میں اپنی جان تفکر میں گھلا دوں تب بھی میں اس کی
حمد سرائی سے عہدہ برآ نہیں ہو سکتا۔جیسا اس کا حق ستایش ہے ویسے کوئی
اس کی ثنا نہیں کر سکتا اس لئے ہم کو اس کی بندگی کے لئے کمر بستہ رہنا
چاہئے اس کی ہستی کا معترف ہو کر اس کی عبادت میں مصروف ہونا اس کے
فرمانوں کی تعمیل کرنا اور اس کی بخشش کی امید رکھکر گناہ سے خائف رہنا
چاہئے اور اس کے پیغمبر پر درود بھیجنا چاہئے —

یہاں شاہنامہ سے بعض امثال پر قناعت کی جاتی ہے —

(۱) بنام خداوند خورشید و ماہ   کہ دلرا بنامش خرد داد راہ
خداوند ہستی و ہمراستی   نخواہدز تو کژی و کاستی

خداوند کیوان و بہرام و شید — کزو یست امید و بیم و نوید
ستودن من او را ندانم همی — از اندیشه جان بر فشانم همی
ازو یست پیدا زمان و مکان — پئے مور بر هستی او نشان
زگردندہ خورشید تا تیرہ خاک — همان باد و آب آتش تا بناک
بهستی یزدان گواهی دهند — روان ترا آشنائی دهند
سوے آفرینندۂ بے نیاز — ببایدکه باشی همی در گداز
ز دستور و گنجور وز تاج و تخت — ز کمی و بیشی و ناکام و بخت
هم او بینیاز است ما بندہ ایم — بفرمان و را یش سر افگندہ ایم
چو جان و خرد بیگمان کردہ است — سپهر و ستارہ بر آوردہ است
جز او را مدان کردگار بلند — کزو شادمانی و زو مستمند
شب و روز و گردان سپهر آفرید — خورو خواب و تندی و مهر آفرید
(۲) نگارندۂ هور و کیوان و ماہ — فرو زندۂ فر و دیهیم و گاہ
ز خاشاک ناچیز تا شیر و پیل — ز گرد پئے پیل تا رود نیل
گر از خاک بر چرخ گردان روند — همه زیر فرمان یزدان روند
نه فرمان او را کرانه پدید — نه زو پادشاهی بخواهد برید
(۳) خداوند کیوان و خورشید و ماہ — کزو پست و پیروزے و دستگاہ
خداوند هستی و همراستی — ازو یست بیشی و هم کاستی
خداوند بخشندۂ و کارساز — خداوند روزی دہ بے نیاز
خداوند گیتی خداوند مهر — خداوند ناهید و گردان سپهر
جز از راے و فرمان او راہ نیست — خور و ماہ ازیں دانش آگاہ نیست

(صفحه ۱۳۸ جلد اول)

(۴) ستودن نداند کس او را چو هست — میان بندگی را ببایدت بست
بدیں آلت و راے و جان و رواں — ستود آفرینندہ را کے تواں

بهستیش باید که خستو شوی ز گفتار بیکار یکسو شوی
پرستنده باشی و جوینده راه بفرمانها ژرف کردن نگاه

فردوسی سرائے جاودانی کا معتقد ہے اور کئی موقعوں پر اس کی نسبت تلمیح کرتا ہے —

چنیں گفت ما را سخن رهنماے جزاینست جاوید ما را سراے دیگر
همیں بگذرد بر تو ایام تو سراے جزایں باشد آرام تو دیگر
ز رفتن مگر بهتر آیدت جاے چو آرام گیری بدیگر سراے

سرائے جاودانی اس سرائے سے بہتر ہے —

رها کن ز چنگ ایں سپنجی سراے که پر مایه تر زیں ترا هست جاے

اور اس دنیا میں ہمارے نیک اعمال کا ثمرہ اس دنیا میں ملے گا —

تو تا زندۂ سوے نیکی گراے مگر کامیابی بدیگر سراے

(صفحہ ۴۸ جلد سوم)

جب ہم اس دنیا سے رحلت کریں گے خدا سے ہمارا سروکار ہوگا ہمارے اعمال خواہ اچھے ہوں یا برے —

چو رفتی سروکار با ایزدست اگر نیک باشدت کار ار بد است دیگر
که رفتن آمد بدیگر سراے مگر نزد یزداں به آیدت جاے

وہ بہشت اور دوزخ کا معتقد ہے —

اگر ماند ایدر ز تو نام زشت بیابی عفاالله خرم بهشت
دیگر نه چوں من شده خوار و بر گشته بخت
بدوزخ فرستاده نا کام رخت

رضواں مالک بہشت کا نام ان ابیات میں آتا ہے —

بتاں بهشتند گوئی درست بگلنار شاں روے رضواں بشست

(صفحہ ۶۵)

توبہ پر بھی اعتقاد کامل رکھتا ھے—

توا ے پیر فرتوت بے توبہ سرد در توبہ بگزیں و راہ خرد

ابلیس کا ذکر بھی کرتا ھے—

خیال بد کہ ابلیس روزے پگاہ یکے انجمن کرد پنہاں زشاہ

خانۂ کعبہ کا ذکر نہایت احترام کے ساتھہ کرتا ھے-وہ کہتا ھے کہ خان حرم وھی ھے جس کو خدا بیت الحرم کہتا ھے-حضرت ابراھیم علیہ السلام اس کے بانی ھیں خدا نے اس کو بیت اللہ کہا ھے یہ اس مقام پاک کی حرمت کی بنا پر ھے ورنہ خدا کو کھانے پینے یا آرام کرنے کے لئے کسی گھر کی ضرورت نہیں ھے-جب سے یہ پرستشگاہ تعمیر ھوئی ھے اس میں ھمیشہ خدا کی عبادت ھوتی آئی ھے—

خداوند خواندیش بیت الحرم بدو شد ترا راہ یزداں تمام

ز پاکی ورا خانۂ خویش خواند نیایش کنا نرا بداں پیش خواند

خدا ے جہاں را نیاید نیاز بجائے خورو کام و آرام و ناز

پرستشگہے بود تا بود جائے بد و اندروں یاد کرد خدائے

شاھنامہ میں بیت المقدس کا بھی ذکر آتا ھے—

بخشکی رسید ند سر جنگجوئے یہ بیت المقدس نہا دند روے

(صفحہ ۲۲ جلد اول سنہ ۱۲۹۲ ھجری)

ظلمات میں سکندر کے جانے کے وقت وہ مسلمانی تکبیر اللہ اکبر کا بھی ذکر کرتاھے —

چو لشکر سوے آبحیواں گذشت خروش آمد اللہ اکبر ز دشت

خضر علیہ السلام کو سکندر کا رھبر مانتا ھے—

ورا اندریں خضر بد رایزن سر نامداران آں انجمن

سکندر بیامد بفرمان اوے دل و جاں سپردہ بہ پیمان اوے

ظلمات سے واپسی کے وقت حضرت اسرافیل سے سکندر کی ملاقات کا

ذکر بھی کرتا ھے—

سرافیل را دید صورے بدست	بر افروختہ سرز جاے نشست
پر از باد لب دیدگاں پرز نم	کہ فرماں کے آید زیزداں کہ دم
چو بر کوہ روے سکندر بدید	چو رعد خروشاں فغاں برکشید
کہ اے بندۂ آز چندیں مکوش	کہ روزے بگوش آیدت یک خروش
توچندیں مرنج ازپے تاج وتخت	بر فتن بیارا و بر بند رخت

کید ھندی کے خواب میں وہ دین اسلام کی ترویج کي پیشیں گوئی بیان کرتا ھے—

چھارم ز تازی یکے دین پاک	سر ھوشمنداں بر آرد بخاک

اور اسی خواب میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ و صلم کی نسبت بھی بشارت دیتا ھے—

ازیں پس بیاید یکے نامدار	ز دشت سواران نیزہ گزار
یکے مرد پاکیزۂ نیک خوئے	بدو دیں یزداں شود چار سوے

وہ عبرانی تاریخ کو ایرانی تاریخ کے ساتھہ جیسا کہ بعض خوش عقیدہ مورخین کا دستور ھے تطبیق دینے کی کوشش بھی کرتا ھے اس عقیدہ کا کہ حضرت ابراھیم اور زردشت ایک ھی شخص ھیں وہ بھی معتقد ھے—

تھم دین زردشت پیشیں بدوے	براھیم پیغمبر راست گوے

لیکن حضرت ابراھیم کے تقدم کا حضرت موسی پر لحاظ نہ رکھکر منو چھر کی زبان سے حضرت موسی کي آمد کی بشارت نوذر کو ان ابیات میں دیتا ھے—

نگر تا نتابی ز دین خداے	کہ دین خدا آورد پاک راے
کنوں نو شود در جھاں داوری	کہ موسی بیاید بہ پیغمبری
پدید آید آنکس زخاور زمیں	نگرتا نباشی ابا او بکیں
بد و بگرو آں دین یزداں بود	نگہ کن ز سر تاچہ پیماں بود

تاریخ طبری میں منوچہر کو حضرت موسیٰ کا ہمعصر مانا گیا ہے —
حضرت اسمعیل کا ذکر بھی ادب کے ساتھہ کیا ہے —

نبیرہ سماعیل پیغمبراست — کہ پور براهیم نیک اختراست

فردوسی کا بھی عقیدہ ہے کہ حضرت عیسیٰ پیغمبر تھے چنانچہ ان کی نسبت کہتا ہے —

پدر دیر او بود و مادر کنشت — نگہبان و جویندۂ خوب و زشت
چو روشنرواں گشت و دانش پذیر — سخنگوئے و دانندہ یاد گیر
به پیغمبری نیز هنگام یافت — به برنائی از زیزکی کام یافت
تو گوئی که فرزند یزداں بد او — بداں دار برگشته خنداں بد او
بخندد بریں بر خرد مند مرد — تو گر باهشی گرد یزداں بگرد
که هست او بفرزند وزن بے نیاز — بنزدیک او آشکار است راز

نوشیرواں اپنی وفات کے قریب ایک خواب دیکھتا ہے جس کی تعبیر رسول مقبول کی ولادت اور ترویج دین اسلام ہے - یہ بھی فردوسی کے مسلمانی معتقدات کی دلیل ہے - نوشیرواں کے خواب کی روایت اکثر تاریخوں میں ملتی ہے مگر فردوسی نے کسی قدر ضمنی اختلات کے ساتھہ بیان کیا ہے - تاریخ طبری میں عبدالمسیح آکر سطیح سے اس خواب کی تعبیر دریافت کرتا ہے شاهنامہ میں گزارندۂ خواب حکیم بوزرجمہر ہے * —

جنگ میں دشمنوں کے خلات مارے جانے کے موقعوں پر متوفی کے لئے فردوسی کا بھی اعتقاد ہے کہ شہید ہوتا ہے —

کسے که بود کشته زیں رزمگاه — بهشتی شود گشته پاک از گناه

(صفحہ ۲۳ جلد اول)

---

* نوشیرواں کے خواب کی روایت تمام بایسنغری نسخوں میں ملتی ہے لیکن اس عہد سے قبل کے بعض شاهناموں میں جو میری نظر سے گذرے ہیں یہ بیان مذکور نہیں ہے —

پردہ کا بھی شاھنامہ میں مذکور آتا ھے —

پس پردۂ او یکے دختراست   کہ روشن زخورشید روشن تواست   دیگر

کرا درپس پردہ دختر بود   اگر تاجدارد بد اختر بود

فردوسی مانتا ھے کہ ایک امر کُن سے خدا نے دونوں جہان کو پیدا کیا —

دو گیتی پدید آرد از کاف ونوں   چرانہ بفرمان او در نچوں

اس کے ھاں لوح و قلم کا بھی ذکر موجود ھے —

بد آنگہ کہ لوح آفرید و قلم   بزد بر ھمہ بود نیہا رقم

خواب کے وجود میں عام مسلمانوں کی طرح اس کا بھی اعتقاد ھے وہ اس کو دانش پیغمبری کہتا ھے —

نگر خواب را بیہدہ نشمری   یکے بہرہ دانش ز پیغمبری

روانہاے بیدار بیند بخواب   ھمہ بود پنہا چو آتش بر آب

عربوں سے با وصف محبت ایران اس کو کوئی قومی عناد نہیں ھے اگرچہ استیلائے عرب پر عجم کے بیان میں بد قسمتی سے اس نے ایسی روایات سے کام لیا ھے جن میں عربوں کے ساتھ بے انصافی کی گئی ھے * ان کے جس قدر کارنامے ھیں ان کو یا تو بیان نہیں کیا ھے یا نہایت خفیف کرکے دکھایا ھے بعض ارکان اسلام کا اگر بے ادبی سے نہیں تو ادب کے ساتھ بھی ذکر نہیں کیا ھے اور غالباً یہی اصلی وجہ فردوسی کی بدنامی کی معلوم ھوتی ھے - تاھم جہاں عربوں

---

* بایسنغری اڈیشن سے قبل کے بعض شاھناموں میں داستان یزد جرد سے ایسے ابیات جو صریحاً عربوں کے خلاف معاندانہ جوش کا اظہار کرتے ھیں خصوصیت کے ساتھ غیرحاضر ھیں جس سے شک گذرتا ھے کہ شاید اس قسم کے اشعار بعد میں اضافہ کردیے گئے ھیں - ایک نسخہ نوشتۂ سنہ ۷۵۲ ھجری میں حضرت سعد بن وقاص رضی اللہ عنہ اور رستم سپہ سالار یزد جرد کے درمیان جنگ کے واقعات کی تفصیل بایسنغری نسخوں اور مطبوعہ شاھناموں سے کئی امور میں مختلف ھے - خود اس داستان کی موجودہ ابتر حالت شاھد ھے کہ اس میں ضرور تصرفات کئے گئے ھیں —

کی تعریف کی ہے وہاں فردوسی نے اس قوم کے مخصوص خط و خال۔ان کی حریت پرستی - رجز خوانی۔فوری اشتعال۔نیزہ بازی اور شمشیر زنی کے اوصاف کو فراموش نہیں کیا ہے چنانچہ—

اگر شد فریدوں چنیں شہریار — نہ ما بندگانیم با گوشوار
سخن گفتن و رنجش آئین ماست — عنان و سناں باختن دین ماست
بنخجر زمیں را میستاں کنیم — بہ نیزہ ہوا را نیستاں کنیم

عربی ضرب الامثال۔محاورات اور مقولوں کو جو اس کے عہد تک عام مسلمانی گفتگو میں رائج ہوچکے ہوں گے فردوسی اپنی زبان میں کامیابی کے ساتھہ تبدیل کردیتا ہے اور اس ترجمہ میں ضرور کچھہ نہ کچھہ جدت بھی اضافہ کرتا دیکھا جاتا ہے—

عربی امثال	فردوسی کا ترجمہ
اذا جاء القضا عمی البصر	قضا چوں ز گردوں فرو ھشت پر
	ھمہ زیر کاں کور گردند و کر
خیر الامور اوساطها	بکار زمانہ میانہ گزیں
	چو خواھی کہ یابی ھمی آفریں
طلب البیعر قرنین فضع الاذنین	کہ خرشد کہ خواھد ز گاواں سرو
	بیکبار گم کرد گوش از دو سو
الدنیا مزرعة الاخرة	یکے مزرع آنجہانست ایں
	نظر بکشاے و حقیقت بہ بیں
من حضر بیراً لاخیه فقد وقع فیه	کسی قدر تبدیلی کے ساتھہ کہا
	کسے کو برہ بر کند ژرف چاہ
	سزد گر کند خویشتن را نگاہ
سید القوم خادمهم	چگفت آں سخن گوے باترس و ھوش
	چو خسرو شوی بندگی را بکوش

عربی امثال	فردوسی کا ترجمہ
الحق مر	نگر تا چه گوید سخنگوے بلخ که باشد سخن گفتن راست تلخ که گفتار تلخست با راستی به بند و به تلخی در کاستی
من عاش بعد عدوه یوماً فلقد بلغ المنا و ان حیوة المرء بعد عدوه و ان کان یوماً واحد لکثیر	دم آبخوردن پس بد سگال به از عمر هفتاد و هشتاد سال
العجلت من الشیطان	شتاب و بدی کار اهریمن است پشیمانی و رنج جان و تن است (صفحه ۱۲۷ جلد اول)
جوع کلبک یتبعک ثمن کلبک یاکلک	سگ آن به که خواهندهٔ نان بود چو سیرش کنی دشمن جان بود (صفحه ۱۱۳ جلد چهارم)

داستان آذر نوش میں ایک حدیث نبوی جس کے اصل الفاظ مجھکو مل نه سکے فردوسی یوں بیان کرتا ہے—

چه خوش گفت دین آور تازیان — که خشم پدر جانت آرد زیان

کسی اور عرب سردار کا قول فردوسی یوں نقل کرتا ہے—

سپهدار تازی سر راستان — برین بر بگوید یکے داستان
که تا زنده ام چرمه جفت منست — خم چرخ گردون نهفت منست
عروسم نباید که رعنا شوم — بنزد خردمند رسوا شوم

(صفحه ۳۱ جلد اول)

اس قدر مطالعہ کے بعد بھی کہا جا سکتا ہے کہ شاہنامہ میں اسلامی مذہبیت کا عنصر کم پایا جاتا ہے اگرچہ ظاہر ہے کہ فردوسی کا مضمون ایک عجمی تاریخ تھی جس میں ان جذبات کے اظہار کا بہت کم موقع مل سکتا ہے۔ ساتھ ہی میں یہ بھی اضافہ کرنا چاہتا ہوں کہ فردوسی کی حیثیت زیادہ تر ایک دنیادار مسلمان سے ملتی جلتی ہے جس کو مذہب کا شغف نہو۔ وہ کوئی متقی اور دیندار مسلمان نہیں تھا اور نہ فقیہ اور عالم۔ مذہبی رنگ اس پر کبھی نہیں کھلا اور نہ اس میں انہماک رہا—

وہ اپنے ملک کے رواج کے مطابق جیسا کہ ہم اس عہد میں عام طور پر دیکھتے ہیں شراب خواری کا عادی تھا۔ ناصر خسرو نے جبکہ چالیسویں سال اور امیر کیکاؤس نے اپنی عمر کے پچاسویں سال مے نوشی سے توبہ کر لی تھی۔ فردوسی نہ اس عہد میں اور نہ اس عمر میں جیسا کہ شاہنامہ سے معلوم ہوتا ہے توبہ کرتا دیکھا جاتا ہے بلکہ پیری اس نشاط سے لطف اٹھانے کے لئے اور بہانہ ہو گئی تھی—

چو پیری درآید ز ناگہ بمرد جوانش کند بادۂ سال‌خورد
کرا کوز شد پشت و بالاش پست بکیواں برد سر چو شد نیم مست

اسنے اپنی عمر کے تریسٹھویں سال تک شراب سے توبہ نہیں کی تھی چنانچہ—

مئے لعل پیش آورا ے روزبہ چو شد سال گوینده بر شصت و سہ

اکثر داستانوں کے اختتام یا آغاز میں فردوسی کو شراب کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ شاید نظامی نے دانائے طوس کی تقلید میں سکندرنامہ میں یہی شیوہ اختیار کیا ہے اگرچہ تحقیق معلوم ہے کہ نظامی دختر رز کے گرفتاروں میں نہ تھے—

مگر فردوسی کی شراب نوشی حافظ اور خیام کی طرح رندانہ اور مستانہ نہیں ہے بلکہ وہ اس سے حظ حاصل کر کے نیم مستی پر ہی قناعت کرتا ہے—

گرت هست جامے مئے زرد خواه بدل خرمی را مدار از گناه

نشاط و طرب جوے و مستی مکن　　گزافه مپندار مغز سخن　　دیگر
زمے نیز تو شادمانی گزیں　　که‌مست ازکسے نشنود آفریں

(صفحه ۱۶ جلد چهارم)

فردوسی موت کے ذکر کے ساتھه شراب بهی یاد رکھتا ھے—

اگر مرگ دارد چنیں طبع گرگ　　پر ازمے یکے جام‌خواهم بزرگ

اپنے کسی هاشمی دوست سے جو غالباً حسین متیب ھے ایک موقعه پر شراب طلب کر رها ھے—

مئے لعل پیش آورا ے هاشمی　　زخمیے که بیشی ندارد کمی

بهار کی آمد اور اس کے دل میں شراب کا ولوله پیدا کر دیتی ھے جیسا که داستان رستم و اسفندیار کی تمهید میں دیکها جاتا ھے—

کنوں خورد باید مئے خوشگوار　　که مے بوے مشک آید از کوهسار
هوا پر خروش و زمیں پر ز جوش　　خنک آنکه دل شاد دارد بنوش
درم دارد و نقل و نان و نبیذ　　سرے گو سفندے تواند برید

عمر کے اکسٹھویں سال (؟) شراب سے تائب هونے کا عزم مصمم کر رها ھے—

چوسالت شدا ے پیر بر شصت‌ویک　　مئے و جام و آرام شد بے نمک
بگاه پسیچیدن مرگ مے　　چو پیراهن شعر باشد بدے
فسرده تن اندر میاں گناه　　رواں سوے فردوس گم کرده راه
زیاراں بسے ماند و بس در گذشت　　تو با جام همواره بوده بدست
بآغاز اگر کار خود ننگري　　بفرجام ناچار کیفر بری

اس شصت و یک کا نسخه هفتاد و یک ھے جو میرے خیال میں یهاں زیاده مناسب ھے—

اسی زمانه کے قریب ایک اور مقام پر توبه کے لئے تصمیم عزم کرتا پایا جاتا ھے جهاں کهتا ھے—

تو اے پیر فرتوت بے توبہ مرد ‏ خرد گیر و ز بزم شادی بگرد
جہاں تازہ شد چوں قدح یافتی ‏ رواں از در توبہ بر تافتی
اگر بخردی سوے توبہ گرا ے ‏ ھمیشہ بود پاکدیں پاک را ے
پس از پیریت روزگاراں نماند ‏ تموز و خریف و بہاراں نماند

اور یقین کیا جاتا ھے کہ اس موقعہ پر شاعر نے توبۂ نصوح کرلی ھے —

فردوسی کی طبیعت کا رنگ دیکھتے ھوے کہا جاتا ھے کہ مذھب کے ماسوا جس چیز نے اس کے قلب پر اپنا سکہ جمایا تھا وہ حکمت اور فلسفہ ھے اس طرح اگر اس کا شمار حکماے اسلام میں کیا جاے تو غیر موزوں نہیں ھوگا- بعض مصنفین نے اس کو حکیم لکھا ھے ان کا ایسا لکھنا صحیح معلوم ھوتا ھے —

فقیہانۂ طریق سخن میں خدا ارحم الرحمین اور قہار و جبار ھے- لیکن فلسفی طبع فردوسی شاھنامہ کے پہلے صفحہ کیا بلکہ پہلے شعر میں خدا کو خداے جان و خرد کہتا ھے جو نام و مقام سے بر تر ھے اور جس تک پیک تخیل کو رسائی نہیں- حمد کے بعد دیباچہ کا دوسرا زینہ ستایش خرد ھے "اول ما خلق اللہ العقل" اگرچہ حدیث نبوی بتائی گئی ھے لیکن صحیح یہ ھے کہ وہ فلاسفہ کا ایک مسئلہ ھے- فردوسی کے نزدیک عقل آفرینش کا پہلا گوھر ھے —

ع- نخست آفرینش خرد را شناس

اس خیال میں مولانا نظامی گنجوی بھی فردوسی کے ھم زبان ھیں- چنانچہ سکندر نامۂ بحری میں کہتے ھیں —

نخستیں خرد را پدیدار کرد ‏ ز نور خودش دیدہ بیدار کرد

خرد فردوسی کا قول ھے ایک بہترین خلعت ھے جو خدا نے انسان کو عطا کیا ھے- اس سے کونین میں انسان کی آبرو ھے- خرد کے بعد فردوسی روح کے ذکر میں مشغول ھے اور یہ ظاھر ھے کہ عقل کلی اور نفس کلی فلاسفہ میں بحث و جدال کے وقیع مضمون رھے ھیں- بواطنہ کے ھاں بھی یہ مسائل ان کے فلسفہ کے

اصل الاصول هیں —

آفرینش کا بیان جو فردوسی دیتا ہے وہ حکماے یونان کے خیالات سے ملتا جلتا ہے۔ابتدا میں کچھہ نہیں تھا—نیستی سے خدا نے ہستی کی تخلیق کی۔آغاز میں ایک جنبش ہوئی جس سے آتش پیدا ہوئی حرارت سے خشکی ظاہر ہوئی۔ سکون سے سردی نے ظہور پایا اور سردی سے تری کی تولید ہوئی۔ان سے عناصر کی ولادت ہوئی—ایک آتش بلند ہوئی جس نے آسمانوں کو تو بر تو اور متحرک قائم کیا—دوازدہ بروج اور سبعہ سیاروں کو افلاک پر جگہ ملی۔آگ بلند ہوئی باد و آب نے درمیان میں اور خاک نے سب سے نشیب میں مقام پایا۔زمین ایک تاریک اور سیاہ مرکز تھا۔آفتاب اس کے گرد گھومنے لگا۔پہاڑ نمودار ہوئے۔پانی کے چشمے ابلے۔دریا و کوہ و دشت و راغ سے زمین روشن چراغ کی طرح معلوم ہونے لگی جمادات کے بعد نباتات نے بروز کیا۔گیاہ اور مختلف نوع کے درختوں نے بالیدگی شروع کی—ان کا سر نشیب میں ہے اور متحرک نہیں ہیں اور نہ بالیدگی کے سواے کوئی اور وصف ان میں موجود ہے۔اب جنبش کرنے والا یعنے حیوان سطح پر نمودار ہوا جو عالم نباتات پر متصرف ہوا۔اس کا خاصہ یہ ہے کہ درخت کی طرح اس کا سر زمین میں نہیں ہے—اس کو کھانے۔سونے اور آرام کرنے کی ضرورت ہے اور یہی اس کی زندگی کا مقصد ہے اور نہ خدا اس سے عبادت چاہتا۔لیکن آفرینش کا سب سے قیمتی اور آخری رکن انسان ہے اس کا قد راست ہے۔نطق اور عقل دونوں اس کو عطا ہوئے ہیں دد و دام اس کے مطیع ہیں—تخلیق انسان کے غایت کے سوال کو فردوسی خود چھیڑتا ہے اور کہتا ہے —

مگر مردمی خیرہ دانی ہمی	جز این را نشانے ندانی ہمی
ترا از دوگیتی برآوردہ اند	بچندیں میانجی بپروردہ اند
نخستین فطرت پسین شمار	توئی خویشتن را ببازی مدار

کیا بشریت ایک بیکار شے ھے اور بس! نہیں اے انسان دونوں جہان میں تجھ کو شرف دیا گیا ھے اور متعدد وسائل سے تیری پرورش کی گئی ھے۔ آفرینش کی سب سے اول مگر شمار میں سب سے آخری مخلوق اے انسان تو ھے! تو اپنے آپ کو مہملات میں ضائع مت کر—

چونکہ بعض فلسفیانہ معتقدات کی رو سے انسانی مقدرات کی عنان مدبران فلکی کے سپرد کی گئی ھے اس لئے تخلیق انسان کے بعد فردوسی کو ھم افلاک کے ذکر میں مشغول دیکھتے ھیں۔ حکیم طوس ان معتقدات کو دھراتے ھوے گویا ھے "اس تیز گھومنے والے گنبد کو دیکھو جس سے سب کو درد و درمان تکلیف اور آسایش ملتی ھے۔ کسی وقت گردش سے اسے قرار نہیں ھے اور نہ ھماری طرح تباھی پذیر ھے۔ ھمارے مقدرات کے خیر و شر سے وہ باخبر ھے"—

نگہ کن بریں گنبد تیز گرد　　که درمان ازویست و زویست درد
نہ ازگردش آرام گیرد ھمی　　نہ چون ما تباھی پذیرد ھمی
ازو دان فزونی ازو دان شمار　　بد و نیک نزدیک او آشکار

ان معتقدات کی معلوم ایسا ھوتا ھے کسی معترض نے تردید کی ھے۔ اعتراض غالباً نظم میں اور حاشیہ پر ھوگا۔ اس میں سے صرف ایک شعر جو غلطی سے متن میں داخل کر لیا گیا ھے ابتک موجود ھے۔ جو یہ ھے:—

زیاقوت سرخ است چرخ کبود　　نہ از آتش و آب و نز باد و دود

یاد رھے یہ شعر اسلامی نقطۂ نگاہ سے ھے لیکن معلوم رھے کہ فردوسی کے لئے کسی ایسے اعتراض کی ضرورت نہیں تھی کیونکہ وہ خود ان عقائد کی شاھنامہ کے دوران میں ایک سے زیادہ موقعہ پر تردید و تکذیب کرتا دیکھا جاتا ھے—

آسمان کی دو رنگی۔ دنیا کی بیمہری اور زمانہ کی بیوفائی جسطرح اور شعرا میں ھے فردوسی کے ھاں بھی ایک مقبول موضوع رھا ھے جسکو وہ اپنی تصنیف کے دوران میں کہیں فراموش نہیں کرتا۔ ھم اپنی بداعمالیوں کا الزام

شیطان کی سر تھوپتے ھیں۔اسی طرح وہ ناگوار واقعات جو ھماری دسترس سے باھر ھیں اور ھمپر گذرتے ھیں تقدیر کے حوالہ کئے جاتے ھیں۔فردوسی جس نے ھماری طرح شخصی سلطنتوں کی آب وھوا اور استبداد کے سایہ میں پرورش پائی تھی سلطنت کی تعدی۔اکابر کے مظالم اور اس قسم کے دیگر واقعات کو آسمانی تعدی سے تعبیر کرتا ھے۔مزید براں اجرام فلکی کی عالم سفلی پر تاثیرات کا عام عقیدہ اور تنجیم کی مشرقی ممالک میں عالمگیر مقبولیت اور ایسے اسباب ھوگئے تھے جنھوں نے اس فلسفہ کی بنیاد ڈالی تھی جس میں آسمان مختار کل اور فاعل مطلق تسلیم کر لیا گیا ھے۔واقعات خیر و شر۔کمال و نقصان۔عسرت وآرام۔درد و درمان سب افلاک کے علم اور انکے قبضۂ قدرت میں مان لئے گئے تھے۔

یہ عقیدہ اصل میں ایرانی ھے۔فارسی نظم میں اس کے جراثیم کی سراغ رسی رودکی کے عہد تک کیجا سکتی ھے۔اس عقیدہ کی رو سے آسمان نہ تباھی پذیر ھے اور نہ توالی حرکت سے خستگی محسوس کرتا ھے اور نہ مرور ایام سے فرسودہ ھوتا ھے۔معلوم ایسا ھوتا ھے کہ بعد میں اسی قسم کے اور اعتقادات اس میں منضم ھوگئے ھیں جن میں دنیا یا زمانہ فاعل کل اور مختار مطلق مانے گئے تھے۔فردوسی کے ھاں یہ سب اعتقاد مخلوط شکل میں ملتے ھیں۔ان تمام کی علیحدہ علیحدہ مثالیں دینا مضمون کو طوالت دینا ھے۔میں صرف دو مثالوں پر اکتفا کرتا ھوں۔

اگر با تو گردوں نشیند براز — نیابی ھم از گردش او جواز
ھم او تاج و تخت بلندی دھد — ھم او تیرگی و نژندی دھد
بدشمن ھمی ماند وھم بدوست — گھے مغز یابی ازو گاہ پوست
سرت گر بساید بابر سیاہ — سرانجام خاکست ازو جایگاہ

(صفحہ ٥٢)

دیگر جہانرا زکردار بدشرم نیست کسے را بنزدیکش آزرم نیست
ہیمشہ بہر نیک‌وبد دسترس ولیکن نجوید خود آرام کس

یہ‌عقائد شاہنامہ میں بالعموم ہر مقام پرپا ئے جا تے ہیں اور اس کے اتباع میں تمام ایرانی شعرا میں یہ بدعت مقبول ہوگئی ہے۔لیکن تعجب سے دیکھا جاتا ہے کہ متعدد مقامات پر فردوسی ان اعتقادات کی بطلان و تکذیب میں سر گرم ہے۔اس کے اسلامی معتقدات ظن غالب ہے اس امر کے محرک ہو ے ہوں گے چنانچہ کیکاؤس کے ذکر میں کہتا ہے—

گمانش چنان بد کہ گرداں سپہر بگیتی مر او را نمود است چہر
ندانست کیں چرخ را پایہ نیست ستارہ فراواں و ایزد یکیست
ہمہ زیر فرمانش بیچارہ اند چہ با سعد و نحس اند و سیارہ اند

اسی قسم کا بطلان ایک اور موقع پر مشاہدہ میں آتا ہے جہاں شاعر کہتا ہے—

یکے دائرہ آمدہ چنبری فراواں در آں دائرہ داوری
اگر چرخ را ہست ازین آگہی ہما نا کہ گشتست مغزش تہی
چناںداں کزیں دانش آگاہ نیست بچون و چرا سوے او راہ نیست

یزد جرد خاتم تاجداران عجم کے قتل کے وقت فردوسی گویا ہے—

ز خاک آمد و خاک شد یزد جرد چہ‌گوئی تو زیں بر شدہ ہفت گرد
چو از گردش او نیابی رہا پرستیدن او نیارد بہا
بیزداں گراے و بد و کن پناہ خداوند گردون و خورشید و ماہ

کسی اور مقام پر شاعر آسمان کو خطاب کر کے شکایت میں گرم سخن ہے—

الا اے برآوردہ چرخ بلند چہ داری بہ پیری مرا مستمند
چو بودم جواں بر ترم داشتی بہ پیری مرا خوار بگزاشتی
بکردار مادر بدی تا کنوں ہمی ریخت باید برنج تو خوں
وفا و خرد نیست نزدیک تو پراز رنجم از راے تاریک تو
مرا کاش ہرگز نہ پروردۂ چو پروردہ بودی نیازردۂ

بر انکه کزیں تیرگی بگذرم | بگویم جفاے تو یاد آورم
بنالم ز تو پیش یزدان پاک | خروشاں بسر بر پراگندہ خاک
چنیں داد پاسخ سپهر بلند | که اے مرد گویندۂ بیگزند
چرا بینی از من همی نیک و بد | چنیں ناله از دانشی کے سزد
تو از من بهر بارۂ بهتری | روانرا بدانش همی پروری
خور وخواب و راے نشستن تراست | به نیک و به بد راه جستن تراست
بریں هرچه گفتی مرا راه نیست | خورو ماه زیں دانش آگاه نیست
من از آفرینش یکے بندہ ام | پرستندۂ آفرینندہ ام
نگردم همی جز بفرمان اوے | نتابم همی سر ز پیمان اوے
ازاں خواہ راحت که ایں آفرید | شب و روز و آئین و دیں آفرید
چگوید بباش آنچه خواهد بد است | کسے کو جزیں داند او بیهودہ است
یکے آنکه هستیش را راز نیست | بکاریش فرجام و آغاز نیست
جز او را مخواں کردگار سپهر | فرزوندۂ ماہ و ناهید و مهر
بیزداں گراے و بیزداں پناہ | بر اندازہ رو هرچه خواهی بخواہ
وزو بر روان محمد درود | بیارانش بر هر یکے بر فزود

یه اشعار فردوسی کے فلسفه اور اس کے مذهب کے لب لباب هیں- فلسفه سے ذوق فردوسی کو اگرچه بے حد هے لیکن ایسا معلوم هوتا هے که فلسفه کسی وقت بهی اس کو پوری تسلی اور اطمینان نهیں دے سکا—

جب هم شاهنامه کهولتے هیں اور تمهید میں ایسے بیانات مثلاً ستایش خرد- ستایش روح- بیان آفرینیش- جمادات- نباتات- حیوانات- انسان- افلاک- آفتاب و ماهتاب پڑهتے هیں تو ایسا معلوم هوتا هے که افلاطوں اور ارسطو کا شاگرد جو یونان کے دبستان کی تمام روایات سے بخوبی ماهر هے حکمت و فلسفه کی نکات کی فارسی زبان میں ترجمانی کررها هے لیکن جوں جوں شاهنامه کی

منازل قطع ہونا شروع ہوتی ہیں۔ یونانی فلسفی برت کے تودہ کی طرح تابش آفتاب سے گھل کر غائب ہوجاتا ہے اور اس کے بجائے حقیقی فردوسی نمودار ہوتا ہے جو یاس و قنوط اور الم پرستی کے اثرات میں بالآخر حکمت سے اعتزال کرکے مذہب کی آغوش میں اپنے آپ کو سپرد کردیتا ہے —

حکمت سے فردوسی کی رو گردانی کے دو بڑے وجوہ معلوم ہوتے ہیں پہلا ہستی واجب الوجود جس میں اکثر فلاسفہ کو کلام رہا ہے۔ شاعر کسی فلسفی کو خطاب کرکے کہتا ہے —

کہ تم جو ہر شے پر عقل کی عینک چڑھا کر نظر ڈالتے ہو یہ سلوک واجب الوجود کے ساتھہ مناسب نہیں۔ گفتگو اور بحث تو کبھی ختم نہیں ہوسکتی لیکن اگر تم معقول پسند ہو تو راہ راست پر چلو اور مانو کہ ہماری دانش بیچارگی ہے اور خدا کی ذات ہماری سرحد ادراک کے ماوراء ہے۔ بس اسی قدر جاننا کافی ہے کہ خدا ہے اور ایک ہے۔ تم اپنی ذات کو بہت دور کھینچتے ہو لیکن یاد رہے کہ طرفۃ العین میں روح اور جسم میں مفارقت ہوجاتی ہے۔ زمانہ فانی ہے اور تمہارا اصلی ٹھکانہ کوئی اور مقام ہے۔ سب سے مقدم تم خدا کی یاد کرو اور اس کی پرستش کرتے رہو جس سے افلاک قائم ہیں اور جو نیکی کی طرف ہماری رہنمائی کرتا ہے —

ایا فلسفہ دان بسیار گوے	نپویم برا ہے کی گوئی بپوے
ترا ہرچہ بر چشم بر بگذرد	بگنجد ہمی در دلت با خرد
چنانداں کہ یزدان نیکی دھش	جز آنست وزیں بر مگر داں منش
تو گر سفتۂ راہ سنجیدہ پوے	نیاید بہ بن ہرگز ایں گفتگوے
ہمہ دانش ما بہ بیچارگی است	بہ بیچارگاں بر بباید گریست
ہمداں تو او راکہ ہست و یکے است	رواں و خرد را جزیں راہ نیست
بیکدم زدن رستی از جان و تن	ہمی بس بزرگ آیدت خویشتن

همی بگذرد بر تو ایام تو — سرای جز این باشد آرام تو
نخست از جہاں آفریں یاد کن — پرستش بریں یاد بنیاد کن
کزو یست گردون گرداں بپای — هم او یست بر نیکوئی رهنمای

کسی اور موقع پر فردوسی پھر یہی گفتگو دوھرا رھا ھے اور کہتا ھے کہ واجب الوجود کی ھستی میں نزاع کرنا اگر سوچو گے تو بے کار ھے - پروردگار تمہارا خدا ھے اور تم اس کے بندے ھو نہ وہ کھاتا ھے نہ وہ سوتا ھے - کور دل اور بے خرد ھی اس کی ھستی کے معترف نہ ھوں تو نہ ھوں مگر دانا ان کو انسان نہیں مانیں گے - تم اپنی دانش کے اعتماد پر اپنے آپ کو ضلالت کے گڑھے میں نہ ڈالو کیونکہ اس کی ھستی کی علامات اور آیات آب و خاک اور ھر شے سے ھویدا ھیں - وہ دانا توانا اور دارندہ ھے عقل اور نفس کا نقش بند وھی ھے - جہان - مکان و زماں اس کی مخلوق ھیں - وھی پیل و پشہ کا خالق اور خورشید و ماہ کا خداوند ھے جو ظفر اور قدرت عطا کرنے والا ھے - راستی اور ھستی کا مالک - کمی اور افزونی کا ظہور پیرا - کامیاب بنانے والا - مہربان جو ھم کو رزق دیتا ھے در آنحالیکہ ھم سے بے نیاز ھے - عالم اور آفتاب - زھرہ اور آسمانوں کا خداوند جس کی رائے اور حکم کے سوا ھمارے لئے کوئی اور راستہ نہیں ھے —

کنوں اے خردمند بیدار دل — مشو در گماں پای در کش ز گل
چو گردن باندیشہ زیر آوری — ز ھستی مکن پرسش و داوری
ترا کردگاریست پروردگار — توئی بندۂ کردۂ کردگار
نشاید خور و خواب با او نشست — کہ خستو نباشد بیزداں کہ ھست
دلش کور باشد زباں بیخرد — خرد مندش از مردماں نشمرد
ز ھستی نشانست بر آب و خاک — ز دانش مکن خویشتن در مغاک
توانا و دانا و دارندہ اوست — خرد را و جانرا نگارندہ اوست
جہاں آفرید و مکان و زماں — پے پشۂ خورد و پیل ژیاں

خداوند کیوان و خورشید و ماہ کزو یست پیروزی و دستگاہ
خداوند هستی و همراستی ازو یست بیشی و همکاستی
خداوند بخشندۂ کارساز خداوند روزی دہ بے نیاز
خداوند گیتی خداوند مہر خداوند ناهید وگرداں سپہر
جز از راے و فرمان او راہ نیست
خورو ماہ ازیں دانش آگاہ نیست

کشیدگی کا دوسرا باعث یه هے که فردوسی زندگی کے روز مرہ کے واقعات نیکی-بدی-راحت و آرام-بد بختی و نیک بختی-داد و بیداد الغرض هر سوال کا جواب فلسفه سے مانگتا هے لیکن یه ممکن نہیں که فلسفه هر شے اور هر واقعه کا علت و معلول بتا وے-مثلاً فردوسی یزد گرد آخری تاجدار ایران کے قتل کے خونیں واقعات لکھه کر ایک گہری فکر میں مستغرق دیکھا جاتا هے-وہ یه سوچ رها هے که یزد جرد کے مارے جانے کو داد کہا جائے یا ستم-حق کہا جائے یا نا حق-اب فلسفه اس کا کوئی جواب نہیں دیتا-اگر دیتا هے تو ایسا جس سے اطمینان نہیں هوتا اور مشکل حل نہیں هوتی-وہ کہتا هے—

چنیں داد خوانیم بر یزد جرد وگر کینه خوانیم زیں هفت گرد
وگر خود ندانند همی کیں و داد مرا فیلسوف ایچ پاسخ نداد
وگر گفت مارا سخن بسته گفت بماند همی پاسخ اندر نہفت

ایسے موقعوں پر دانائے طوس مذهب کے دامن میں پناہ لیتا هے-مثلاً داستاں سہراب کی تمهید میں حسب معمول همارا شاعر فلسفیانه خیالات میں مستغرق نظر آتا هے-اس گہری فکر کے بانی سہراب کا قتل اور اس کی بے وقت موت کے واقعات هیں-انپر وہ اس پیرایه میں استدلال کر رها هے که اگر باد صرصر ترنج خام کسی درخت سے گرادے تو باد کے اس فعل کو داد کہاجاے یابیداد-اچھا کہا جائے یابرا-حکمت کے اس مقوله کو که اگر موت نہیں هوتی اور سلسلۂ

توالد وتناسل یوں ہی جاری رہتا تو زمیں پر رہنے بسنے کو توکیا انسان کو کھڑے رہنے کو بھی جگہ میسر نہ آتی - فردوسی ابتداے مراحل ہی میں تسلیم کر لیتا ہے —

اگر مرگ کس را نیوبار دے زپیرو جواں خاک بسیار دے

اچھا اس سے یہ تو مان لیا گیا کہ موت کا وجود ضروری اور برحق ہے —

دریں جاے رفتن نہ جاے درنگ

بر اسپ قضا گر کشد مرگ تنگ

چناں داں کہ داد است و بیداد نیست

چو داد آمدش بانگ و فریاد چیست

لیکن جب موت آتی ہے تو اس آندھی کیطرح جو کچے پکے نیبوکی پروا نہیں کرتی اور سب کو گراتی آتی ہے - جوان بوڑھے - چھوٹے اور بڑے میں کوئی فرق نہیں کرتی - مرگ اگرچہ انصاف ہے لیکن جوانمرگی بظاہر داد نہیں معلوم ہوتی - فلسفہ اس کی عقدہ کشائی سے عاجز ہے - فردوسی مذہب کی طرف رجوع کرتا ہے اور مذہب اس کے کان میں کہتا ہے کہ یہ خدائی راز ہیں اور فہم انسانی سے باہر - اگر ایمان کی سلامتی چاہتے ہو توان وساوس کو دل میں جگہ ندو اور خاموش ہو رہو - اپنے دین میں خلل ڈالنا اگر منظور نہیں تو جوان اور بوڑھے کی موت میں کوئی امتیاز نہ کرو - خدا کی پرستش کرتے رہو اور اس کی جناب میں عجز و نیاز سے پیش آؤ - اپنے آخری وقت کے لئے مستعد رہو اور کوشش کرو کہ خدا تمہارا خاتمہ اسلام پر کر دے —

بریں کار یزداں ترا راہ نیست	اگر دیو با جانت انباز نیست
جوانی و پیری بنزد اجل	یکے داں چو در دیں نخواہی خلل
دل از نور ایماں گر آگندۂ	ترا خامشی بہ کہ گو یندۂ
پرستش ہماں پیشہ کن با نیاز	ہمہ کار روز پسیں را بساز

بکیتی در آں کوہ چوں بگزری
سرانجام اسلام با خود بری

شاعری اور پریاں

از

مولانا مولوی محمد عبدالحلیم صاحب شرر

ہر ملک اور ہر زبان کی شاعری کا ایک بڑا عنصر پریاں ہیں۔سنسکرت شاعری اپسراؤں کے تذکروں سے بھری ہوئی ہے۔جو ہندو دیو مالا کی پریاں ہیں۔کالی داس نے سکنتلا کی ماں ایک آسمانی پری کو بتایا اور اس کا دوسرا ڈراما "وکرم اروسی" اسی خوبصورت و دلربا مخلوق کا دلکش افسانہ ہے۔ ہومر نے اپنی مثنویوں میں پریوں کے واقعات تاریخ کے عنوان سے بتائے ہیں۔ شیکسپیر نے اپنے مشہور ڈراما "مڈسمرنائٹس ڈریم" میں پریوں کے حلقہ باندھ کے ناچنے کا سماں دیکھا ہے—

عربوں کی جاہلیت کی شاعری اگرچہ قومی مفاخر۔فیاضی و شجاعت کی تعریف۔امرا کی مدح سرائی۔اظہار عشق اور عزیزوں و دوستوں کی لاشوں پر مرثیہ خوانی تک محدود تھی مگر اس پر بھی وہ جنوں اور پریوں کے تذکرے سے خالی نہیں ہے۔عربوں کو بنی اسرائیل کی کتابوں اور اپنی قدیم روایتوں سے حضرت سلیمان کا جنوں اور شیطانوں۔عفریتوں اور پریوں پر حکومت کرنا معلوم ہوا تھا اور یقین رکھتے تھے کہ ملکہ بلقیس جو حضرت سلیمان سے ملنے کو گئی ایک پری کی بیٹی تھی۔اسلام نے اس خیال کی ایک حد تک تائید کی۔چنانچہ ان کی "الف لیلہ" پریزادوں اور جنوں کے واقعات سے

بھری پڑی ہے-رہی فارسی شاعری وہ تو گویا پریوں ہی کا حسن و جمال ظاہر کرنے کے لئے بنی تھی—

قدیم الایام میں ایسی مافوق الفطرت مخلوق کا یقین اس قدر غالب تھا کہ مذاہب میں سے شاید کوئی نہ ہوگا جس نے ایسی ہستیوں کے وجود کو تسلیم نہ کرلیا ہو چنانچہ ہندؤں کی اپسرائیں فارسیوں کی پریاں اور عربوں کے جن و عفریت سب نے مذہب کے آغوش میں نشو و نما پایا ہے-حضرت مسیح جنوں کو اتارا کرتے-اور عربوں کا عقیدہ تھا کہ اکثر بیماریاں جنوں کے چھو جانے یا سایے سے ہوتی ہیں—

جن ہوں یا دیو و پری ان کی نسبت عام یقین ہے کہ مادی انسان اور روح خالص کے درمیان ایک مخلوق ہیں-مادی جسم رکھنے کے ساتھ قادر ہیں کہ اپنے آپ کو غیر مرئی بنادیں یعنی نظروں سے غائب ہو جائیں-حیوۃ الحیوان میں ان کی تعریف یہ بیان کی ہے کہ "ہوائی جسم ہیں جو مختلف صورتوں میں نمودار ہونے پر قادر ہیں-ذی عقل و صاحب فہم ہیں اور ایسے دشوار کام کرسکتے ہیں جو اوروں سے نہیں ہو سکتے-" اس کے علاوہ ان کے یہ خصوصیات بھی مانے جاتے ہیں کہ وہ ہر طرف اڑتے پھرتے ہیں اور کوئی مقام کیساہی مخفی و محفوظ اور مقفل و مسدود ہو اس میں پہونچتے یا نفوذ کرجاتے ہیں-کبھی آسمان کے قریب ہوتے اور کبھی تحت الثریٰ کی سیر کرتے ہیں-خلاصہ یہ کہ انسانی خیال کے پروں سے اڑتے ہیں اور جہاں تک ہمارا خیال جاتا ہے وہاں تک ان کی بھی رسائی ہو جاتی ہے-یورپ میں یہ خیال بھی تھا کہ وہ سبز پوش رہتے ہیں ان کے رہنے کے مقامات وہ ہیں جہاں انسان نہیں رہتا یا نہیں پہونچ سکتا-خاموش صحرا-اجاڑ کھنڈر-گھنے جنگل-سنسان مرغزار-پہاڑوں کی خاموش گھاٹیاں سب ان کے مسکن ہیں—

ہندؤں کی اپسراؤں کا نشیمن پہلے آسمان کا کوئی حصہ ہے-ایرانیوں کے

پریزاد پہاڑوں خاصتاً کوہ قاف کی وادیوں میں رہتے ہیں۔غالباً انہیں سے یہ خیال عربوں میں پہونچا اور ان کے پریزاد کوہ قاف سے آکر بحر قلزم اور خاموش دشت ہائے عرب کی سیر کرنے لگے —

مجوس میں یزدان پاک نہاد کے مقابل اہرمن ناپاک سرشت اور اس کی فوج کے لوگ تھے-جو اگرچہ بد صورت تھے مگر ان کی شان یہی تھی کہ جب چاہتے نظر کے سامنے آتے اور جب چاہتے غائب ہو جاتے۔مگر مذاہب اہل کتاب میں وہی اہرمن اور اس کی فوج والے جن و شیاطین کے لقب سے یاد کیے گئے اور ان کی نسبت یہ عقیدہ قائم ہوا کہ خدا کے رقیب اور اس کی برابری کا دعویٰ کرنے والے نہیں اسی کے مخلوق ہیں-لیکن برگشتہ ہوکر اس کی خوشنودی کے خلاف کام کرنے لگے اور اس سے لڑنے کو تیار ہوگئے-جس لڑائی اور سرداران و عساکر شیاطین کا نہایت ہی دلچسپ تماشہ ملٹن نے اپنی " پیراڈائز لاسٹ " میں دکھایا ہے —

اسی شان کے مخلوق قران میں جن بتائے گئے اور ان کی سرشت آتشی بیان کی گئی جس سے ابتدائے تخلیق عالم ارضی کی یہ تاریخ مدون ہوئی کہ دنیا میں انسان سے پہلے جن رہتے تھے-آدمی تو خاک سے پیدا ہوا ہے مگر وہ آگ سے پیدا کئے گئے تھے-انسان دنیا میں آیا تو زمین کے آباد اور اچھے حصوں پر قابض ہوگیا اور جنوں کو پہاڑوں اور دور و دراز صحراؤں میں اسی طرح بھگا دیا جیسے آریہ لوگوں نے ہندوستان میں آکے پرانے مجہول النسب رہنے والوں کو مار کے بھگا دیا تھا اور جیسے آریہ لوگوں نے مغلوب مفتوحوں کو راکشس اور شودر کے لقب دیے تھے ویسے ہی مسلمانوں نے ان جنوں کو شیطان قرار دیا-مگر ان کے عقائد کی رو سے وہی جن شیطان تھے جو برے اور کافر ہوں۔ مسلمان جن جن ہی کہلاتے رہے —

اجنہ کے آتشیں نژاد ہونے کی بنا پر لوگ اپنے پرانے عقیدے اور قیاس سے

کام لے کر اس تحقیق کو پہونچے کہ آگ میں دو چیزیں ہیں ایک شعلہ اور دوسرے دھواں لہذا شعلے سے جو پیدا ہوئے وہ پریزاد اور جن ہیں اور دھویں سے جو پیدا ہوئے وہ دیو و عفریت ہیں۔ دیو کا لفظ ہندؤں میں عنصر الٰہی کا ایک مظہر مانا جاتا تھا۔ فارسیوں نے اس کو شیطان کے مرادف تصور کیا یا بنا دیا اور بعد والوں کو ان کے حاشیے سے ایک دودی مخلوق بتانے کا موقع مل گیا —

بعد ازاں فارسیوں میں یہ خیال پیدا ہوا کہ جنوں اور دیووں دونوں میں نر و مادہ ہوتے ہیں۔ جنوں کے نر پریزاد اور ان کی مادائیں پریاں ہیں اور دیووں کے نر دیو اور مادائیں دیونیاں ہیں پھر مذہب کی مساعدت سے یہ عقیدہ پیدا ہوا کہ پریزاد اور جن عموماً نیک ہوتے ہیں۔ ان میں سے اکثر بڑے دیندار ہیں اور انسانوں کو بہت کم ستاتے ہیں اور دیو عموماً برے ہوا کرتے ہیں جو آدمیوں کو ستاتے مارتے اور ہڑپ کرجاتے ہیں۔ اسی مناسبت سے انسانی خیال کے مہیب تر خط و حال اور پہاڑوں کے ایسے قد و قامت ان کی طرف منسوب کئے گئے۔ پھر ہندوستان میں یہ خیال قائم ہوا کہ جن و پری حاکم ہیں اور دیو ان کے غلام جو اکثر کہاروں کا کام دیتے ہیں۔ یعنے پریوں کے تختوں کو کندھے پر رکھ کے اڑتے پھرتے ہیں اور جہاں وہ حکم دیں لے جاتے ہیں —

عرب میں یہ عام خیال تھا کہ جنوں میں بغیر پروں کے اڑنے کی طاقت ہے۔ وہاں وہ صرف روحانی قوت یا آتشی فطرت بلند پروازی سے بغیر پروں کے اڑتے تھے۔ مگر ایران کے دیوو پری پردار تھے اور پروں کی مدد سے اڑتے تھے ہندوستان کی اپسراؤں کی شان سب سے جدا ہے۔ ان کے لباس میں اڑنے کی قابلیت ہوتی ہے۔ چنانچہ وہ اپنی ساریوں کی مدد سے اڑا کرتی ہیں۔ اگر کوئی ان کی وہ ساری چھین لے تو پھر ان میں اڑنے کی مطلق طاقت نہیں رہتی —

ایران میں جس طرح دیووں کی نسبت انتہا سے زیادہ بد صورتی مانی جاتی اور اُن کے ڈراونے شکل و شمائل تصور کئے گئے ہیں ویسے ہی پریوں کی نسبت خیال ہے کہ وہ انسانی خوبصورتی کا مکمل ترین نمونہ۔ بنی آدم کی عورتوں سے مافوق الفطرت حسن رکھنے والی اور جنت کی حوروں کے مثل نہیں تو ان سے ملتی جلتی ہیں۔اس کے ساتھہ ہی یہ بھی ماناجاتا ہے کہ پریاں کبھی انسانوں پر عاشق ہوجاتی ہیں اور جن و پریزاد کبھی آدمیوں کی عورتوں پر فریفتہ ہوجاتے ہیں—

تاریخ کے ابتدائی واقعات ایسے حوادث سے بھرے پڑے ہیں کہ انسان شہزادوں اور شہزادیوں کے ساتھہ پریوں اور جنوں کے نکاح ہوئے۔ ان سے اولادیں پیدا ہوئیں۔اسی خیال پر بہت سے نثرقصوں اور مثنویوں کی عمارت قایم کی گئی اور پھراسی کی بدولت حسن وعشق کی دنیا اور ہماری شاعری میں جان پڑی اور غیرمعمولی جوش و ولولہ پیدا ہوگیا—

یہ عقیدہ اگرچہ آب وہم وخیال ہوتاجاتاہے مگرعوام الناس کی بہت بڑی تعداد آج تک اس کو ایک دینی اعتقاد کی شان سے مان رہی ہے۔جس نے عاملوں اور ملا سیانوں کا ایک گروہ پیدا کردیاہے جو اپنے عملوں۔ تعویذوں اور فلیتوں (معاف فرمائیے اگرچہ صحیح فتیلہ ہے مگر میں اس موقع پر فلیتہ ہی کو صحیح سمجھتاہوں) سے جنوں کوجلاتے۔ پریوں کو شیشہ میں اُتارتے اور دیووں کو باندہ کے مارتے ہیں۔چنانچہ یہ فن ایک اچھا ذریعۂ معیشت بن گیا ہے—

مگرمجھے ان عاملوں سے تعلق نہیں۔میں تو فقط یہ دکھانا چاہتاہوں کہ اس مافوق العادت مخلوق نے ہماری شاعری پر کیسا اور کتنااثر ڈالا—

ہمارے یہاں عربی الفاظ کی طرح عرب کے اجنہ و شیاطین اور عفریت بھی ایران ہوتے اور فارسی شاعری کے سانچے میں ڈھلتے ہوئے آئے۔پھر ہندوستان میں پہونچ کر انہوں نے سنسکرت اور ہندی مذاق کا لباس پہنا—

عرب کی شاعری میں بجز جابجا اس مخلوق کا نام آجانے اور اُن کے برے یابھلے کرشموں کی طرف اشارہ ہونے کے کوئی منظوم قصہ ہماری نظر سے نہیں گزرا - کتاب " حیوۃالحیوان " میں دمیری نے جنوں کا حال بہت تفصیل سے بیان کیا ہے - آیات قرآنی اور احادیث اور رطب ویابس روایتوں سے ان کے ہونے کا ثبوت دے کر مختلف واقعات بیاں کئے ہیں - اِس کے بعد فارسی میں اِن دیکھتے دیکھتے غائب ہوجانے والون کے واقعات پر خوب خوب داد سخن دی گئی ہے - اور یہ ہونا بھی چاہئے تھا اس لئے کہ پریوں کا خاص وطن کوہ قاف تھا جو ہمیشہ ایرانیوں کے زیر اثر رہا اور ایرانیوں کے دماغوں پر یہ مہیب وعالی شان سلسلۂ کوہ مدت ہاے دراز سے اثر ڈالتا رہا تھا - کوہ البرز کی چوٹی ان کے حوصلوں کی منتہی رہی - ان کا سیمرغ اسی پہاڑ میں رہتا تھا - ان کی پریاں قاف کی انہیں وادیوں اور بلندیوں سے اڑ اڑ کے آیا کرتی تھیں جہاں سمجھا جاتا تھا کہ ایک نہایت ہی دلکش ونزہت بخش جنت پہاڑوں کے آغوش میں دور تک پھیلتی چلی گئی ہے - اور اسی حسن خیز سرزمین نے شاید انہیں عالم آشوب حسن بھی عطا کردیا ہے —

عربوں کے جنوں اور عفریتوں کے جسموں میں زندگی بخش سواد عجم میں پہونچتے ہی پرنکل آئے - اِس لئے کہ پروں کو وہ وہاں سے اپنے ساتھہ نہیں لائے تھے اور غالباً ان کی مادائیں بھی اتنا حسن وجمال لے کے نہیں آئی تھیں - گرجستان اور خلخ کے حسن نے جو ایرانیوں کی جان تھا پریون کو اپنے حسن کا لباس پنہایا تو عفریت ہاے عرب کے جسم کوہ البرز کے دامن میں نشوونما پا کے ان پہاڑون ہی کے ایسے قدوقامت نکال لائے اور اُن کی بدصورتی انتہائی کمال کو پہونچ گئی —

فردوسی نے دیووں کے خصوصیات اور حلیے رنگوں کے لحاظ سے قایم کئے - سفید دیو رستم سے اُس کی ہفتخواں میں لڑا - کالے دیو ایرانیوں میں علی العموم

ھوتے تھے-چنانچہ دیووں سے بد صورتی وھیبت ناکی کی اور پریوں سے حسن وجمال کی تشبیہہ میں کام لیا جانے لگا-میرا خیال ھے کہ پریوں میں رنگوں کے لحاظ سے امتیاز ھونا بھی ایرانیوں ھی کی جدت طرازی ھے-ھمارے یہاں کی لال-سبز-زرد-نیلم پریاں ان رنگوں کی آب وتاب دکھاتی ھوئی ایران سے آئی ھیں-ھندو دیومالا اور شاعری میں پریوں کی اس بوقلمونی کا کہیں پتہ نہیں مگر باوجود اس کے فارسی کی قدیم مثنویون مھں سے بہت کم صرف پریون کے حالات اور ان کے حسن و عشق کے افسانے ھیں-ضمناً اُن کا تذکرہ بے شک آگیا ھے-ایرانی جاھل مردون اور عام عورتون میں آج تک رنگین پریون کا خیال کثرت سے پھیلا ھوا ھے اور ایک دینی عقیدے کی شان رکھتا ھے--

محمود غزنوی کے جھنڈے کے ساتھہ یہ جن و دیو و پری ھندوستان میں آکر یہاں کی اپسراؤں-دیوتاؤں اور راکشسوں سے ملے-فارسی مثنویوں-عام نظموں اور نثر قصوں کی پریاں ھر طرف پھیل گئیں اور اردو زبان کی ابتدائی پرورش کہنا چاھئے کہ خاص پریوں کے گود میں اور دیوؤں کے کھلانے بہلانے سے ھوئی--

شاعری خیال آفرینی کا نام ھے اور میں سمجھتا ھوں کہ خیال آفرینی کو جتنا انس خیالی اور خیال کی پیدا کی ھوئی چیزوں سے ھوتا ھے واقعی اور محسوسی چیزوں سے نہیں ھوتا-فلسفۂ تحقیق سے اس کو وحشت ھوتی ھے اور اس کے تمام قویٰ کمزور پڑ جاتے ھیں-جس طرح مچھلی پانی سے نکل کے زندہ نہیں رہ سکتی اسی طرح شاعر کی زندگی بھی اسی وھمی و خیالی عالم تک ھے جس میں پریاں اڑتی پھرتی ھیں-دیو آ آ کے مقابلہ کرتے اور لڑتے ھیں--

چنانچہ کسی زبان کی شاعری نہیں جس میں اس قسم کے خیالی مخلوقات سے جان نہ پڑی ھو-اردو عہد جدید میں پیدا ھوئی اور اس کا نشو و نما ایسے زمانے میں ھوا جب کہ یہ خیالی کھلونے دنیا کے ھاتھہ سے چھینے جاتے ھیں-تحقیق

و واقعیت کا دور ختم ہو گیا اور ہر بات کی دلیل پوچھی جاتی اور ہر واقعہ کا ثبوت طلب کیا جاتا ھے-ایسے زمانے میں دیو و پری کا وجود اگر فنا نہ بھی ہوا تو ان میں وہ اگلی قوت و توانائی نہیں باقی رھی اور جس حد تک ان خیالی ہستیوں کا زور ٹوٹتا گیا اسی قدر شاعری کا مزہ بھی پھیکا پڑتا گیا اور پڑتا جاتا ھے —

مگر باوجود زمانے کی نا مساعدتی کے اردو شاعری نے اپنے ابتدائی عہد کے ذوق و شوق میں اِن آتشی مخلوقوں سے کم فائدہ نہیں اُٹھایا-ولی سے میر صاحب کے عہد تک بعینہ فارسی کی پریوں اور ایران کے دیوں سے تشبیہہ و استعارے کا کام لیا جاتا رھا اور عشق کی شمع ھمیشہ اِن آتشین پیرھنوں کے شعلۂ رخسار سے روشن کی گئی—

بعد ازاں مثنویوں کی تصنیف کا سلسلہ شروع ھوا تو خیال آرائی نے دیو و پری سے بہت زیادہ کام لیا-سب سے پہلے مثنوی سحرالبیان لکھی گئی تو اُس میں شاھزادی بدر منیر کی رقیب ایک پری دکھائی گئی-اِس کے چند روز بعد لذت عشق نام ایک مثنوی شایع ھوئی تو اُس میں بھی ایک پری ھی کے ذکر سے گرمی عشق پیدا کی گئی-پھر مثنوی گلزار نسیم شایع ھوئی تو اُس میں اصلی معشوقہ پری ھی تھی-اگرچہ یہ قصہ نثر اردو میں پہلے سے موجود تھا-اِس کے بعد مثنوی طلسم الفت شایقین سخن کے ھاتھوں میں آئی تو اُس میں بھی حسن و عشق کے چراغ میں شعلہ پری کی آتشین جبیں سے روشنی پیدا کی گئی تھی-چند روز میں اِن مثنویوں اور اِن کے ساتھہ بیسیوں نثر کے قصوں اور داستاں گویوں نے سنت شعرا قرار دے دی کہ کوئی مثنوی لکھی جائے تو جب تک اُس میں پریوں اور دیویوں کا تذکرہ نہ ھو پڑھنے والوں کو مزہ نہ آتا-

یہ سب یریاں وھی ایرانی پریاں تھیں یعنی پروں سے اُڑتی تھیں ھندو دیوتاؤں سے اُن کو کوئی تعلق نہ تھا-اُن کے سروں پر ایرانی تاج ھوتے اور

ایرانی لباس یا ہندوستان کے مسلمانوں کا لباس ہوتا۔کوہ قاف سے اُن کو خصوصیت ہوتی —

یہی پریاں کتابوں کے ورقوں اور سخن سنجوں کے دماغوں میں پھر رہی تھیں کہ واجد علی شاہ کا دور آیا اور اُردو شاعری اپنے پرانے حدود پر بہت کچھہ ترقی کر آئی۔واجد علی شاہ کو بعض انگریز مصاحبوں کے خیال دلانے سے ڈراما کا شوق ہوا۔سری کرشن جی کی عاشقانہ زندگی کے پرانے ہندی ناٹک یعنی رہس نے ڈراما کا ایک خاکہ ان کی نظر میں پیش کر دیا اور خود جان عالم پیا کے نام سے کنہیا بن گئے۔اب وہ قیصر باغ اور اُس کے آس پاس کے باغوں اور کنجوں میں عاشق مزاج معشوق بنتے۔گوپیاں اور پریاں ان کے شوق میں ماری ماری پھرتیں۔کبھی وہ دھونی رما کے جوگی بنتے اور کبھی پریاں ان کے فراق میں زلفیں کھول کے اور سر پر اندوا رکھہ کے جنگلوں کی خاک چھانتیں —

لیکن اسی زمانے میں ایک نامور شاعر امانت نے اردو کا پہلا ڈراما یعنی اپنی اندر سبھا تصنیف کی اور تصنیف کے ساتھہ ہی وہ عام طور پر کھیلا جانے لگا۔امانت اگرچہ رعایت لفظی کے بادشاہ ہیں اور اِسی رعایت کے شوق میں بعض وقت اپنے اشعار کو غارت کر دیتے ہیں مگر اندر سبھا میں اُن کو سادی زبان اور سادہ رنگ شاعری اختیار کرنا پڑا۔مگر اُن کا سب سے بڑا کمال اِس اردو ڈراما میں یہ تھا کہ فارسی پریوں اور دیووں کو ہندو دیومالا کے مذاق کے سانچے میں ڈھال دیا۔اس مذاق کی اصلی ایجاد کا سہرا تو خود واجد علی شاہ کے سر ہے جنھوں نے بادشاہ سے کنہیا جی بن کر گویا ہندو مسلمانوں کو ہم آغوش کر دیا۔مگر امانت نے اندر سبھا میں اس امر کو نمایاں کرکے دکھا دیا کہ اب ہندوستان کے دیو پری کس شان کے ہیں —

اندر سبھا کو غور سے پڑھئے تو نظر آئے گا کہ راجہ اندر ہندؤں کا ایک بڑا دیوتا ہے جو مسلمان بادشاہوں کے وضع و لباس میں ایرانی تاج پہنے

مغلیه دربار کے تخت پر بیٹھا ھے اور ھندو دیو مالا کے مذاق کے مطابق پریوں کا ناچ دیکھه رھا ھے-ایران کے دیووں نے ھندو راکشسوں کا حلیه اختیار کرلیا ھے جو راون کی فوج و سپاھی بنے ھوے ھیں-ایران کی پکھراج-لال-نیلم اور سبز پریاں پر لگائے اور مسلمان امیر زادیوں کا لباس پہنے اُڑنے والے تختوں یعنی ھندي اُڑن‌کھٹولوں پر بیٹھه کے آتی-ھندی دھنوں میں گاتی اور ھندي گتوں پر ناچتی ھیں-رھتی قات میں ھیں اور بولتی اردو زبان ھیں-ھندستان کی مسلمان سوسائٹی کی معشوقائیں ھیں اور اردو غزلوں کے ساتھه ھندی گیت ان کے گلوں سے سنے جاتے ھیں-شاھزادۂ گلفام اپنے نام سے ایرانی-اپنی وضع سے اودھ کے خاندان شاھی اور لکھنؤ کی شیعه سوسائٹی کا شاھزادہ ھے-اس کا لال محل لکھنو کی سرخ عمارت جس میں پہلے شاھان اودھ کا تخت ھوتا اور اب عجائب‌خانه ھے اور اس کا شہر اخترنگر لکھنؤ ھے جس کو واجد علی شاہ کی شاعرانه خیال آفرینی نے اس نام سے موسوم کردیا تھا—

بڑے لطف کی بات یه ھے که سبز پری رھتی کوہ قات میں ھے اور گلفام کو اخترنگر لکھنؤ سے بلواتی ھے اور بلواتے وقت کالے دیو سے کہتی ھے که " جا تو سنگل دیپ سے اخترنگر میں ھاں "-یعنی جزیرۂ سراندیپ ھوتا ھوا جو ھندو دیومالا کی رو سے راون کا مرکز حکومت اور ھندی مذاق کے دیووں کا نشیمن تھا—

پھر راجه اندر برھم ھوکے گلفام شاھزادے کو قید کرتا ھے تو کنویں میں جو چیز اگلے زمانے میں ھندوؤں کا نہیں بلکه کیانیوں اور زابلستانیوں کا قید خانه تھا-بعد ازاں سبز پری اس کے فراق میں بیتاب ھوتی ھے تو ھندوستان کی جوگن بنتی ھے جس کے چھرے اور پنڈے میں ھندوستان کی بھبوت ملی ھے-سر پر ھندوستانی اندوا ھے-زلفیں ھندوستانی جوگنوں کی جٹائیں ھیں اور کندھے پر ھندوستان کا پرانا باجا " بین " ھے اس کے نغمے میں

فارسی شاعری-ہندوستان کی موسیقی-لکھنؤ کی ٹھمریاں-ہندوؤں کی ہولیاں اور اردو اور بھاشا زبانیں ہیں اور یہ سب متبائن الاصل چیزیں مل کے ایسی پر لطف ہوگئی ہیں کہ اس سے زیادہ بہتر مجموعہ مختلف مذاقوں کے یکجا ہو جانے کا بمشکل نظر آسکے گا—

موجودہ سرشتۂ تعلیم نئے کیمیاوی عملوں سے ان اجزا کو جدا کرکے الگ اور بے جوڑ کرنا چاہتا ہے- کہاں بد مذاقی سے کوشش کی جاتی ہے کہ یہ ترکیب مٹا دی جائے اور مختلف چیزوں کے نہایت مناسبت سے گھل مل جانے نے جو خوش آہنگی اور لطیف و دلچسپ نیرنگی پیدا کردی تھی اس کو بے مزہ کردیا جائے- لیکن یاد رکھنا چاہئیے کہ جو خوبی اس اتصال باہمی نے پیدا کی تھی وہ افتراق میں کبھی نہ نصیب ہوگی-کیونکہ ہندوستان کا موجودہ مذاق نہ اکیلا سنسکرت کا ہے نہ عربی کا-نہ فارسی ہے نہ ہندی-بلکہ ان مختلف زبانوں کی شاعری اور ان کے مذہبوں کا مجموعہ ہے—

جوگن

هندوستان قدیم کی ایک موسیقیانہ رات

از

(ابوالمعالی حضرت اختر شیرانی ٹونکی سلمہ)

دیکھو! وہ کوئی جوگن جنگل میں گا رہی ہے
موسیقی حزیں کے دریا بہا رہی ہے
غمگیں نوائیوں سے بیخود بنا رہی ہے
دنیا کے ہر اثر کو دل سے مٹا رہی ہے
سوئی ہوئی فضا کا شانہ ہلا رہی ہے
ہر جنبش زباں سے مردے جلا رہی ہے
بیدار کر رہی ہے مدھوش گھاٹیوں کو
خوابیدہ ساحلوں کی نیندیں اُڑا رہی ہے
ہر لرزش صبا میں طوفاں امنڈ رہے ہیں
پنچم میں کیا رسیلی تانیں اُڑا رہی ہے
دیکھو! وہ کوئی جوگن جنگل میں گا رہی ہے!!

اٹھکھیلیوں کا سن ہے ہنس بولنے کے دن ہیں
لیکن نہ جانے کیوں وہ آنسو بہا رہی ہے؟

آئینہ رنگ سینہ کچھ کھل رہا ہے جس میں
دوشیزگی کی گنگا طوفاں اُٹھا رہی ہے

اک گیروانہ ساری میں ہے بدن چھپائے
یا ہلکی ہلکی بدلی سورج پہ چھا رہی ہے

اک بحر یاسمیں پر لہرا رہی ہے ناگن
یا اس کی زلف مشکیں سینہ پہ آ رہی ہے

ہے اک ستار اس کے آغوش نازنیں میں
دو نازک انگلیوں سے جس کو بجا رہی ہے

دیکھو! وہ کوئی جوگن جنگل میں گا رہی ہے!!

سبزہ پہ چاندنی کے بادل برس رہے ہیں!
یا کوئی حور جنت آنسو بہا رہی ہے؟

ہے موجزن فضا میں اک آبشار سیمیں!
یا ملکۂ پرستاں موتی لٹا رہی ہے؟

اک گرد مرمریں ہے چھائی ہوئی افق پر!
جس کو ہوائے صحرا کوسوں اُڑا رہی ہے!

اک موج گوہریں سی ہر پھول پر ہے رقصاں
نغمہ کی بوئے رنگیں جس میں سما رہی ہے!

یا دن کے مقبرے پر دوشیزۂ شب آکر
گلہائے نور کی اک چادر چڑھا رہی ہے!

دیکھو! وہ کوئی جوگن جنگل میں گا رہی ہے!!

فرش زمردیں پر کچھ پھول سو رہے ہیں
نغمہ کے پر کی جنبش جن کو جگا رہی ہے

جنگل مہک رہا ہے کلیاں چٹک رہی ہیں
ہر تان میں یہ جوگن کیا گُل کھلا رہی ہے ؟

وادی میں موجزن ہے نغموں کی کیف ریزی
ہر پھول ہر کلی پر مستی سی چھا رہی ہے !

اک نہر بہہ رہی ہے تھوڑے سے فاصلہ پر
گاتی ہوئی جو اپنی منزل کو جا رہی ہے

یا ملکۂ سمندر موجوں کے زمزموں میں!
تاروں کے دیوتا کو نغمے سنا رہی ہے

دیکھو! وہ کوئی جوگن جنگل میں گا رہی ہے !!

جنگل کے جانور کچھ بیٹھے ہیں اس کے آگے
رو رو کے جن کو اپنی بپتا سنا رہی ہے

خونخوار شیر بھی ہیں وحشی غزال بھی ہیں
لیکن وہ سب کے دل پر سکہ جما رہی ہے

کچھ سانپ جھومتے ہیں رہ رہ کے مست ہو کر
اک موج وجد آور اُن کو نچا رہی ہے

طاؤس ناچتا ہے یوں بیقرار ہو کر
گویا ہر ایک پر میں بجلی سما رہی ہے

غمگیں نوائیوں سے ایسا سماں بندھا ہے
رو رو کے جیسے فطرت طوفاں اٹھا رہی ہے

دیکھو! وہ کوئی جوگن جنگل میں گا رہی ہے !!

یہ موہنی بنی ہے کس کی لگن میں جوگن ؟
یہ سیل درد کس کے غم میں بہا رہی ہے ؟

ہاں شاید اِس کی ننھی معصوم آتما میں !
ہر کی پریم آگنی لوکے لگا رہی ہے !

ہر بن میں ہر نگر میں ہر گھر میں ہر ڈگر میں
پھر پھر کے اپنے دل کی چنتا مٹا رہی ہے !

یا ہر کی جستجو میں پیتم کی آرزو میں
کاشی سے آرہی ہے متھرا کو جا رہی ہے

یا جگ کی آفتوں سے تنگ آکے بن میں جا کر
پرماتما کو اپنا دکھڑا سنا رہی ہے !

دیکھو ! وہ کوئی جوگن جنگل میں گا رہی ہے !!

ہر لفظ میں چھپی ہے وحشت کی ایک دنیا
دل کی ہر آرزو کو مجنوں بنا رہی ہے

اک آگ سی بھری ہے غمگین راگنی میں
دیپک سنا سنا کر تن من جلا رہی ہے !

روحانیت کے نغمے منہ سے نکل رہے ہیں
ملک ابد کی جانب سب کو بلا رہی ہے

پردہ سا اُٹھ گیا ہے آنکھوں کے سامنے سے
کیا جانے کس جگہ کے جلوے دکھا رہی ہے ؟

کچھ سوز ہے بیاں میں کچھ درد داستاں میں
شعلے اُگل رہی ہے ! چھریاں چلا رہی ہے !!

دیکھو ! وہ کوئی جوگن جنگل میں گا رہی ہے !!

دنیا سے ہو رہی ہے بیزار میری ہستی
دل ہاتھہ سے چلا ہے جاں لب پہ آ رہی ہے

بتخانۂ جبیں میں سجدے مچل رہے ہیں
کافر ادا صنم ہے کافر بنا رہی ہے

معمور غمنوائی ہے ہر کلی کا دامن
فیاض مطربہ ہے نغمے لٹا رہی ہے

اک صوت سرمدی ہے ہر ذرہ کی زباں پر
موسیقی ازل کے نغمے سنا رہی ہے

ساری فضا پہ طاری ہے اک غبار ماتم
گویا تمام وادی آنسو بہا رہی ہے!

دیکھو! وہ کوئی جوگن جنگل میں گا رہی ہے!!

اب نغمے سو گئے ہیں باجا بھی تھک چلا ہے
محشر اُٹھا چکی ہے فتنے جگا رہی ہے!!

ایسی دبی صدا ہے گویا عروس نغمہ
منہ پھیر کر ہوا سے دامن چھڑا رہی ہے!

یا کچھہ غنودگی کے عالم میں مست کویل
دھرتی کی گوپیوں* کے دل گدگدا رہی ہے

کچھہ کھل گیا ہے جیسے بادل کوئی برس کر
یا شمع جل جلا کر اب جھلملا رہی ہے

لو! وہ ستار کو بھی نیند آگئی بغل میں
لو! وہ ستار اُٹھا کر جنگل سے جا رہی ہے!!

دیکھو! وہ کوئی جوگن جنگل سے جا رہی ہے!!

میں تو مگر کچھہ ایسا محسوس کر رہا ہوں
جیسے وہ ظالم ابتک ویسے ہی گا رہی ہے!

اب تک فضا پہ ہے وہ کھویا ہوا سا عالم!
اب تک اُفق پہ یکسر مستی سی چھا رہی ہے

اب تک اُٹھا رہا ہے - ساز اُس کا - ابر نغمہ
اب تک زبان اُس کی بجلی گرا رہی ہے!

پھولوں سے ابتک اس کے نغمے ٹپک رہے ہیں
پتوں سے ابتک اُس کی آواز آرہی ہے!

ابتک میں سر جھکائے حیرت زدہ کھڑا ہوں
"ابتک" وہی تجلی آنکھوں پہ چھا رہی ہے!

دیکھو! وہ کوئی جوگن جنگل میں گا رہی ہے!!!

وزن رباعی پر ایک نوت

از

(جناب محمد عظمت اللہ خان صاحب بی-اے)

سوال یہ ھے کہ رباعی کے لئے خاص وزن کیوں معین کیا گیا اور کیا ضرور ھے کہ رباعی لکھی جائے تو اُس وزن کی چوبیس قسموں میں سے ھی کسی ایک یا ایک سے زیادہ بحروں (قسموں) میں لکھی جائے ؟ جستجو کے بعد بھی اِس بات کا پتہ نہیں چلا کہ کیوں ایسا کیا گیا ؟

میرا خیال یہ ھے کہ ایسا کرنے کی وجہ یہ ھوی کہ جب رباعی وجود میں آئی تو شعرا نے محسوس کیا کہ اِس صنف میں چونکہ دو بیتیں ھیں ایک ھی مضمون اِس میں زیادہ عمدگی اور وضاحت سے بندہ سکتا ھے۔لیکن بعد کو تجربہ سے معلوم ھوا کہ قافیہ کی پابندی کے ساتھہ اگر رباعی کے چاروں مصرعوں میں ایک ھی وزن کی ایک ھی قسم یعنی ایک ھی بحر کی ھی پابندی کی جائے جیسی کہ غزل میں کی جاتی ھے اور وزن کی یکسانی کے ساتھہ اُسی وزن کی مختلف بحروں کو ایک ھی رباعی میں جایز نہ رکھا جائے تو یہ لطیف اور کار آمد صنف سخن "رباعی" ٹیڑھی کھیر ھو جائے گی۔ مثلاً ایک غزل کے لئے مفاعیلن چار بار والی بحر کو ایک شاعر نے انتخاب کیا ھے تو اب شاعر مجبور ھے کہ اِس غزل کے ھر مصرع کی تقطیع مفاعیلن چار بار کے مطابق ھو۔اِسی طرح اگر رباعی صرف اس ایک ذیل کی بحر میں لکھی جائے—

مفعول مفاعیل مفاعیل فعل

اور هرمصرع کی تقطیع اسی طرح هوتو ظاهر هے که رباعی کا لکھنا بہت دشوار هوجاتا - لہذا فطرتاً شعراکو اِس امرپر غورکرناپڑا که رباعی کے وزن میں سہولت اور وسعت پیدا کی جائے - غوروفکر کے بعد اِس حقیقت کا کھلنا دشوار نه تها که

مفعول و مفاعیل و مفاعیل و فعل

اور مفعول و مفاعیلن مفاعیلن فع کا وزن ایک هي هے - همارے عروضیون نے پہلے تو یه فرض کیا که یه بحریں 'هزج' کی زحافی بحریں هیں اور زحافات کے عجیب وغریب خیالی هتهکھنڈوں سے اِس بات کے ثابت کرنے کی کوشش کی که مذکورۂ بالا دونوں بحریں دراصل هزج کی زحافی نیرنگیوں - کتربیونت اور کاٹ چھانٹ کا کرشمه هے —

عروضیوں نے اِس رخ پرجب اور زور لگایاتو یه اصول قرار دیاکه رباعی کی بحروں کے ایک چکر کا تومفعول اور دوسرے کا مفعولن مرکز هے - یه کچھه سمجهه میں نہیں آتا که همارے عروضیوں کو دایرے کیوں اسقدر پسند تھے بہرحال رباعی کے هر مرکز کے گرد بارہ بارہ بحریں ترتیب دیکر دو شجرے غیر محبق اور محبق قرار دئے - اس طرح رباعی کی چوبیس بحریں نکالیں اور اُن سب کو بلحاظ وزن یکساں مان لیا گیا - چنانچه ایک هی رباعی میں ان چوبیس بحروں میں سے چار مختلف بحروں میں چار مصرعے لکھے جائیں تووزن نہیں بدلتا - مثلاً ایک رباعی کے چار مصرعے ذیل کی بحروں میں هیں: —

(۱) مفعول مفاعیل مفاعیل فعل

(۲) مفعول مفاعیلن مفعولن فع

(۳) مفعولن فاعلن مفاعیل فعل

(۴) مفعولن فاعلن مفاعیلن فع

یه رباعی بلحاظ وزن صحیح سمجھی جائیگی حالانکه اس کے هر مصرع میں لگھه اور گرو کی ترتیب بالکل جداگانه هے - اس کے لگھه اور گرو کا تجزیه

یہ ہے :—

(۱) — — ۷ | ۷ — — ۷ | ۷ — — ۷ | ۷ —

(۲) — — ۷ | ۷ — — — | — — — | —

(۳) — — — | — ۷ — | ۷ — — ۷ | ۷ —

(۴) — — — | — ۷ — | ۷ — — — | —

اب اگر رباعی کے وزن اور اس کی چوبیس بحروں پر هندی عروض کے ماترک طریقے کے لحاظ سے نظر ڈالی جائے تو رباعی کی اِن چوبیس بحروں کا هم وزن هونا فطرتاً ثابت هوجاتا هے اور زحافات کی کاٹ چھانٹ اور کتربینوت کی بے اصول قینچی کی ضرورت نہیں پڑتی اور پھر لطف یہ هے کہ بجائے چوبیس بحروں کے رباعی کی بحروں کی تعداد دس هزار نو سو چھیالیس تک پہونچ جاتی هے۔ اِس تعداد سے شعرا کو گھبرانا نہیں چاهئے اِس لئے کہ وزن رباعی کی اِن بحروں کی فہرست تیار کرنی ضروری نہیں۔ماترک اصول سے صرف شاعر کو یہ دیکھھ لینا هوگا کہ هر مصرع میں بیس ماترائیں هیں یا نہیں۔اگر بیس ماترائیں هوں تو پھر شاعر کو اِس کے جھمیلے میں پڑنے کی حاجت نہیں کہ لگھھ اور گرو کی ترتیب کیا هے۔اوپر مثالاً چار مختلف بحریں دی گئی هیں اور اِن کا لگھھ اور گرو میں تجزیہ بھی کردیا گیا هے۔ان مصرعوں کی ماترک قیمت ذیل میں درج کی جاتی هے۔واضح رهے کہ هر لگھھ ایک ماترا اور هر گرو دو ماترا کے مساوی لیا جاتا هے:—

(۱) — — ۷ | ۷ — — ۷ | ۷ — — ۷ | ۷ —

۲ ۲ ۱ | ۱ ۲ ۲ ۱ | ۱ ۲ ۲ ۱ | ۱ ۲ = ۲۰

(۲) — — ۷ | ۷ — — — | — — — | —

۲ ۲ ۱ | ۱ ۲ ۲ ۲ | ۲ ۲ ۲ | ۲ = ۲۰

اس طرح رباعی کا وزن بیس ماترا کا ھے۔ البتہ اتنا یاد رھے کہ رباعی کی بعض بحروں کے آخر میں ایک ماترا زیادہ بھی آسکتی ھے جس کو ساقط سمجھا جائے گا۔ مثلاً—

مفعول مفاعیل مفاعیل فعل

کے بجائے مفعول مفاعل مفاعل فعول بھی آسکتا ھے فعول میں فعل سے ایک ماترا زیادہ ھے اس کو نظر انداز کردیا جاتا ھے—

ھمارے عروضیوں اور شعرا کا منشا یہی تھا کہ رباعی—جس کو ابتداء ترانہ کہتے تھے—کے وزن میں سہولت اور وسعت پیدا کی جائے۔ صحیح اصول تو اُن کے ھاتھ نہ لگا لیکن اتنا فائدہ ضرور ھوا کہ اس وزن کی چوبیس بحریں قرار پاگئیں اور صنف رباعی ایران اور ھندستان میں مقبول عام رھی—

اول تو اِس کی کوئی معقول وجہ ھی نہیں ھے کہ رباعی کے لئے کوئی خاص وزن لازمی گردانا جائے دوسرے یہ بھی ضروری نہیں کہ ایک شاعر کی رباعیاں بلحاظ معنے ایک دوسرے سے کوئی لگاؤ اور تسلسل نہ رکھیں۔ میرے خیال میں شاعر آزاد ھے کہ جون سی بحر میں چاھے رباعی لکھے اور یہ کہ رباعی کو ایک قسم کا بند تصور کرے اور اس قسم کے رباعی نما بندوں میں ایک نظم کی نظم لکھے۔ ھماری عروض کی تنگ چشمی اور بےاصول قیدوں نے ھماری شاعری کو ایک غیر فطری سانچے میں ڈھال سا دیا ھے اور عروضی اصولوں کی فطرتی مطابقت اور لچک اردو شاعری میں نئی زمین اور نیا آسمان

پیدا کردیگی —

رباعی کی موجودہ مسلمہ چوبیس بحروں میں سے بعض تو دلکش ھیں لیکن بعض نہایت بھونڈی ھیں اور عموماً اچھے رباعی گو اِن بھونڈی کرخت بحروں سے پرھیزکرتے ھیں-ماترک طریقہ سے رباعی کے بیس ماترا والے چھند (وزن) کے کثیرالتعداد بھیدوں پر نظر ڈالی جائے تو ان میں سیکڑوں سریلی قسمیں دستیاب ھوسکتی ھیں-مثال کے طور پر ایک بنگالی "لی رک" کا مصرع ھے: —

پھول پھٹارے پھول پھٹارے دریا

اس مصرع میں بیس ماترائیں ھیں اور دراصل اس میں اور رباعی کے وزن میں کوئی فرق نہیں ھے-لیکن ھماری عروض میں چونکہ یہ بات پہلے طے پاگئی ھے کہ رباعی کے وزن کی چوبیس قسمیں مفعول یا مفعولن سے ھی شروع ھونی چاھئیں اس لئے یہ بنگالی گیت کا مصرع ھمارے عروضیوں کے نزدیک رباعی کے وزن پر نہ ھوگا —

اس نوٹ کا منشا صرف یہی ھے کہ اس بات پر زور دیا جائے کہ یاتو رباعی کے لئے سرے سے کوئی خاص وزن مخصوص ھی نہ کیا جائے یا ماترک اُصول کے لحاظ سے یہ تسلیم کرلیا جائے کہ بیس ماترا والے وزن کی جتنی قسمیں (بھید) ھیں اُن سبھوں میں رباعی لکھی جاسکتی ھے-اِس سے ایک طرف تو یہ فایدہ ھوگا کہ رباعی کے وزن کی مختلف بحروں کا اَصلی فطری اُصول واضح ھوجائے گا اور دوسری طرف بجاے چوبیس بحروں کے دس ھزار سے اوپر بحریں ھاتھہ آجائیں گی-جن سے صنف رباعی کا سریلا پن اور وسعت بہت زیادہ ھو جائے گی —

یہ واضح کردینا ضروری ھے کہ شاعر کو بیس ماتراوالے وزن (چھند) کی دس ھزار نو سو چھیالیس قسموں کی فہرست تیار کرنا لازمی نہیں ھے-شاعر کو صرف یہ دیکھہ لینا کافی ھے کہ رباعی کا ھر مصرع بیس ماترا کا ھے

یا نہیں۔اب رہا یہ سوال کہ شاعر نے اپنی رباعی کے مصرعوں میں لکھہ اور گرو کی ترتیب یعنے دوسرے الفاظ میں اِس وزن (چھند) کی جو جو قسمیں (بحریں) اِختیار کی ہیں وہ سریلی ہیں یا نہیں۔اِس کا تصفیہ شاعر کا کان ہی کرسکتا ہے۔ اگر اُس کی پسند کی ہوئی بحریں بلحاظ ترنم دلکش نہ ہونگی تو اُس کی رباعی مقبول نہ ہوگی اور اِس ڈر کے مارے ہر شاعر اِس بات کی کوشش کریگا کہ جہانتک ممکن ہو بیس ماترا والے وزن کی سریلی قسمیں اِختیار کرے—

خاتمہ پر بعض جویا طبایع کے لئے یہ بیان کرنا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ کسی چھند (وزن) کی قسموں (بھیدوں) کو کس طرح دریافت کیا جاتا ہے۔ ذیل میں ایک جدول دی گئی ہے۔اِس کو مطالعہ کرنے سے یہ طریقہ فوراً سمجھہ میں آجائے گا—

ماترا کی تعداد	۱	۲	۳	۴	۵	۶	۷	۸	۹	۱۰
بھیدوں کی تعداد	۱	۲	۳	۵	۸	۱۳	۲۱	۳۴	۵۵	۸۹

اوپر کے خانوں میں جو عدد ہیں اُن سے یہ مقصد ہے کہ چھند کی ماتراوں کی تعداد اِتنی ہے۔نیچے کے خانوں میں جو ہندسے ہیں اُن میں سے اوپر کے خانے والے چھند کے بھید (قسمیں) معلوم ہوتی ہیں مثلاً اوپر کے خانے میں چار کا ہندسہ ہے اِس کے یہ معنے ہوئے کہ چار ماترا والا چھند ہے تو اُس کے نیچے کے خانے میں پانچ عدد اِس چار ماترا والے چھند کی قسمیں بتاتا ہے۔اچھا اب پانچ ماترا والے چھند کی ہمیں قسمیں معلوم کرنی ہیں۔تو چار ماترا والے چھند کے نیچے جو پانچ کا عدد ہے اُس کو تین ماترا والے چھند کے نیچے والے تین کے عدد کو جوڑ لیں گے تو (۵ + ۳ = ۸) قسمیں پانچ ماترا والے چھند کی ہونگی۔اِس طرح آپ بیس ماترا والے چھند تک اگر سوچی یعنے ایسی جدول بنالیں جو اوپر دی گئی ہے تو آپ کو معلوم ہوجائے گا کہ بیس ماترک چھند کی دس ہزار نوسو چھیالیس

قسمیں ھوتی ھیں-یہاں محض سہولت کی غرض سے صرف دس ماترا والے چھند تک ھی سوچی نمونتاً دیدی گئی ھے—

ایک دفعہ میں اس بات کو پھر ذھن نشین کرا دینا چاھتا ھوں کہ شاعر کے لئے صرف یہ دیکھہ لینا کافی ھے کہ اُس کا مصرع بیس ماترا یا جتنی ماترا کے چھند میں وہ شعر کہنا چاھتا ھے اتنی ماترا کا ھے یا نہیں-اِن حسابی جھمیلوں میں پڑنے کی ضرورت ھی نہیں-سریلے پن کے متعلق خود شاعر کے کان سے بہتر ترازو ھو ھی نہیں سکتی—

عروض جدید

از

(جناب عبدالرحمن خان صاحب اسسٹنٹ امپیریل اکانومک بوٹینسٹ - پوسا)

دنیا کی قوموں کو میدان ترقی میں دوڑتے ہوئے دیکھہ کر ہمارے آفسردہ و پژمردہ دلوں میں بھی قدم اُٹھانے کی اُمنگ پیدا ہوگئی ہے- پس و پیش واطراف و جوانب سے بڑھو بڑھو اور دوڑو دوڑو کی صدائیں آرہی ہیں-قوت رفتار جس قدر بھی باقی رہ گئی ہے دستگیری کے لئے آمادہ ہے مگر مشکل یہ ہے کہ "کس ندانست کہ منزل گہ مقصود کجاست"- جتنے منہ اُتنی ہی باتیں ہیں-کوئی مشرق کی طرف راستہ بتاتا ہے کوئی مغرب کی طرف-ایک جنوب کی سمت گھسیٹتا ہے تو دُوسرا شمال کی جانب- حیران ہیں کہ کس طرف جائیں-کس طرف نہ جائیں- تنزل کا یہ عالم ہے کہ ہماری ہستی ہی مجسم پستی بن گئی ہے- اور اِس کا احساس اِسقدر غالب ہے کہ اپنی خوبیاں تک عیوب نظر آتی ہیں،یورپی ترقی کی برق مثال شعاعوں نے آنکھوں میں کچھہ ایسی چکا چوند پیدا کردی ہے کہ اب وُہ بصارت کی شرمندۂ احسان نہیں رہیں-ایسی نازک حالت میں ہمارا فرض ہے کہ قدم بڑھانے سے پہلے اچھی طرح تحقیق کر لیں کہ کعبۂ ترقی کے لئے جو راستہ ہم تجویز کرتے ہیں وہ ترکستان تنزل کی راہ تو نہیں ہے—

دنیاوی چیزوں میں کوئی چیز بھی ایسی نہیں جو بالکل بے عیب ہو یا اُس میں ترقی کی مطلق گنجائش نہ ہو-اردو علم عروض اِس کلیہ سے کس طرح

مستثنیٰ ہوسکتا تھا۔خوشی کی بات یہ ہے کہ بہی خواہان اُردو کا رجحان اِس کی اصلاح کی طرف بھی مائل ہوا ہے۔اس وقت جناب حکیم سید الطاف حسین صاحب کاظم کا رسالۂ گُلزار عروض اور جناب محمد عظمت اللہ خاں صاحب بی۔اے کے دو مضمون جو رسالہ اُردو سنہ ۱۹۲۴ع کے جنوری اور اپریل نمبروں میں چھپے ہیں ہمارے پیش نظر ہیں۔ہم نے بھی ایک رسالہ عروض جدید کے نام سے لکھا ہے جو عرصہ سے چھپنے کے لئے تیار ہے۔اس مضمون کا منشاء یہ ہے کہ اصلاح کے مختلف مجوزہ طریقوں کا مقابلہ کیا جائے تاکہ نکتہ رسان علم عروض و کارپردازان قسمت اُردو کو ان کے حسن و قبح پر غور و خوض کرنے کا موقع ملے۔نیز ہم اپنے رسالہ کے شایع ہونے سے پہلے ماہران فن کے مفید مشوروں سے بہرہ اندوز ہو سکیں۔علم عروض کے مختلف شعبہ ہیں جن میں سے تجزیہ۔تقطیع انفکاک بحور۔تقسیم بحور و تسمیہ بحور زیادہ اہم ہیں اور موجودہ مضمون میں انہی سے بحث کی جائے گی۔دکھانا یہ ہے کہ اِن مختلف شعبوں کے متلعق ہمارے ہاں کیا موجود ہے۔اِس میں کیا نقص ہیں اُن کی اصلاح کیونکر ہو سکتی ہے اور ہندی اور انگریزی زبانیں جن سے ہم بہ آسانی مدد لے سکتے ہیں کہاں تک ہماری دستگیری اور رہبری کرتی ہیں—

تجزیۂ بحور

بحر آواز کی ایک مسلسل زنجیر ہے جو چھوٹی چھوٹی کڑیوں سے مل کر بنی ہے۔ہر کڑی کا نام حرف ہے لیکن کہیں تو یہ کڑیاں ایک دوسرے سے ایسی پیوستہ ہیں کہ ان کا جدا کرنا مشکل ہے اور کہیں ان کا جوڑ ایسا ڈھیلا ہے کہ اُنہیں بآسانی علیحدہ کیا جاسکتا ہے۔اِن آسانی سے علیحدہ ہو جانے والے ٹکڑوں کو اجزائے اولیہ یا سلیبل (Syllable) کہتے ہیں۔زبان اُردو پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اِس میں تین قسم کے اجزائے اولیہ ہو سکتے ہیں—

(ا) یک حرفی- جس میں ایک حرف متحرک هو جیسے قلم میں ق- هندی میں اِسے لکهه کہتے هیں- اُردو عروض میں اِس کے لئے کوئی نام نہیں- عروض جدید میں اِس کا نام صغریٰ هے—

(ب) دو حرفی- جس میں پہلا حرف متحرک هو جیسے حق- اِس لفظ میں دونوں حرفوں کی آواز ایسی ملی هوئی هے که حائے مفتوح کی آواز نکالے بغیر قاف ساکن کی آواز کا نکالنا مشکل هے- هندی میں اسے گُر اور اُردو میں سبب خفیف کہتے هیں —

(ج) سه حرفی- جس میں پہلا حرف متحرک- دوسرا ساکن اور تیسرا موقوف هو- جیسے یار- اس جگه تینوں حرفوں کی آوازیں ایسی پیوسته هیں که انہیں جدا جدا ظاهر نہیں کیا جا سکتا- هندی میں اِس کے لئے کوئی نام نہیں- اُردو میں اِسے سبب متوسط کہتے هیں- مذکورهٔ بالا اجزائے اولیه کی ترکیب سے مرکب اجزا بنتے هیں- اُردو زبان کے بعض اهل عروض نے اجزا کی تعداد نو تک بڑها دی هے لیکن اِن میں سے مفصلهٔ ذیل چار ایسے هیں جو تجزیه کے لئے ضروری هیں—

(۱) سبب خفیف (فع)
(۲) سبب متوسط (فاع)
} یه دونوں اجزائے اولیه هیں جن کا ذکر هوچکا هے

(۳) سبب ثقیل (ت ع) ایسا دو حرفی جز جس میں دونوں حرف متحرک هوں- یه دو صغریٰ یا دو لکهه کا مرکب هے- هندی میں اسے سپری کہتے هیں—

(۴) وتد مجموع (فعل) ایسا سه حرفی جز جس میں پہلے دو حرف متحرک اور آخری ساکن هو- یه ایک صغریٰ اور ایک سبب خفیف کا مرکب هے اسے هندی میں تومر کہتے هیں- جو ایک لکهه اور ایک گرو سے مل کر بنا هے—

اُردو عروضیوں نے ان چاروں جزوں کا شمار اجزائے اولیه میں کیا هے- کیونکه انہوں نے صغریٰ یا لکهه کو علیحده جز نہیں سمجها- یه ایک غلطی یا بهول تهی تاهم مذکورهٔ بالا چاروں جزوں سے تجزیه کا مقصد بخوبی پورا هو جاتا هے-

تجزیہ میں نہ تو زحافات کا جھگڑا ہے نہ کسی اور قسم کی دقت۔ ہر بحر کا تجزیہ نہایت آسانی کے ساتھہ کیا جا سکتا ہے۔ لیکن چونکہ تقطیع تجزیہ سے بہتر تھی اس لئے اہل عروض نے تجزیہ کو صرف ارکان تقطیع کے جوڑ بند سمجھانے تک محدود رکھا —

ہندی میں اگرچہ اجزا کی تعداد تیرہ ہے لیکن اجزائے اولیہ صرف دو ہی ہیں جنہیں لکھہ اور گُر کہتے ہیں۔ اِن کا ذکر پہلے ہی آچکا ہے۔ سہ حرفی جز رکھنے کی اہل ہند کو ضرورت ہی نہ تھی کیونکہ برج بھاشا میں لفظ کا آخری حرف موقوف ہونے کی بجائے متحرک ہوتا ہے پس ہندی اجزائے اولیہ سے اُردو زبان کے موقوف الآخر الفاظ کا تجزیہ صحیح طور پر نہیں ہو سکتا۔ لیکن اگر موقوف حرف کو متحرک مان لیں یا حذف کر دیں تو تقطیع ہو سکتی ہے —

مثلاً ع – " تم آل نبی اولاد علی سلطان الہند غریب نواز " کا تجزیہ دونوں زبانوں میں اِس طرح ہوگا —

	تم	آ	ل ن	بی	اُو	لا	د ع	لی
اُردو	خفیف سبب	خفیف سبب	ثقیل سبب	خفیف سبب	خفیف سبب	خفیف سبب	ثقیل سبب	خفیف سبب
ہندی	گُر	گُر	لکھہ لکھہ	گُر	گُر	گُر	لکھہ لکھہ	گُر

	سل	طا	نل	ھن	د غ	ر ی	ب ن	وا ز
اُردو	خفیف سبب	خفیف سبب	خفیف سبب	خفیف سبب	ثقیل سبب	خفیف سبب	ثقیل سبب	متوسط سبب
ہندی	گُر	گُر	گُر	گُر	لکھہ لکھہ	گُر	لکھہ لکھہ	گُر لکھہ

مذکورۂ بالا بیان سے ظاہر ہے کہ ہندی اور اُردو دونوں زبانوں میں تجزیہ کا اصول ایک ہی ہے یعنی ہر ملفوظ حرف شمار ہوتا ہے-صرف اصطلاحی فرق ہے-علاوہ ازیں اُردو میں یہ نقص ہے کہ اِس میں تجزیہ کے لئے اجزائے اولیہ استعمال نہیں کئے گئے-کیونکہ اِس میں لگھو کا قائم مقام کوئی جز نہ تھا-ہندی میں یہ کمی ہے کہ اِس میں سبب متوسط کے مقابل کوئی سلیبل نہیں-ہم نے اپنی کتاب عروض جدید میں اِس کی اصلاح اس طرح کی ہے کہ مرکب اجزا سبب ثقیل و وتد مجموع کو چھوڑ کر ایک جز لگھو کا قائم مقام زیادہ کر دیا ہے-اِس طرح صرف تین اجزائے اولیہ سے تمام بحور کا تجزیہ ہو جاتا ہے-ہندی میں گُر اور لگھو کے واسطے علامات بھی مقرر ہیں-لیکن اُردو زبان میں صرف نام استعمال کئے جاتے ہیں-ہم نے ارکان تقطیع کی طرح اجزائے اولیہ کے لئے بھی الفاظ مقرر کر دئے ہیں جس سے تجزیہ کے ڈانڈے تقطیع سے جا ملے ہیں-وہ الفاظ یہ ہیں —

(۱) لگھو یا صغریٰ-اس کے واسطے لفظ "نہ" استعمال کیا جاتا ہے جو حرف "ن" کا قائم مقام ہے اور ہائے مختفی ذریعہ اظہار حرکت ہے-تاہم مبتدیوں کی آسانی کے لئے تجزیہ کرتے وقت صرف "ن" لکھا جا سکتا ہے —

(۲) گُر یا سبب خفیف یا کُبریٰ-اس کے لئے لفظ "مل" استعمال کیا جاتا ہے جس میں میم مکسور اور لام ساکن ہے —

(۳) سبب متوسط یا جز اکبر-اس کے لئے لفظ "یار" استعمال کیا جاتا ہے جس میں پہلا حرف متحرک دوسرا ساکن اور تیسرا موقوف ہے —

مذکورۂ بالا تین لفظوں (نہ-مل-یار) سے دنیا بھر کے الفاظ و بحور کا تجزیہ یا تقطیع ہو سکتی ہے-ہم نے اِن کے بجائے ت-فع اور فاع اس لئے نہیں رکھے کہ مبتدی عین کا تلفظ صحیح طور سے ادا نہ کرسکیں گے تو صحیح تجزیہ سمجھنے میں اکثر دھوکا ہوا کرے گا —

جناب عظمت صاحب نے اگرچہ تجزیہ کا بیان علیحدہ نہیں کیا لیکن اُن کے هاں یک جزی ارکان سے جو تقطیع کی جاتی ہے وہ تجزیہ کا قائم مقام سمجھی جاسکتی ہے۔اِس تقطیع میں اُنہوں نے بہ تقلید هندی صرف دو جزوں هی پر اکتفا کی ہے۔اپنے مضمون میں اُنہوں نے ایک جگہ تحریر فرمایا ہے کہ " جز کے وهی معنی هوں گے جو انگریزی میں سلیبل کے هیں " لیکن هماری سمجھ میں نہیں آیا کہ اُنہوں نے کس قاعدے سے سبب متوسط (یار) میں دو سلیبل سمجھ لئے۔ شاید اِس خیال سے ایسا کیا هو کہ جب درمیان مصرع حرف موقوف کو متحرک مان لیا جاتا ہے تو آخر مصرع بھی موقوف مان سکتے هیں۔لیکن یہ اِستدلال صحیح نہیں۔کیونکہ مصرع کے بیچ میں موقوف حرف کے مقابل متحرک حرف کا لانا جائز ہے اِس لئے تقطیع میں مشابہت قائم رکھنے کے لئے موقوف کو متحرک ماننے میں کوئی هرج نہ تھا—

جیسے " شراب ناب کجا و من خراب کجا۔ ببیں تفاوت رہ از کجاست تا بہ کجا " - کے پہلے مصرع میں ناب اور خراب کے آخری حروف موقوف هیں لیکن دوسرے مصرع میں اِن کے مقابل تفاوت کا واو اور بہ کی ب متحرک حروف آئے هیں۔اِس لئے تقطیع میں یہ حروف بھی متحرک مان لئے گئے۔لیکن اُردو فارسی میں مصرع کے آخر حرف متحرک کبھی نہیں آتا۔پس خلاف واقعہ بات کو تسلیم کرنا درست نہیں۔علاوہ ازیں تجزیہ نظم هی کے ساتھ مخصوص نہیں۔هر لفظ کا خواہ وہ نثر کا جز هو یا نظم کا جدا جدا تجزیہ کیا جا سکتا ہے۔بلکہ بعض اوقات نثر میں بھی تجزیہ کرنا پڑتا ہے جہاں موقوف کو متحرک ماننا بالاتفاق غلط ہے۔ پس ایسی حالت میں سبب متوسط کو جو اُردو عروض میں بجا اور درست طور پر موجود تھا چھوڑ دینا مناسب نہیں معلوم هوتا—

جناب کاظم صاحب نے گلزار عروض میں اپنی تقطیع کے لئے پانچ لفظ گل۔ صبا۔چمنی۔فصل۔بہار۔مقرر کئے هیں اور اُنہیں کلام کے اجزائے اولہ سے تعبیر کیا

هے - اِس لئے اُن کی تقطیع کا ذکر بھی اِسی جگہ آنا چاهئے - اُن کی کتاب کی خوبی کا دارو مدار دو دعووں پر هے - ایک تو یہ کہ اُنہوں نے تقطیع کرنے میں اجزائے اولیہ اور چھوٹے سے چھوٹے الفاظ استعمال کئے هیں - دوسرے یہ کہ تمام بحور کی تقطیع خواہ اب موجود هوں یا آیندہ کسی زمانہ میں پیدا هوں اُن کے مقرر کئے هوئے ارکان سے هوسکتی هے - لیکن افسوس هے کہ یہ دونوں دعوے غلط هیں - پہلے دعوے میں تو اُنہوں نے وهی غلطی کھائی جو اُردو کے عام عروضیوں نے کھائی تھی - چنانچہ گلزار عروض کے صفحہ ۴ پر وہ تحریر فرماتے هیں " اُردو میں چھوٹے سے چھوٹا لفظ دو حرف کا هی هوسکتا هے اور اُس کا پہلا حرف همیشہ متحرک اور دوسرا ساکن هوتا هے " اس غلطی کا نتیجہ یہ هوا کہ وہ کوئی لفظ ایسا نہ سوچ سکے جو لکھہ کا قائم مقام هوتا - حالانکہ عربی - فارسی اور اُردو تینوں زبانوں میں واو عطف ایک ایسا لفظ هے جو ایک حرف سے بنا هے اور نہ - کہ - چہ وغیرہ بہت سے ایسے الفاظ اُردو فارسی میں موجود هیں جن میں هائے مختفی محض اظہار حرکت سے لئے آتی هے اور وہ بخوبی لکھہ کا قائم مقام هوسکتے هیں - دوسرا دعویٰ اِس لئے غلط هے کہ گل اور صبا کے مسبغ الفاظ فصل و بہار تو اُن کے هاں موجود هیں - لیکن چھنی کا مسبغ کوئی نہیں - اِس لئے جہاں کہیں بھی مصرع کے آخر فعلات کا وزن آئے گا اُن کے الفاظ تقطیع کے لئے کافی نہ هونگے - جیسا کہ مثال ذیل سے ظاهر هے - ع تم آل نبی اولاد علی سلطان الہند غریب نواز —

تجزیه	تم	آ	ل	ن	بی	او	لا	د	ع	لی
عروض جدید	مل	مل	نه	نه	مل	مل	مل	نه	نه	مل
جناب کاظم صاحب	گُل	گُل	چھنی			گُل	گُل	چھنی		
جناب عظمت صاحب	فع	فع	ت	ت	فع	فع	فع	ت	ت	فع

تجزیه	سل	طا	نل	هن	د	غ	ری	پ	ن	واز
عروض جدید	مل	مل	مل	مل	نه	نه	مل	نه	نه	یار
جناب کاظم صاحب	گل	گل	گل	گل	چھنی					
جناب عظمت صاحب	فع	فع	فع	فع	ت	ت	فع	ت	ت	فع ت

مذکورۂ بالا مثال سے ظاہر ہے کہ جناب کاظم صاحب کے مجوزہ پانچ لفظ بھی تمام بحور کی تقطیع یا تجزیہ کے لئے کافی نہیں ہیں حالانکہ عروض جدید کے مطابق صرف تین لفظوں (نہ مل یار) سے یہ مقصد بوجہ اتم پورا ہوجاتا ہے —

تقطیع بحور

تقطیع سے الفاظ کا ایسا مجموعہ مراد ہے جو حروف گوناگوں کی بھول بھلیاں اور ناقص رسم خط کی فریب دہی سے آزاد ہوکر خود بحر کو ایسی سادہ صورت میں پیش کرے جو اشعار کے جانچنے کے لئے کسوتی کا کام دے سکے۔ تجزیہ بحر کے اجزا کا خیال ضرور پیدا کرتا ہے لیکن جس طرح چاول۔گوشت۔ گھی۔نمک وغیرہ کہہ دینے سے کام و زبان پلاؤ کے ذائقہ سے متلذذ نہیں ہوسکتے اس طرح لکھہ گر گر جپنے یا سبب خفیف و سبب ثقیل کے رٹنے سے وہ ترنم پیدا نہیں ہوسکتا جو بحر کا جز لاینفک ہے —

تقطیع اجزائے بحر کا خیال پیدا کرنے کے علاوہ بحر کا ترنم بھی اُسی طرح پیدا کردیتی ہے جس طرح گویے سا۔رے۔گا۔ما۔پا وغیرہ مقررہ الفاظ سے راگنی پیدا کرلیتے ہیں۔ارکان تقطیع کے قائم مقام ہندی اور انگریزی میں بھی ہیں لیکن چونکہ وہ علامات یا ناموں سے ظاہر کئے جاتے ہیں اِس لئے ترنم سے بے بہرہ ہیں۔وہ بحر کی تقطیع نہیں کرتے بلکہ ایک طرح کا تجزیۂ مرکب کرتے ہیں۔ ارکان اردو حروف علامات نہیں ہیں بلکہ یہ وہ در شہوار ہیں جو مجسم بحر ہیں اور جن سے ہندی اور انگریزی دونوں زبانوں کے دامن خالی ہیں۔ہمارا طریق

تجزیہ اور جناب عظمت صاحب کی یک جزئی تقطیع دراصل تجزیہ اور تقطیع دونوں کہلائے جانے کے مستحق ہیں لیکن وزن کرنے کے لئے اُن کے بات اِس قدر چھوٹے ہیں کہ مبتدی کے ہاتھ سے رشتۂ ترنم کے چھوٹ جانے کا اندیشہ ہے۔ ظاہر ہے کہ گراں وزن چیزوں کے تولنے کے لئے بات بڑے ہونگے تو آسانی ہوگی۔ نصف من کو تولوں اور ماشوں میں بھی تول سکتے ہیں لیکن سیروں سے تولنے میں زیادہ آسانی ہے۔ اِسی خیال سے اور چند اور وجوہات سے جن کا بیان اِس جگہ غیر ضروری ہے اہل عروض نے ارکان اصلی حتی المقدور بڑے مقرر کئے تھے۔ لیکن چونکہ وہ ہر قسم کی بحروں کی تقطیع کے لئے کافی نہ تھے اِس لئے مزید ارکان زحافات کے ذریعہ بنائے گئے۔ زحافات کا طریقہ خود ہی بہت پیچیدہ تھا۔ تقسیم و جماعت بندی کا مشکل مسئلہ بھی اِسی کے ساتھ وابستہ کردیا گیا جس سے ارکان کی تعداد بڑھتے بڑھتے اکتالیس تک پہنچ گئی۔ اور تقطیع حقیقی و غیر حقیقی کا جھگڑا کھڑا ہوگیا۔ اُردو عروض پر جو کچھ اِعتراض ہیں وہ زیادہ تر اِسی حصہ کی وجہ سے ہیں باقی سب اُس کی فروعات ہیں۔ ہندی عروض میں اگرچہ زحافات کا جھگڑا نہیں ہے۔ تاہم ارکان کی تعداد ۳۹ تک پہنچتی ہے۔ جنمیں سے اکثر غیر ضروری ہیں۔ علاوہ ازیں بعض ارکان کو دو مختلف طریقوں سے پیدا کیا مثلاً مفعولن۔ ماترک طریقہ سے جس میں تعداد حروف کا خیال رکھا جاتا ہے چھہ ماترا کے پرستار سے پیدا ہوتا ہے اور ورنک طریقہ سے جس میں تعداد اجزا مدنظر ہوتی ہے تین ورن کے پرستار سے بنتا ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ ہر رکن دونوں طریقوں سے حاصل ہوسکتا ہے۔ اور بحیثیت رکن ماترک اور ورنک تفریق بالکل فضول ہے۔ اہل ہند نے ماترک طریقہ سے جو ۳۱ رکن بنائے تھے وہی ماترک اور ورنک دونو قسم کے اشعار کے لئے کافی سے بھی زیادہ تھے۔ مگر اُنھوں نے آٹھہ ارکان ورنک طریقہ سے بھی نکالے اور محض اوہام پرستی کی بنا پر اُن کے ساتھہ سعد و نحس کی چند فرضی خصوصیات مان کر ورنک شاعری کے ساتھہ

مخصوص کردیا۔حاصل کلام یہ ھے کہ ھندی ارکان پیچیدگی اور تعداد کے لحاظ سے اُردو ارکان کی نسبت کسی طرح بہتر نہیں۔ھندی کے ساتھہ ھی یہ بھی دیکھہ لینا چاھئے کہ انگریزی سے ھم کہاں تک فائدہ اُٹھا سکتے ھیں۔یہ بیان کیا جاچکا ھے کہ ھندی اور اُردو میں وزن کرنے کا طریقہ اُصولاً ایک ھے۔دونو زبانوں میں وزن کی اِکائی حرف ھے اور ھر ملفوظ حرف تقطیع یا تجزیہ میں شمار ھوتا ھے۔ لیکن انگریزی زبان میں حروف کی بجائے اجزائے اولیہ یعنی سلیبل کو اِکائی سمجھا گیا ھے اور لطف یہ ھے کہ سلیبل میں خواہ ایک حرف ھو یا زیادہ سب کا وزن یکساں سمجھاجاتا ھے۔علاوہ ازیں اھل انگریزی حرکات مرکبہ سے ھمزہ کو جدا نہ کرسکے اِس لئے بسا اوقات جس لفظ کو ھم دو جزوں سے بنا ھوا خیال کرتے ھیں انگریزی زبان والے اُس میں صرف ایک ھی سلیبل مانتے ھیں۔ مثلاً لائک (Like) میں ھمارے ھاں لازمی طور پر دو سلیبل مانے جائیں گے مگر انگریزی داں اِس میں ایک ھی سلیبل بتائیں گے۔پھر بعض ساکن حروف انگریزی الفاظ کے شروع میں ایسے واقع ھوتے ھیں جس کے مقابل اُردو میں ھمیشہ متحرک حرف ھوتا ھے۔جس کا نتیجہ یہ ھے کہ ھمارے حساب سے مختلف اجزا میں حروف کی تعداد ایک سے چھہ تک ھوجاتی ھے اور غضب یہ ھے کہ یہ سب ھموزن سمجھے جاتے ھیں۔مثلاً—

ل — لا — لاز — کلاس — فلائی — فلائٹس — سب میں ایک ایک سلیبل ھے اور اِن سب کا وزن یکساں ھے۔البتہ اِن میں سے جس پر زور دے دیا جائے وہ گراں وزن سمجھا جائے گا۔جناب عظمت صاحب نے اپنے مضمون میں اِن سب کو ایک ایک لکھہ کا قائم مقام مانا ھے اور انگریزی سے نا واقف اصحاب کو سمجھانے کے لئے شاید اِس سے بہتر طریقہ بھی نہ تھا۔لیکن کوئی اُردو یا ھندی شاعر جسے موزونیت سے ذرہ بھر بھی لگاؤ ھے کبھی اِس بات کو تسلیم نہیں کر سکتا کہ پانچ پانچ اور چھہ چھہ حروف بھی ایک حرف متحرک کے ھم وزن ھو سکتے ھیں۔

اسی لئے وہ انگریزی شعر کو بلا خوف تردید نا موزوں کہہ دیتا ہے اور حقیقت بھی یہی ہے کہ جب تک ہم انگریزی لے میں نہ پڑھیں اور ایکسنٹ کے جھٹکوں اور زیر و بم کی کشا کش سے قوت احساس حروف کو معطل نہ کر دیں انگریزی شعر کسی طرح موزوں نہیں پڑھا جا سکتا۔اُردو تقطیع کو شعر کی جانچ کے لئے بنیے کی ترازو سے تشبیہ دی جا سکتی ہے۔جس زمانہ میں ترازو ایجاد نہ ہوئی تھی وزن کا اندازہ مجوزہ پیمانوں سے کیا جاتا تھا۔اب بھی کہیں کہیں یہ پیمانے مستعمل ہیں چنانچہ پنجاب کے بعض مقامات میں ایک پیمانہ رائج ہے جسے ٹوپا کہتے ہیں۔یہ بدیہی بات ہے کہ ایک ٹوپا گیہوں ایک ٹوپا جو سے وزن میں زیادہ ہوں گے اور یک ٹوپا پارہ تو بہت ہی زیادہ وزنی ہو گا۔اگر اِسی ٹوپے سے گیہوں کا آٹا ناپیں تو ظاہر ہے کہ دبا دبا کر بھرنے سے اِس میں زیادہ آٹا آئے گا اور معمولی طور پر بھر دیں گے تو کم سمائے گا۔بالکل یہی حال انگریزی عروض کا ہے۔اِس کے ٹوپے میں گیہوں ہوں یا جو۔پارہ ہو یا آٹا۔سب کا وزن ایک سمجھا جاتا ہے البتہ اگر ٹوپے کو ذرا دبا کر بھر دیا جائے (یعنی سلیبل پر ایکسنٹ دے دیا جائے) تو وزن میں گرانی محسوس کی جاتی ہے۔ اُردو زبان میں ایکسنٹ کا وجود ہی نہیں۔ایسی حالت میں ناظرین اندازہ فرما سکتے ہیں کہ انگریزی سے کہاں تک مدد مل سکتی ہے —

بوریا باف گرچہ بافندہ است نہ برندش بہ کار گاہ حریر

دراصل اُردو عروض کی اِصلاح کے لئے نئے ارکان کے پیدا کرنے کا سوال نہیں ہے بلکہ اُن کے کم کرنے کی ضرورت ہے۔ارکان اجزا کی ترکیب سے بنتے ہیں ہندی میں صرف دو جز ہیں۔اُردو میں تین۔انگریزی میں دو یعنی (۱) زوردار اور (۲) بے زور۔اگر زوردار کو گُر اور بے زور کو لکھہ کا قائم مقام سمجھہ لیا جائے تو تینوں زبانوں سے جو رکن چاہیں پیدا کر سکتے ہیں۔لیکن موقوف الاخر ارکان صرف اُردو ہی میں پیدا ہو سکیں گے۔کیونکہ ہندی میں حرف موقوف

ہوتا ہی نہیں۔انگریزی میں اگرچہ حرف موقوف ہوتا ہے لیکن اس کا ہونا نہ ہونا برابر ہے۔کیونکہ وہ وزن پر کچھہ اثر نہیں ڈالتا—

تقطیع کے بارے میں جناب عظمت صاحب نے جو تجاویز اصلاح پیش کی ہیں اُن کی تفصیل اُن کے مضمون میں مل سکتی ہے۔اِس جگہ صرف اِس قدر بیان کر دینا کافی ہے کہ اُنہوں نے چودہ ارکان رکھے ہیں جن میں سے آٹھہ وہی ہیں جنھیں اہل ہند کی اوہام پرستی نے ورنک شاعری کے لئے مخصوص کر دیا تھا۔ یہ ارکان اجزا کی تعداد کے لحاظ سے بنائے گئے ہیں یک جزی-دو جزی اور سہ جزی جن کی تفصیل یہ ہے:—

(۱) ت (۲) فع (۳) ت ع (۴) فاع (۵) ت عل (۶) فع لن (۷) مفعولن (۸) فعولن (۹) فاعلن (۱۰) ت ع لن (۱۱) مفعول (۱۲) مفاع (۱۳) فا ع ل (۱۴) ت ع ل—

مذکورۂ بالا ارکان کچھہ ہندی اور کچھہ انگریزی کی تقلید میں اختیار کئے گئے ہیں لیکن اُردو کے وزن کو اجزا کی تعدادِ سے کچھہ سروکار نہیں-اِس میں تعداد حروف کا خیال رکھنا مقدم ہے اِس لئے یہ ارکان یا یوں کہو کہ اُن کا ایک خاص طریقہ پر استعمال کرنا اُردو کے مناسب حال نہیں-کیونکہ اِس طریقہ میں سب سے بڑا نقص یہ ہے کہ ایک مصرع کی تقطیع کو دوسرے مصرع کی تقطیع سے کوئی تعلق باقی نہیں رہتا-جس سے شعر کی صحت و درستی کا اندازہ کرنا مشکل ہو جاتا ہے-یا یوں کہو کہ تقطیع کا مطلب اصلی ہی فوت ہو جاتا ہے۔ لیکن اِس کی تفصیل بیان کرنے سے پہلے اِس طریقہ کا ذکر کرنا ضروری ہے جو عروض جدید میں اِختیار کیا گیا ہے-تا کہ مقابلہ کرنے میں آسانی ہو-عروض جدید میں صرف چھہ آصلی ارکان رکھے گئے ہیں جن کی تفصیل یہ ہے:

(۱) فعلن (مل مل)	چہار حرفی	نوٹ:- اِس مضمون میں ت ع لن متحرک العین اور فعلن ساکن العین میں فرق قائم رکھنے کے لئے اِنہیں ہمیشہ فعِلن اور فعلن لکھا گیا ہے —
(۲) فعِلن (ن ن مل)		
(۳) فاعل (مل ن ن)		
(۴) فعول (ن مل ن)		
(۵) فعولن (ن مل مل)	پنچ حرفی	
(۶) فاعان (مل ن مل)		

مذکورۂ بالا چھہ رکنوں میں پانچ عروض مروجه میں پہلے ھی مستعمل ھیں- صرف ایک رکن فاعل نیا ھے-یه ارکان حروف کی تعداد کے لحاظ سے منتخب کئے گئے ھیں اِس لئے اُنہیں ماترک گُن کہا جا سکتا ھے-گو یه ماترا گُنوں اور ورن گُنوں دونوں پر حاوی ھیں-اِن ارکان سے ھر بحر کی تقطیع نہایت آسانی سے ھو جاتی ھے-جس بحر کی تقطیع کرنی ھو اُس کے اِبتدائی ملفوظ حروف پر غور کرو- اگر پہلے چار حروف پر جز ختم ھو جائے تو چہار حرفی رکن بنا لو ورنه پنچ حرفی-یہی عمل آخر تک کرتے چلے جاؤ سالم رکن نکالتے چلے آئیں گے اور بحر کی تقطیع ھو جائے گی لیکن بعض صورتوں میں آخر میں ایک یا دو یا تین حروف بچ جائیں گے-اُن کو تقطیع میں لانے کے لئے ھم نے تین زحاف رکھے ھیں- اگر تقطیع کرتے وقت مصرع کے آخر ایک حرف بچے تو وہ ضرور موقوف ھو گا- مثلاً حالی —

کام کا شاید زمانه ھو چکا

فاعلن فعلن فعولن فاعلن

دل میں اب اُٹھتی نہیں کوئی اُمنگ

فاعلن فعلن فعولن فاعلات

مذکورۂ بالا شعر کے پہلے مصرع کی تقتیع چار سالم ارکان سے ھوگی دوسرے مصرع میں اگر آخری رکن فاعلن رکھیں تو ایک حرف موقوف

بچ رهتا هے اِس لئے رکن کو فاعلات بنانا پڑے گا۔هم چاهیں تو اِسے علیحدہ رکن تسلیم کرسکتے هیں ایسی حالت میں یہ کہنا پڑے گا کہ فاعلات ایک سالم رکن هے جو صرف مصرع کے آخر میں آتا هے اور فاعلن کے مقابل اس کا لانا جائز هے—

لیکن اِسے فاعلن کی مزاحف (مسبغ) صورت ماننے میں زیادہ آسانی هے۔کیونکہ موقوف حرف هر رکن کے آخر آتا هے اور ایک هی زحاف (تسبیغ) سے چھ رکن پیدا هوجاتے هیں علاوہ ازیں استخراج ۔جماعت بندی اور تسمیہ میں بڑی مدد ملتی هے—

اگر تقطیع کرتے وقت مصرع کے آخر دو حرف بچیں تو اُن کی صورت همیشہ فع کی هوگی چونکہ همارے چھ رکنوں میں سے فاعل ایسا لفظ هے جس کے دونوں آخری حرف متحرک هیں وہ مصرع کے آخر اُسی وقت آسکتا هے جب کہ دونوں متحرک حروف حذف کردئے جائیں ایسی حالت میں اُس کی صورت فع کی هوجائے گی۔اِسی لئے هم نے فع کو فاعل کی مخذوف صورت مانا هے۔یہ بھی ممکن تھا کہ هم فع کو علیحدہ رکن مان لیتے۔لیکن مخذوف ماننے میں تقسیم و تسمیہ وغیرہ میں بہت مدد ملتی هے جیسا کہ آیندہ ظاهر هوگا—

اگر تقطیع کرتے وقت آخر مصرع تین حروف بچ جائیں اور آخری حرف موقوف نہ هو تو اُن کی صورت همیشہ فعل کی هوگی۔اسے هم نے فعول کی مقصور صورت مانا هے۔کیونکہ فعول کبھی مصرع کے آخر نہیں آسکتا—

غرض مذکورۂ بالا تین زحاف سے آٹھ رکن اور پیدا هوتے هیں جو همیشہ مصرع کے آخر هی میں آتے هیں باقی ساری تقطیع گذشتہ چھ سالم ارکان سے هوجاتی هے۔تمام ارکان کی تفصیل یہ هے—

ارکان سالم	ارکان مزاحف		
	محذوف	مقطوع	مسبغ
فعلن	...	...	مفعول
فعِلن	...		فعِلات
فعول	...	فعل	فعول
فاعل	فع	..	فاع
فعولن	...		مفاعیل
فاعلن	...	.	فاعلات

مذکورۂ بالا بیان سے ظاہر ہے کہ تقطیع جدید میں صرف چھ ارکان سالم اور تین زحافات سے کام پڑتا ہے اور سالم اور مزاحف ارکان کی مجموعی تعداد چودہ ہے۔جناب عظمت صاحب نے بھی ارکان کی تعداد چودہ ہی رکھی ہے لیکن نتائج میں زمین و آسمان کا فرق ہے—

(۱) وہ تقطیع چار طرح پر تجویز کرتے ہیں یک جزی۔دو جزی۔سہ جزی اور مرکب اُن کے نزدیک مختلف بحور کے لئے مختلف قسم کی تقطیع موزوں ہوگی۔لیکن اس بات کا فیصلہ کرنے کے لئے کہ کونسی تقطیع زیادہ موزوں ہے غالباً چاروں طرح تقطیع کرنا پڑے گی لیکن ہمارے طریقہ سے صرف ایک ہی تقطیع ہوسکتی ہے اور وہ ہر حالت میں موزوں و مناسب ہوگی—

(۲) اُن کی تقطیع موجودہ عروض سے کم مشابہت رکھتی ہے کیونکہ اِس میں کم سے کم چار رکن ایسے ہیں جو موجودہ عروض میں نہیں (ت-ت ع-ت ع ل-فا ع ل) ہمارے ہاں صرف ایک رکن " فاعل " زیادہ ہے ورنہ سب وہی ہیں جو مروجہ تقطیع میں عام طور پر مستعمل ہیں—

(۳) اِن کے ہاں آخری موقوف حرف متحرک مانا جاتا ہے جو نہ صرف اہل عروض کی مسلمہ روش کے خلاف ہے بلکہ اصول بھی ہے۔موقوف کو موقوف مان کر تقطیع کی جائے تو ان کے ارکان تقطیع کے لئے کافی نہیں—

(۴) اِن کے ارکان ورنک طریق پر بنائے گئے ہیں یعنی اِن میں صرف اجزا کی تعداد کا خیال رکھا جاتا ہے۔انگریزی زبان میں سب اجزا ایک حیثیت رکھتے ہیں اِس لئے اِس زبان میں یہ طریقہ سائنٹیفک ہو تو ہو لیکن اُردو میں تقطیع کو اجزا کی تعداد سے کوئی تعلق نہیں۔اِس میں حروف کی تعداد کا خیال مقدم ہے اسی لئے ہم نے ماترک طریق پر ارکان مرتب کئے ہیں جو ہندی۔ اُردو۔فارسی یا عربی کی ہر بحر کی تقطیع کے لئے موزوں اور مناسب ہیں—

(۵) اِن کی تقطیع سے تقطیع کا اصلی منشا پورا نہیں ہوتا۔یہ بات ایک مثال سے بخوبی سمجھ میں آجائے گی مثلاً حالی—

جب تک شہر آباد رہے گا نام تمہارا یاد رہے گا

اِس کی تقطیع ہمارے طریقہ سے

فعلن	فعلن	فاعل	فعلن
فاعل	فعلن	فاعل	فعلن

ہوتی ہے اِس تقطیع پر ایک سرسری نظر ڈالنے سے بھی معلوم ہو جاتا ہے کہ ہر مصرع میں چار رکن ہیں اور ہر رکن چہار حرفی ہے۔اِس لئے ہر مصرعہ میں سولہ حروف ہیں۔دونوں مصرعوں میں صرف یہ فرق ہے کہ دوسرے مصرع میں فعلن کی جگہ فاعل آیا ہے۔ یعنی ایک گُر کے مقابلہ میں دو لکھ آئے ہیں۔چونکہ اِس قسم کا اِختلاف اُردو میں جائز ہے اِس لئے کہا جا سکتا ہے کہ شعر صحیح ہے۔جناب عظمت صاحب کے طریقہ سے دو جزی تقطیع یہ ہے۔

فعلن	فعلن	فا ع	فعل	فع
فا ع	فعل	فعلن	ت ع	فعلن

قارئین کرام ذرا غور فرمائیں کہ اِن دونوں مصرعوں کی تقطیع میں کیا

مناسبت ھے۔ھمارے خیال ناقص میں جب تک اِس تقطیع کو توڑ پھوڑ کر از سرنو غور نہ کیا جائے مبتدی تو درکنار منتہی بھی نہیں سمجھہ سکتا کہ اِن دونوں مصرعوں کا ایک ھی شعر میں جمع کرنا جائز ھے یا نہیں۔اب سہ جزی تقطیع بھی ملاحظہ ھو وہ یہ ھے۔

مفعولن	مفعول	فعو ان	
فا عل	مفعولن	ف ع لن	فع

اِس میں پہلا مصرع تین رکن کا ھے اور دوسرے مصرع میں چار رکن ھیں۔کوئی رکن کسی رکن سے مناسبت نہیں رکھتا۔ھم نہیں سمجھہ سکتے کہ اِس قسم کی تقطیع آسانی پیدا کرے گی یا اُلجھن۔ایسی تقطیع سے تو یہی بہتر ھے کہ تجزیہ ھی کو تقطیع سمجھہ کر قصہ کوتاہ کر دیا جاوے۔تقطیع کے لئے صرف یہی کافی نہیں کہ الفاظ کا ایسا مجموعہ پیش کر دیا جاوے جو حروف و حرکات میں مصرعہ سے مطابقت رکھتا ھو بلکہ الفاظ بھی ایسے ھونے ضروری ھیں جن کا بہ سہولت مقابلہ ھو سکے۔تاکہ شعر کی درستی و نا درستی کا اندازہ کیا جا سکے۔

جناب کاظم صاحب کی تقطیع میں بھی کم و بیش یہی نقص موجود ھیں کیونکہ اِن کے ارکان بھی چھوٹے بڑے ھیں مثلاً۔

	تقطیع جدید				تقطیع کاظمی								
اندھیاری میں گھرائی ھے	فعلن	فعلن	فعلن	فعلن	گُل	گُل	گُل	گُل	گُل	گُل	گُل	گُل	گُل
جھڑی لگی ھے ھلکی ھلکی	فعول	فعلن	فعلن	فعلن	صبا	صبا	گُل	گُل	گُل	گُل	گُل	گُل	

رمز شناسان عروض و موزونیت خود اندازہ فرما سکتے ھیں کہ کونسا طریقہ مقاصد تقطیع کو کمالیت کے ساتھہ پورا کرتا ھے۔

انفکاک بحور

اُردو میں بحور کا انفکاک دوائر کے ذریعہ کیا گیا ہے جو نہایت محدود اور پیچیدہ ہے اِس کے نقائص ماہرین فن سے پوشیدہ نہیں۔جناب کاظم و جناب عظمت صاحبان کے مجوزہ ارکان اِس قابل ہی نہ تھے کہ اُن سے اِستخراج بہ سہولت ممکن ہوتا اِس لئے اُنہوں نے اِس طرف توجہ ہی نہیں کی۔لیکن ہمارے ارکان ایسے مکمل ہیں کہ اُن کے ترکیب دینے سے تمام ممکن بحور پیدا ہو جاتی ہیں چنانچہ عروض جدید میں صرف چھہ ارکان سے آٹھہ رکن تک کی چالیس لاکھہ اکیس ہزار چھہتر مختلف بحریں نکالی گئی ہیں—

تقسیم و تسمیہ بحور

بحور کی جماعت بندی اور تسمیہ درحقیقت ایک مشکل کام ہے۔ کسی مشکل کام سے پنڈ چھڑانے کا سب سے آسان طریقہ یہ ہے کہ سرے سے اِس فعل ہی کو بے سود سمجھہ لیا جائے لیکن کوئی علم ایسا نہیں جس میں ترتیب و تقسیم سے چشم پوشی کی گئی ہو۔انگریزی شاعر بھی جو اپنے شعر کو موزونیت کے اعلیٰ معیار تک نہ پہنچا سکے جماعت بندی و تسمیہ کی ضرورت کے قائل ہیں۔عروض مروجہ میں زحافات کا گورکھدھندا محض جماعت بندی کی خاطر ہی تیار کیا گیا تھا۔عروضیان قدیم نے جب آٹھہ رکن مقرر کرکے اُن سے اُنیس سالم بحریں پیدا کرلیں تو باقی تمام بحور کو انہي کی اقسام داخل کرنے کی کوشش کی۔ ارکان ہشت گانہ کی ساخت ایسی بے ڈھنگی تھی کہ اُن کے ذریعہ تمام بحور کی تقطیع ہونی ممکن نہ تھی۔اِس لئے مجبوراً دوسرے لفظ استعمال کرنے پڑے۔ممکن تھا کہ اِن نئے الفاظ کو بھی سالم رکن مان لیا جاتا۔لیکن جماعت بندی کا خیال مانع ہوا۔مجبوراً اُنہوں نے نہایت کاوش و جانکاہی سے اِن نئے الفاظ کا رشتہ ارکان ہشت گانہ ہی سے جاملایا اور تمام بحور کو جن میں باہمی مناسبت یا

مشابہت نام کو نہ تھی مصنوعی اور بناوٹی تعلقات کی بنا پر اپنی مفروضہ اُنیس بحروں کی ذریات میں داخل کرلیا-مثلاً اُن کے ہاں ۲۸ حروف کی ایک بحر " مفاعیلن مفاعیلن مفاعیلن مفاعیلن " موجود تھی جسے وہ ہزج کہتے تھے- اب اِنہیں ایک اور بحر ملی جس کی تقطیع اُنہوں نے " مفعول مفاعیلن مفعول مفاعیلن " کی-اِس بحر میں چوبیس حروف ہیں اور اول الذکر بحر سے کوئی تعلق نہیں-تاہم چونکہ اِس میں دوبار مفاعیلن موجود ہے اُنہوں نے چاہا کہ کسی نہ کسی طرح اِس بحر کو ہزج کی ذریات میں داخل کرنا چاہئیے-مفعول کا تعلق مفاعیلن سے پیدا کرنا آسان بات نہ تھی-مگر تصور کا میدان بہت وسیع ہے اُنہوں نے مفاعیلن کو اُونٹ کا سر خیال کیا اور اول و آخر حروف کو دونوں کان سمجھ کر کاٹ ڈالا-میم و نون کے اُڑنے سے فاعیل رہ گیا یہ کن کٹا مفاعیلن مفعول کا ہموزن ہے اِس لئے اُنہوں نے مفعول کا نام اخرب (کن پھٹا) رکھا اور اس نئی بحر کو ہزج اخرب کہنے لگے- اہل عروض نے اپنی قوت متخیلہ کے بل پر جماعت بندی اور تسمیہ کے مرحلہ کو طے تو کرلیا لیکن اِس سے بے انتہا مشکلیں پیدا ہونے کے علاوہ تقسیم کی اصلی غرض ہی مفقود ہوگئی- عروض مروجہ کا یہی حصہ سب سے زیادہ محتاج اصلاح ہے-جناب عظمت صاحب نے تو جماعت بندی و تسمیہ کو فعل لاحاصل خیال فرما کر اِس طرح توجہ ہی نہیں فرمائی- لیکن جناب کاظم صاحب نے اپنے رسالہ میں تین طرح پر تقسیم کی ہے پہلی تقسیم میں تو سترہ بحروں کے وہی نام رکھے ہیں جو عروض مروجہ میں ہیں-لیکن ہر بحر کے نام کے ساتھ چند مزاحف بحور کو بھی داخل کرلیا ہے-مثلاً ہزج سالم کے ساتھ سات مزاحف بحریں اور بھی لکھی ہیں جن کو ہزج کا نام دیا گیا ہے-چند بحور کو کسی ایک نام سے موسوم کرنے کے لئے کچھ مشابہت بھی ہونی چاہئیے-عروض مروجہ میں گو اصلی مشابہت سے کام نہیں لیا گیا تاہم خیالی مشابہت زحافات کے ذریعہ سے پیدا کرلی گئی-جس حالت میں

جناب کاظم صاحب زحافات کے جھگڑے کو اُٹھانا چاھتے ھیں تو وہ خیالی مشابہت بھی غائب ھوجاتی ھے اور اُن آٹھوں مختلف بحروں کو ایک ھی نام سے موسوم کرنے کے لئے کوئی دلیل باقی نہیں رھتی مثلاً " مفاعیلن مفاعیلن مفاعلن مفاعیلن "کو اگر جناب کاظم صاحب نے بحر ھزج کہا تو کچھہ ھرج نہیں- لیکن مزاحف بحر " مفعول مفاعیلن مفعول مفاعیلن " کو اھل عروض اِس لئے ھزج میں داخل کرتے ھیں کہ مفعول اُن کے تصور میں کن پھٹا مفاعیل ھے -اگر اِس تصور ھی کو نہ مانا جائے تو اس بحر کو ھزج سے کوئی تعلق نہیں رھتا-پس زحافات سے اِنکار کرنا اور دونوں بحروں کو ھزج کہنا گُڑ کھانے اور گُلگُلوں سے پرھیز کرنے کا مرادف ھے -مولانا کی دوسری تقسیم بھی اِسی قسم کی ھے-ھر بحر کی پہلی قسم رعنائی-دوسری سوسنی-تیسری سنبلی وغیرہ کہلاتی ھے-مگر جو ترتیب اُنھوں نے رکھی ھے نہ تو اِسی میں کوئی اُصول مدنظر رکھا گیا ھے نہ ان ناموں میں ھی کوئی وجہ مشارکت معلوم ھوتی ھے مثلاً سوسنی نام کی تمام بحروں کو جمع کیا جاوے تو اُن میں کوئی خصوصیت ایسی نہیں ملے گی جس کی وجہ سے وہ ایک ھی نام سے پکارے جانے کی مستحق ھوں-پس اس تقسیم کا لازمی نتیجہ یہ ھوگا کہ ھر بحر کے ساتھہ کم سے کم دو بے تعلق لفظ یا نام بھی رٹنے پڑیں گے—

حکیم صاحب کی تیسری تقسیم بظاھر معقول نظر آتی ھے کیوں کہ اس میں اخلاط جداگانہ کی رعایت نظر آتی ھے-جن بحروں میں صرف گُل آتا ھے وہ زھری کہلاتی ھیں جن میں گُل اور صبا آتا ھے اُنھیں ازھری نام دیا گیا ھے - جن میں گُل اور چمنی موجود ھو وہ عبھری کے نام سے موسوم ھیں وغیر وغیر- جماعت بندی کا اصلی منشا یہ ھے کہ کم سے کم متشابہ بحور جو ایک ھی نظم میں جمع کی جاسکتی ھیں وہ ایک ھی گروہ کے ماتحت اِکھٹی ھو جائیں دیکھنا یہ ھے کہ اِس تقسیم سے یہ بات حاصل ھوتی ھے یا نہیں-اِس مطلب کے لئے ایک

ہی نظم کے دو شعروں کی تقطیع درج ذیل ہے

مصرع	تقطیع کاظمی	نام کاظمی	تقطیع جدید	جدید نام
برکھارت کی گھٹا چھائی ہے	گُل گُل گُل چھنی گُل گُل گُل	عبہری	فعلن فاعل فعلن فعلن	مربع رباعی سالم
بالوں کو کھولے رات آئی ہے	گُل چھنی گُل گُل گُل گُل گُل	عبہری	فاعل فعلن فعلن فعلن	ایضاً
اندھیاری میں گہرائی ہے	گُل گُل گُل گُل گُل گُل گُل گُل	زہری	فعلن فعلن فعلن فعلن	ایضاً
جھڑی لگی ہے ہلکی ہلکی	صبا صبا گُل گُل گُل گُل گُل	ازہری	فعول فعلن فعلن فعلن	ایضاً

مذکورۂ بالا مثال میں چار متشابہ بحریں جمع ہوگئی ہیں - چاہئے تو یہ تھا کہ اُن کے لئے کوئی ایسا عام نام ہوتا جس کے ماتحت وہ سب جمع ہوجاتیں لیکن جناب کاظم صاحب کی تیسری تقسیم اُلٹا ان کو متفرق کردیتی ہے - دو بحریں تو عبہری ہیں - ایک زہری ہے اور ایک ازہری - ان کی پہلی دو تقسیموں کے مطابق تیسرا مصرع متدارک ضمیرانی ہے باقی تین مصرعے کسی بحر میں بھی نہیں - جس سے اس تقسیم کی جامعیت کا اندازہ ہوسکتا ہے —

عروض جدید میں جو تقسیم ہم نے اختیار کی ہے وہ ان تمام نقائص سے پاک ہے - پہلی تقسیم ارکان کی تعداد کے لحاظ سے کی گئی ہے - چونکہ اردو بحروں میں ارکان کی تعداد آٹھ تک ہوتی ہے اِس لئے بحروں کی آٹھ بڑی بڑی جماعتیں ہوجاتی ہیں - موحد (یک رکنی) - مثنی - مثلث - مربع - مخمس - مسدس - مسبع - مثمن (ہشت رکنی) یہ تقسیم اِسی طرح کی ہے جیسے انگریزی میں Monometer و Dimeter وغیرہ ہے - مذکورۂ بالا آٹھ جماعتوں کی تقسیم ارکان حروف کے لحاظ سے فریقوں میں کی گئی ہے - چونکہ ارکان دو قسم کے ہیں چہار حرفی

ر پنج حرفی۔ پس جن بحروں کے تمام ارکان چہار حرفی ہیں وہ رباعی اور
جن کے تمام ارکان پنج حرفی ہوں وہ خماسی اور جن میں دونوں قسم کے ارکان
موجود ہوں وہ مرکب کہلاتی ہیں—

فریقوں کو زحافات کے لحاظ سے چار جنسوں—سالم—محذوف—مقطوع اور
مسبغ میں تقسیم کیا گیا ہے۔ اِس مختصر اور سادہ تقسیم سے چالیس لاکھہ سے
زیادہ بحور بہت تھوڑی جماعتوں کے ماتحت جمع ہو جاتی ہیں۔ سب سے بڑی
خوبی اِس تقسیم میں یہ ہے کہ اِس میں متشابہ بحور کے لئے ایک ہی عام نام
مل جاتا ہے۔ مثلاً مثال مذکورۂ بالا کی چاروں بحروں کا نام عروض جدید کی رو سے
مربع رباعی سالم ہوتا ہے جس کے یہ معنی ہیں کہ ہر بحر میں چار چار رکن
ہیں ہر رکن چار حرفی اور سالم ہے یعنی ہر بحر میں سولہ حروف ہیں۔ پس یہ نام
مقصد تقسیم دو بوجہ أحسن پورا کرتا ہے—

عروض جدید میں عام نام کے علاوہ ہر بحر کا ایک خاص نام بھی تجویز
کیا گیا ہے جسے نوعی نام کہتے ہیں۔ نوعی نام بنانے کا طریقہ نہایت آسان ہے۔ صرف
چھہ حروف کا مفہوم یاد رکھہ لینے سے ہر شاعر دنیا بھر کی بحروں کا نام خود
ہی بنا سکتا ہے۔ وہ یہ ہے کہ ہر رکن کے لئے ایک ایک حرف مقرر کر لیا جاوے۔
چونکہ تمام بحور صرف چھہ رکنوں سے بنتی ہیں اِس لئے صرف چھہ حروف کافی
ہوں گے۔ ہم نے عروض جدید میں جہاں اُردو اور فارسی کی تمام مروجہ بحریں
مثال اور تقطیع کے ساتھہ لکھی ہیں وہیں ہر بحر کا نوعی نام بھی درج
کر دیا ہے۔ ان ناموں کے بنانے میں مفصلہ ذیل حروف اِستعمال کئے گئے ہیں جو
ارکان کے ہم وزن اسمائے الٰہی سے لئے گئے ہیں—

ب = فعلن = باری

ح = فاعل = حامد

ص = فعلن = صمد

ع = فعول = علی

ک = فعولن = کریم

م = فاعل = ماجد

مذکورۂ بالا حروف کی مدد سے ہر بحر کا خاص یا نوعی نام بنایا جا سکتا ہے مثلاً "فعلن فاعل فعلن فعلن" کا نام "بحبب" اور "فاعل فعلن فعلن فعلن" کا نام "حببب" ہوگا یہ نام ابتدا میں ضرور اجنبی معلوم ہوں گے مگر جس حالت میں "صلعم" سے ہم فوراً صلی اللہ علیہ و سلم سمجھ جاتے ہیں تو ذرا سی مشق کے بعد اِن ناموں سے بھی بحر کا وزن فوراً سمجھ میں آجائے گا اور یہی نام رکھنے کا مقصد بھی ہے۔ان ناموں میں بہت سی خوبیاں ہیں جن کا مفصل بیان ہم نے عروض جدید میں کیا ہے۔اِس جگہ صرف اِسی قدر لکھ دینا کافی ہے کہ بیس لاکھ پندرہ ہزار پانچ سو اڑتیس مختلف بحروں کے لئے علیحدہ علیحدہ نام نکل آتے ہیں جن کے مفہوم کا سمجھنا صرف چھ حرفوں کا مفہوم یاد کر لینے پر موقوف ہے۔اِس سے زیادہ آسانی اور کیا ہو سکتی ہے—

آخر میں ہم رباعی کی بارہ غیر مسبغ بحروں کی مروجہ و جدید تقطیع درج کرتے ہیں۔اگر ناظرین با تمکین جناب عظمت و کاظم صاحبان کے انداز پر تقطیع فرما کر اِس کا تقطیع جدید سے مقابلہ فرمائیں گے تو ہر طرز کا حسن و قبح خود ہی کُھل جائے گا—

نمبر	تقطیع مروجہ	تقطیع جدید
۱	مفعولن مفعولن مفعولن فع	فعلن فعلن فعلن فعلن فعلن
۲	مفعولن مفعولن مفعول فعل	فعلن فعلن فعلن فعلن فعِلن
۳	مفعولن مفعول مفاعیلن فع	فعلن فعلن فاعل فعلن فعلن
۴	مفعولن مفعول مفاعیل فعل	فعلن فعلن فاعل فعلن فعِلن

نمبر	تقطیع مروجه	تقطیع جدید
۵	مفعولن فاعلن مفاعیلن فع	فعلن فعلن فعول فعلن فعلن
۶	مفعولن فاعلن مفاعیل فعل	فعلن فعلن فعول فعلن فعملن
۷	مفعول مفاعیلن مفعولن فع	فعلن فعملن فعلن فعلن فعلن
۸	مفعول مفاعیلن مفعول فعل	فعلن فعملن فعلن فعلن فعملن
۹	مفعول مفاعیل مفاعیلن فع	فعلن فعملن فاعل فعلن فعلن
۱۰	مفعول مفاعیل مفاعیل فعل	فعلن فعملن فاعل فعلن فعملن
۱۱	مفعول مفاعلن مفاعیلن فع	فعلن فعملن فعول فعلن فعلن
۱۲	مفعول مفاعلن مفاعیل فعل	فعلن فعملن فعول فعلن فعملن

مذکورۂ بالا بارہ بحور کا عام نام "مخمس رباعی سالم" هے اگر اِن میں سے هر ایک کے بعد ایک ایک حرف موقوف اور زیادہ کر دیا جائے تو رباعی کی باقی ماندہ بارہ بحور بھی پیدا هو جائیں گی اور اُن کا عام نام "مخمس رباعی مسبغ" هوگا۔تقطیع جدید نه صرف اکثر بحور کو سالم بنا دیتی هے بلکه اس میں متشابه بحور کا مقابله بھی نهایت آسانی سے کیا جا سکتا هے۔اگر غور کیا جائے گا تو یه خوبی کسی اور طریق میں نهیں ملے گی —

ایک خلش سی ایک چبھن سی جس میں مزہ بھی آتا ھے

از

جناب محمد عظمت اللہ خاں صاحب
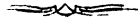
جان کی تہ میں کوئی بیٹھا ھے
ایک بے چینی کھٹکا ھے
چٹکیاں بیٹھا کوئی لیتا ھے
ایک کھٹکتا کانٹا ھے
ایک خلش سی ایک چبھن سی جس میں مزہ بھی آتا ھے

:o:

اس بے چینی سے سرگرداں
انسان سدا رھتا ھے
اس انجان کھٹک سے حیراں
سکھ ڈھونڈتا دکھ سہتا ھے
زیست کے طوفان جسم کی کشتی میں بے قابو بہتا ھے

:o:

تنک اسے ھی بھوک کا جانا
پیٹ کا دھندا پھیلا یا

جینا ٹھیرا کھانا کھانا
پیٹ سے بڑھکر جب پایا
مال بنایا عیش منایا دنیا سے چین مٹایا

—————:o:—————

تیر اِسے ھی عشق کا جانا
دل چوٹی میں اٹکایا
حسن کا بنکر اک دیوانا
عشق کا افسانہ بنایا
ھجر کی راتیں وصل کی گھڑیاں چین کسیطرح نہ پایا

حق کی طلب بھی اسکو ھی مانا
مذھب کا رنگ جمایا
صومعہ - مندر - مسجد - گرجا
میں اپنے سر کو جھکایا
دل کو ٹٹولا روح کو چھانا چین نہ پانا تھا نہ پایا

-:o:-

علم کی چیٹک اسکو سمجھا
عقل کا ایک جال بچھایا
قدرت کے بھیدونکو پھانسا
جگ کی ہر چیز پہ چھایا
برق کو باندھا پون کو جیتا چین مگر ھاتھ نہ آیا

-:o:-

سانس کے جھونکوں سے یہ شگوفہ

جان کا جب تک کھلتا ہے

سکھہ دکھہ کاہے گورکھہ دھندا

دل کا لنگر ہلتا ہے

ایک کھٹک ہے ایک چبھک ہے جس میں مزہ بھی ملتا ہے

تبصرے

ادب

ناٹک ساگر

(یعنی دنیاے ڈراما کی تاریخ)

میاں نور الہی اور صاحبزادہ محمد عمر صاحبان سے اُردو کے ناظرین بخوبی واقف ہیں۔ڈراما پر اُن کے بعض مضامین اِس رسالے میں شایع ہو چکے ہیں جو اِسی کتاب کے اجزا تھے۔نیز اِن کے بعض ڈراموں پر (جن میں سے اکثر ترجمے تھے) تبصرے بھی لکھے جا چکے ہیں۔اِن دونوں صاحبوں نے اِس بات کا بیڑا اُٹھایا ہے کہ دنیا کے بہترین ڈراموں کا ترجمہ اُردو زبان میں کریں گے۔ ڈرامے ہی تالیف کریں گے۔مضامین بھی ڈرامے ہی پر لکھیں گے اور غالباً باتیں بھی ڈرامے ہی کی کرتے ہوں گے۔غرض اِن کا اوڑھنا بچھونا ڈراما ہے۔بعض لوگوں کے خاص خاص لفظ تکیۂ کلام ہوتے ہیں گویا وہ ٹھیکے ہیں۔جن کی مدد بغیر وہ کوئی جملہ نہیں بول سکتے۔اسی طرح ڈراما اِن دونوں صاحبوں کا "تکیۂ خیال" ہے۔کوئی مضمون ہو کوئی خیال ہو وہ یا تو ڈرامے کے متعلق ہوگا یا اُس سے ٹکرا کر نکلے گا۔یہ اسی انہماک کا نتیجہ ہے کہ اُنہوں نے دنیا بھر کے ڈراموں کی تاریخ لکھ ڈالی ہے جس میں ہر ملک کے مشہور ڈراما نگاروں اور ایکٹروں کے خاص خاص کارنامے۔ممالک عالم کے اِسٹیج کے عروج و زوال کے اسباب اور فن ڈراما کی ارتقائی کیفیت بیان کی ہے۔اُردو زبان میں یہ پہلی

کتاب ہے جو اِس فن پر ایسی جامع حیثیت سے لکھی گئی ہے۔کتاب کیا ہے درحقیقت ایک ساگر ہے جو دلچسپ اور مفید معلومات سے بھرپور ہے—

ہندوستان کا باب ایک سو بارہ صفحہ پر ہے جس میں اِس ملک کے قدیم اور جدید ڈرامے پر تفصیل سے بحث کی گئی ہے۔جس میں اُردو ڈرامے کے حصے میں تقریباً اڑتیس صفحے آئے ہیں بہت ہی پر لطف مضمون ہے اِس میں اُردو تھیٹروں اور ناٹکوں کی پوری تاریخ اور اُن کی تنقید۔ڈراموں کے مصنفوں کا ذکر۔اُن کی خصوصیات۔مشہور اور ہردلعزیز ایکٹروں کے حالات۔اُن کا اثر۔لوگوں کا شوق۔فن اور متعلقات فن کے متعلق تنقیدی اور ادبی نکات۔یہ سب باتیں ایسی خوبی سے لکھی ہیں کہ لایق مصنفین کی تحقیق اور کاوش کی داد دینی پڑتی ہے۔اِس سے پہلے کبھی اِس تفصیل اور جامعیت کے ساتھہ کسی نے اِس مضمون پر بحث نہیں کی تھی۔لیکن اس بات کا اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ اب تک اُردو زبان میں کوئی اعلیٰ درجے کا ڈراما نہیں لکھا گیا۔البتہ بنگالی زبان کو یہ عزت حاصل ہے۔وہاں ہماری طرح اِس فن کو معیوب خیال نہیں کیا جاتا۔ابھی ہمیں کچھہ دنوں انتظار کرنا پڑے گا کہ اُردو میں ایسا ڈراما لکھا جائے کہ ہر لحاظ سے اعلیٰ پایہ کا ہو اور اُس کا ترجمہ غیر زبانوں میں کیا جائے۔اصل یہ ہے کہ ہمارے ہاں اِس فن کو حقیر سمجھا جاتا ہے اور یہی وجہ ہے کہ اِس میں کوئی ترقی نہیں ہوئی۔اس کی حالت بعینہ وہی ہے جو اِس زمانے میں موسیقی کی ہو گئی ہے۔حالانکہ یہ وہ چیز ہے کہ اگر اس سے سلیقہ سے کام لیا جائے تو بڑے بڑے کام نکل سکتے ہیں اور اصلاح حالت اور اصلاح ذوق میں بہت بڑی مدد دے سکتا ہے۔اِس کی بڑی ذمہ‌داری ہمارے ادیبوں اور صاحب ذوق حضرات پر ہے۔کئی سال کا ذکر ہے کہ حیدرآباد میں ایک تھیٹر آیا ہوا تھا۔ہمارے ایک دوست نے اُسی زمانے میں ایک ڈراما لکھا تھا وہ اُنھوں نے تھیٹر کے مالک کو سنایا بعض مقامات سن کر اُسے بہت رقت ہوئی۔

سب سننے کے بعد اُس نے ڈرامے کی بہت تعریف کی اور مصنف کی خوب داد دی مگر ڈرامے کے لینے سے معذوری ظاہر کی۔میں نے سبب پوچھا تو کہا کہ ہم اسٹیج کے لئے ایسے ڈرامے لیتے ھیں جنھیں سن کر چوتھے درجے کے بیٹھنے والے تحسین و آفرین کے نعروں سے داد دیں—

جب ڈرامے کا معیار یہ ٹھیرا تو ظاھر ھے کہ اس کی حالت کیا ھوگی۔اِس کتاب کے شروع میں حضرت کیفی (جناب پنڈت برجموھن دتاتریہ صاحب دھلوی) نے ایک عالمانہ اور محققانہ مقدمہ تحریر فرمایا ھے جس میں اُنھوں نے بڑی سچی بات لکھی ھے "یہاں میں ایک سوال کرنے کی اجازت چاھتا ھوں۔تھیٹر میں ایک کھیل ھو رھا ھے اور اسٹیج پر ایسی تقریر کرائی جاتی ھے یا ایک ایسا سین دکھایا جاتا ھے جسے مذاق سلیم گوارا نہیں کر سکتا۔اِس پر اگر دس بیس بھلے آدمی حاضرین میں سے اظہار ناپسندیدگی کریں یا تماشے سے اُٹھ جائیں تو کیا آپ سمجھتے ھیں کہ تماشا کرنے والی کمپنی پر اس کا کچھ اثر نہوگا۔ھوگا اور ضرور ھوگا۔اِس کی نظیریں موجود ھیں"۔ھماری اخلاقی بزدلی نے ایک ڈرامے ھی کو کیا ھمارے بہت سے معاملات کو خراب کر رکھا ھے۔اصلاح و ترقی کے لئے اخلاقی جرأت سب سے زیادہ ضروری چیز ھے—

ھمیں یقین ھے کہ اِس کتاب کی اشاعت ڈرامے کے متعلق بہت سی غلط فہمیوں کو رفع کرے گی۔بہت سے ایسے نکتے معلوم ھوں گے جن سے ھم بے خبر تھے اور ملک کے انشا پردازوں کے لئے ھدایت کا کام دے گی۔جو صاحب ڈرامے سے شوق رکھتے ھیں یا جن کا رجحان اِس طرف ھے اُن کے لئے یہ کتاب ایک نعمت ھے نورعمر صاحبان قابل مبارکباد ھیں کہ اُنھوں نے اُردو ادب میں بہت اچھا اضافہ کیا ھے اور ایک ایسے مضمون پر کتاب لکھی ھے جس سے ھماری زبان خالی تھی—

ناظرین کو حیرت ھوگی کہ یہ پونے پانسو صفحہ کی کتاب ایک ھفتے

میں چھپ کر تیار ہوئی ہے یہ لاہور کے مطابع کا کمال ہے۔یہ تو خیر چھپائی کا کام ہے ہم نے سنا ہے کہ وہاں کے بعض اہل قلم ہفتہ بھر میں ایسی ضخیم کتاب تصنیف کر ڈالتے ہیں۔عجلت کے آثار اس کتاب میں بھی جگہ جگہ نظر آتے ہیں مگر وہ مصنفین کی محنت۔وسعت نظر اور مضمون کی اہمیت کے مقابلے میں اس قدر خفیف ہیں کہ قابل ذکر نہیں —

(کتاب بہت اچھی چھپی ہے۔کاغذ بھی بہت اچھا لگایا ہے۔قیمت فی جلد دو روپئے آٹھ آنے اور مجلد کے تین روپیہ ہے۔شیخ مبارک علی صاحب تاجر کتب لوہاری دروازہ لاہور سے مل سکتی ہے) —

کلام شاد حصۂ اول

مولوی سید علی محمد صاحب شاد عظیم‌آبادی۔ہندوستان کے شعراء قدیم کی زندہ یادگار اور مشاہیر روزگار میں سے ہیں۔کلام شاد مدت مدید سے اُردو کے نامور علمی و ادبی رسائل میں شائع ہوتا رہا ہے اور اہل ذوق ہمیشہ مزہ لیتے رہے ہیں۔شکر ہے کہ انجمن ترقی اُردو پٹنہ کی مساعی جمیلہ سے اُس کا پہلا حصہ چھپ کر شائع ہوگیا ہے۔یہ ایک سو ساٹھ صفحات پر صرف غزلوں کا مجموعہ ہے۔آغاز میں مولانا سید سلیمان ندوی کا مقدمہ ہے جس میں بتایا گیا ہے کہ عظیم آباد کو اُردو سے کیا نسبت ہے اور جناب شاد کا پایۂ شعر کیا ہے۔بقول مقدمہ نگار جناب شاد کے مالک سخن میں قصائد۔مثنویاں۔رباعیات۔غزلیں۔افراد سب کچھ ہے اور آپ کے اشعار کی تعداد ایک لاکھ سے کم نہیں ہے۔اِس کے دیکھتے یہ مجموعہ ایک وسیع خرمن میں سے ایک خوشہ کا مصداق ہے یہ بھی قدردانان شادؔ کے ہاتھوں تک جس دشواری سے پہونچا ہے اس کا دلچسپ خلاصہ یہ ہے کہ سب سے بڑی مصیبت یہ تھی کہ مصنف

نے نظر ثانی کرانے اور نیز حک و اصلاح کے اُن اشارات سے مصنف نے نظر در نظر کے بعد کاغذوں کے حواشی اور اطراف میں وقتاً فوقتاً بنائے تھے مرتب و جامع اصحاب نے اُن سے پہلوتہی کی اور یہ اصحاب اُس کی یہ معذرت پیش کرتے ھیں کہ نظر ثانی اور اشارات و اصلاحات کو سمجھنے کے لئے یہ مجموعہ سپرد کیا جاتا تو ھماری محنت بھی اُسی طرح دریا برد ھوجاتی جس طرح اِس سے پہلے مصنف کی کئی محنتیں غایت احطیات کی بنا پر غارت ھوچکی ھیں - اِس سے یہ اندازہ ھوتا ھے کہ مصنف کی راے اور احتیاط کے خلاف یہ مجموعہ شائع ھوا ھے - مگر ھم حیران ھیں کہ اِسے غایت احتیاط کہیں یا اِن بزرگوں کی کمزوری اور یہ خوف کہ کہیں ھدف اعتراض و نشانۂ ملامت نہ بنیں - حالانکہ یہ نہیں جانتے کہ انسان خطا و نسیان سے مرکب ھے احتیاط کی بھی حد ھوتی ھے - اھل ذوق اب لفظی فروگذاشتوں سے زیادہ تخیل علو مذاق اور جذبات کو دیکھتے ھیں - یہ وہ زمانہ نہیں کہ اِس سے ڈرا جائے - بہرحال جو حضرات جناب شاد کے قدردان - عمدہ تغزل - اعلیٰ مذاق - شاعری کے دلدادہ ھیں - وہ اِس مجموعہ کو مغتنم سمجھیں کیونکہ اگر اس کی طباعت و اشاعت خود جناب شاد کے دست اختیار میں ھوتی تو شاید ھماری آنکھیں اِس سے ھمیشہ محروم رھتیں - اِس باب میں جناب شاد کی نیت بھی (خدا نخواستہ) بدلی ھوئی معلوم ھوتی ھے جس کا شاھد خود اُن کا یہ شعر ھے —

دفتر شعر کو یوں رکھتا ھوں اب بستوں میں
جیسے میت کو بہ حسرت کوئی کفناتا ھے

جناب شاد کی عمر اِس وقت اَسی (۸۰) سال کی ھے اور غالباً مولانا ندوی کا یہ خیال صحیح ھو کہ اب جناب شاد کا کوئی ھم عصر شاید نہ نکل سکے - اِس لحاظ سے بھی کلام شاد قدر و عزت کا مستحق ھے - لیکن اصل قدر اِس وجہ سے ھونا چاھئے کہ اِس میں شعر کی تقریباً کل خوبیاں پائی جاتی ھیں - اعلیٰ مذاق -

شاعری-مضامین عالیہ-خیالات کی لطافت-بیان میں سنجیدگی و متانت اور ساتھہ ھی الفاظ کی صحت-محاورات کا تتبع-فارسی ترکیبوں کا اعتدال کے ساتھہ استعمال ھے اور بقول مولانا ندوی اِس لفظی حیثیت سے شاد کو لکھنؤ کا اور معنوی حیثیت سے دلی کا شاعر کہیں تو بجا ھے-اُن کے کلام میں قدیم دلی کا رنگ سخن بہت زیادہ نمایاں ھے-بندش-ترکیب اور زبان قدیم شعرا کی سی معلوم هوتی ھے-دلی کی ویرانی کے بعد لکھنؤ اور دوسرا مرکز عظیم آباد ھی تھا اس دور میں اچھے اچھے اُردو کے شاعر پیدا هوئے-مگر اب شاد ھی کی ذات رہ گئی ھے-جناب شاد ابتدا میں فریاد عظیم آبادی کے شاگرد تھے پھر مونس لکھنؤی کے حلقۂ تلامذہ میں داخل هوئے-لیکن مقدمہ نگار صاحب نے خدا جانے اِس حقیقت کو کیوں پردۂ خفا میں رکھنا پسند کیا حالانکہ جناب شاد نے اکثر مقطعوں میں مونس کو اِس طرح یاد بھی کیا ھے-مثلاً فرماتے ھیں—

آنیس سے بھی سخن سنج نے ثنا کی شاد
یہ چند شعر جو مونس کو هم سنانے لگے

مجھی پہ کیا ھے عدو تک ھے معترف بخدا
زبان حضرت مونس کا شاد کیا کہنا

همیشہ مونس مرحوم یاد آئیں گے شاد
نہ دل سے محو یہ انداز گفتگو هوگا

گو بقول مقدمہ نگار یہ دیوان شاد کے بلا انتخاب اور نا مرتب کلام کا ایک مختصر مجموعہ ھے اُن کی شاعری کا مکمل نمونہ نہیں-پھر بھی اس میں اهل ذوق کے لئے بہت کچھہ سامان دلچسپی موجود ھے-میر کے زمانہ کا انداز خصوصاً بہت پایا جاتا ھے-مثلاً—

موج و مجنوں کی جدائی ھے بہت شاق مجھے
زندگی کرنے سے بھی شاد دم اُکتاتا ھے

زندگی کرنا میر ھی کے زمانہ کا محاورہ ھے-اب زندگی گزارنا بولتے ھیں اور مثلاً—

اِسی کوچہ میں رھبر کو بھی رستہ سدہ نہیں ملتا
خودی اے شاد انساں کی سمجھہ کا واک ھوتی ھے

سدہ کا استعمال میر ھی کے زمانہ کا سا ھے بہت سے ایسے الفاظ بھی ملتے ھیں جن کو اب بعض تنگ نظر مقامی شعراء دلی و لکھنؤ نے ترک کرد یا ھے اور اُن کے ترک پر بڑے فخرومباہات کا اظہار کیاجاتا ھے-جیسے پر بمعنے مگر اور اُس کا مخفف پہ-یاں-واں-تلک-وغیرہ-طباعت کی بھی بعض فاش غلطیاں محسوس ھوتی ھیں مثلاً—

اے ازلی الوجود اے ابدی البقا
بےادبانہ نہ چل حلقۂ عبدیت میں آ

مصرعۂ ثانیہ میں عبدیت کسی صورت نہیں کھپتا-مصرعہ غیر موزوں ھوا جاتا ھے-غالباً (حلقۂ عبدی) ھوگا-بعض اور بھی قابل ذکر مقام نظر آتے ھیں-مثلاً—

ادق مضموں کہاں اور اُس میں یہ لفظوں کی شیرینی
نکالا جوے شیر اِس کوہ سے اے شاد کیا کہنا

اس شعر میں جوے شیر کو مذکر کہا ھے-حالانکہ "جو" مونث ھے-ممکن ھے سہو کتابت و طباعت ھو-ایک جگہ تلچھٹ کو ترچھٹ کہا اور مذکر باندھا ھے-یہاں کتابت وطباعت کی غلطی نہیں کہہ سکتے-شعر یہ ھے—

زلال پیرمغاں دے چکا تھا رندوں کو
جو تہ نشیں تھا وہ ترچھٹ مجھے نچوڑ دیا

صحیح اور فصیح تلچھٹ ھی ھے-تل (تلا-تلی) اور چھٹ (چھٹا ھوا-چھٹی ھوئی) سے مرکب ھے-ممکن ھے ترچھٹ بہار کی یا قدیم زبان ھو-کیونکہ بعض الفاظ میں ل کا ر سے بدل ھوجاتا ھے اور بول چال میں عوام اکثر الفاظ میں ل کی جگہ ر

بول جاتے ہیں اور ممکن ہے کہ کسی نے مذکر بھی کہا ہو مگر اب بالاتفاق یہ لفظ تلچھٹ اور مونث ہے - ایک جگہ مسالہ کو مصالح کہا ہے - گو اصل مصالح ہے مگر بول چال میں مسالہ ہی ہے - کوئی مصالح - مصالحہ نہیں کہتا - شعر یہ ہے —

شکستہ جام ہمیشہ شکستہ ہے ناصح
ہزار تونے مصالح لگا کے جوڑدیا

اِسی قسم کے بعض اور الفاظ ہیں جیسے

جوکچھہ سہایا آپ نے دل اُس کو سہ گیا
ہے یہ کہ مرنے والے کی طینت میں شر نہ تھا

غم فراق میں اے آسماں نہیں موقوف
وہ جو سہائیں غریبوں کو ہر طرح سہنا

سہانا - سہنا کا مصدر متعدی زبانوں پر نہیں ہے - قدیم بول چال میں شاید ہو مگر یہ بہت اچھا لفظ اور بول چال میں لانے کے قابل ہے - ایک شعر ہے -

وہ زلفیں بے محابا آئینے سے جھک کے کہتی ہیں
کہاں دیکھا ابھی اے آنکھہ والے پیچ و خم میرا

کہاں دیکھا ہے - محاورہ ہے - ضرورت شعری نے (ہے) کے حذف پر مجبور کیا -

اور ایک شعر ہے —

ہوا سرسبز اُمیدوں کا نہ اپنی جب کوئی دانہ
بہت رویا کیا منہ دیکھہ کر اُبرکرم میرا

راقم کا خیال ہے کہ دوسرے مصرعہ میں بہت رویا - چاہئیے - یا - دیر تک رویا کیا - ایک مصرعہ میں لفظ (ابھی) مشدد معلوم ہوتا ہے حالانکہ دوسرے مصرعہ میں غیر مشدد ہے —

آکے گلی میں دو قدم ابھی بڑھے تھے اہل شوق
بھول گیا ابھی سے دم نالۂ عرش تاز کا

اول مصرعہ میں ابھی کو غیر مشدد پڑھئے تو موزونیت میں ضرور فرق آتا ہے-ممکن ہے عروض نے اسے جائز رکھا ہو-اور کسی زحاف سے تعبیر کردیا ہو مگر خوشگوار نہیں بلکہ ناگوار ہے-ایک شعر میں ردیف ٹھیک نہیں بیٹھتی اور یہ وہ نقص ہے جسے ہمارے قدیم خیال کے شاعر گناہ کبیرہ اور بہت مذموم جانتے ہیں-شعر یہ ہے—

بڑھائے جس نے قدم حد سے جانب دنیا

تمام عمر گرفتار مکر و کید ہوا

دوسرے مصرعہ میں ہوا خلاف محاورہ ہے-تمام عمر کو گرفتار ہوا- یاتمام عمر گرفتار رہا اہل زبان بولتے ہیں-قدردانان شاد شاید اِسے نہ مانیں-

دماغ عرش پہ اپنا پہونچ گیا ساقی

کہاں سے اِن کتی نظروں میں یہ اثر آیا

کٹیلی نظر-کٹیلی نظریں توالبتہ سنا اور دیکھاہے-مگرکتی نظریں-نظرسے نہیں گزریں-شاید بہار میں بولتے ہوں یا بہت قدیم زبان ہو جو اب بالکل متروک ہے—

شاد کے آگے بھلا کیا ذکر یار

نام اِدھر آیا کہ اُس نے رودیا

اُس نے رودیا-میں نے رودیا-یہ نے کا استعمال اگرچہ جائز رکھا گیا ہے- مگر قباحت سے خالی نہیں-کانوں کو ناگوار ہے-میں رودیا-وہ رودیا-اچھا معلوم ہوتا ہے-اور سنئے—

رند پھیلائے ہیں چلو کو تکلف کیسا

ساقیا ڈھال بھی دے جام خدا ساز آیا

چلوکے ساتھ پھیلانا-خلاف محاورہ معلوم ہوتاہے-ڈھالنا بھی نامانوس اور غالباً قدیم زبان ہے-اِن معمولی مسامحات سے قطع نظر کیجئے-تو کلام شادمیں جیسا کہ ہم اُوپر لکھہ چکے ہیں بیش از بیش سامان دل چسپی ملتاہے-چند اخلاق

و عرفان کے نمونے ملاحظہ ہوں—

جہاں ہے مکتب حیرت سبق ہے چپ رہنا
بڑا گناہ یہاں ہے الف سے بے کہنا

موج فنا مٹا نہ دے نام و نشاں نمود کا
دیکھ حباب کی طرح شوق نہ کر نمود کا

دیوان اس حقیقت نما مطلع سے شروع ہوتا ہے —

کلید اشعار دلکش قفل معنی ذہن انساں کا
انہیں شعروں سے کُھل جاتا ہے ذوق ارباب عرفاں کا

قومی و ملی رنگ میں ڈوبے ہوئے۔اخلاق و دعوت عمل کی تعلیم دینے والے اشعار بھی ہیں جن کی طرف زمانہ شعرا کو لایا اور لا رہا ہے۔فرماتے ہیں—

جان صداقت پہ دے صدق ہے فطرت تری
زیست کی پروا نہ کر زیست ہے دام فنا

مورد آفات رہ ظلم کا تابع نہ بن
بھول نہ بھولے سے بھی واقعۂ کربلا

گلشن حق الیقین سامنے آنکھوں کے ہے
چہرے سے اپنے ہٹا پردۂ بیم و رجا

خاک کے پتلے سنبھل خاک کا پتلا نہ بن
تیری تو مسند ہے عرش خاک کہا تو کہا

اِس غزل کے اکثر شعر درس حقیقت اور دعوت عمل ہیں اور فرماتے ہیں—

تربت پہ بلائیے گا اُن کو یہ خام خیالی ہے دل کی
وہ گھر میں کوے کا کیا جا کر جس نے سر میداں کچھ نہ کیا

:o:

اُلٹا نہ عراق و شام و عجم۔دنیا نہ ہوئی ویراں تو کیا
جل تھل نہ لہو سے تونے بھرا تو خون مسلماں کچھہ نہ کیا

———:o:———

نہ کر یہ دھیان کہ معدوم محض تو ہوگا
برنگ سبزۂ نوخیز پھر نمو ہوگا

یہ پوری غزل اخلاق و عرفان کی عمدہ تصویر ہے —

———:o:———

سبق السعی منی کا بھلایا شاد کیوں تم نے
گلہ کس کا تمہیں خود پائے خواب آلود نے مارا

———:o:———

زمانہ جن کو مٹا چکا ہے مٹائے جاتا ہے آج تک بھی
جئیں گے اک روز مرکے پھر وہ انہیں کی ہمت عیاں رہے گی

———:o:———

ایک آدہ شعر لسان العصر اکبر الہ آبادی مرحوم کے رنگ میں بھی نظر آتا ہے مثلاًایک مقطع ہے—

نہ پوچھو مصلحین قوم کی اے شاد حالت کو
کھیتی میں رزولیشن کی ہے بھرمار چندا ہے

مگر بات یہ ہے کہ جناب شاد کا یہ رنگ ہی نہیں ہے۔جناب شاد نے شعراء قدیم کی سنت جاریہ کے موافق ناصح و واعظ کی بھی خبر لی ہے۔بادہ و ساقی کو بھی سراہا ہے۔مگر بڑی خوبی یہ ہے کہ سنجیدگی و متانت کہیں ہاتھہ سے نہیں گئی ہے اور بحیثیت مجموعی کلام شاد میں بہت کم ایسے شعر ہیں جو نظر انتخاب میں نظری ہوسکیں۔مذاق کا ابتذال شروع سے آخر تک کہیں نظر نہیں آتا۔اب چند تغزل کے نمونے ملاحظہ ہوں—

اب بھی اک عمر پہ جینے کا نہ انداز آیا
زندگی چھوڑ دے پیچھا میرا میں باز آیا

مغبچے ہیں متحیر متبسم ساقی
پینے والے تجھے پینے کا نہ انداز آیا

———:o:———

جب اہل ہوش کہتے ہیں افسانہ آپ کا
ہنستا ہے دیکھہ دیکھہ کے دیوانہ آپ کا

اُبھر اُبھر کے یہ کہتی ہے دل کی بیتابی
برا ہے بات کا جی میں بہت لئے رہنا

اِس غزل میں اکثر شعر بہت پاکیزہ نکالے ہیں—

خدا کرے کہ اب اُس کا عوض ہو دلکو نصیب
جہاں میں جتنے مصیبت کے دن تھے بھر آیا

ریا بھرے ہوئے دل کا نشاں ہے ماتھے پر
کہاں کا داغ کہاں دفعتاً اُبھر آیا

-:o:-

آخر میں ہم جناب شاد کے ایک نہایت اطیف مستزاد سے چند شعر لکھہ کر ناظرین سے داد طلب ہیں —

دل تو بدنام ہے خود شاد عبث اُس کا گلا — کہتے آتی ہے حیا
یہ اُمیدیں یہ تمنا جنھیں برسوں پالا — یہ کب اپنی ہیں بھلا
وہ تری کج روشی کج کلہی کینہ وری — دلبری عشوہ گری
کون غش کھا کے گرا کون سر راہ گرا — پھر کے دیکھا نہ ذرا
بان مارا تری آنکھوں نے جو کی پھر کے نگاہ — نہ ملی دل کو پناہ
یار کیا قہر ہے چلتا ہوا جادو تیرا — لاکھہ روکا نہ رکا

رت پھری ساری ہری ڈالوں میں پھوٹی کوپل | آگئے پھول میں پھل
اک یہ اُجڑا ہوا دل ہے کہ نہ پھولا نہ پھلا | اور سوکھا ہی کیا
کالی کالی وہ گھٹائیں وہ پپیہوں کی پکار | دھیمی دھیمی وہ پھوار
اب کے ساون بھی ہمارا یونہیں رونے میں کٹا | کیا کہیں چپ کے سوا
رس بھری ہائے وہ آنکھیں تری کالی کالی | بے پئے متوالی
سانولا رنگ نمک ریز جراحات جفا | اُف کہاں دھیان گیا
آنکھیں روئی ہوئی آواز ہے بھرائی ہوئی | باتیں شرمائی ہوی
اِس سے تو اور کسی بھید کا ملتا ہے پتا | شاد قسمیں تو نہ کھا

سبحان اللہ کیا متزاد ہے۔ ہم ناظرین سے سفارش کرتے ہیں کہ کلام شاد ضرور خریدیں اور پڑھیں۔ لکھائی چھپائی معمولی ہے اور قیمت ۲ روپیہ بلحاظ حجم زیادہ ہے ــــ

(ملنے کا پتہ۔ انجمن ترقی اُردو پٹنہ عظیم آباد)

(مع)

سیر المصنفین

(جلد اول)

اس کتاب کے مولف مولوی محمد یحیی صاحب تنہا بی۔اے ہیں۔اس میں اُنھوں نے اُردو نثاروں کے حالات اور اُن کی تالیف و تصنیف سے بحث کی ہے۔ شعرا کے تذکرے ہماری زبان میں بہت سے لکھے گئے ہیں لیکن اب تک اُن ادیبوں کی طرف کسی نے توجہ نہیں کی تھی جن کا کلام نثر میں ہے۔جناب تنہا صاحب نے یہ بہت اچھا کام کیا ہے اور ایک بڑی ضرورت کو پورا کیا ہے۔یہ پہلی جلد ہے اور اس میں انھوں نے تین دور قائم کئے ہیں۔پہلا دور سنہ ۱۷۹۷ء سے سنہ ۱۸۳۶ء

تک-دوسرا دور سنہ ۱۸۳۶ع سے سنہ ۱۸۵۷ع تک اور تیسرا دور سنہ ۱۸۵۷ع سے سنہ ۱۹۱۴ع تک اور چوتھا دور سنہ ۱۹۱۴ع سے آغاز ہوتا ہے-اِس جلد میں صرف پہلے دو دور ہیں-قابل مولف کی راے میں نثر کا دور گویا کلکتے کے فورٹ ولیم کالج کے قیام سے شروع ہوا ہے-اس سے قبل کی نثر کا بھی سرسری سا ذکر کیا ہے یعنے صرف مرزا رفیع سودا اور اُن سے قبل فضلی کی نثر کا نمونہ دیا ہے-اس کے بعد فورٹ ولیم کالج کے مؤلفوں اور مترجموں کا ذکر شروع ہو جاتا ہے اور انہیں کے ساتھہ میر انشاالله خاں-مولوی شاہ رفیع الدین اور شاہ عبدالقادر اور مولوی اسمعیل شہید کی نثروں کے نمونے بھی درج ہیں-اس دور کے مصنفوں کے حالات بہت کم ملے ہیں-دوسرے دور میں فقیر محمد خاں گویا-مرزا رجب علی بیگ سرور-مرزا غالب-ماسٹر رام چندر-مولانا غلام امام شہید-خان بہادر منشی غلام غوث بے خبر-منشی امیر احمد مینائی کے حالات اور اُن کے کلام کے نمونے ہیں —

کتاب کے شروع میں تمہید کے نام سے تقریباً ایک جز کا ایک مضمون ہے جس میں یہ بحث کی ہے کہ اُردو ہندوستان کی مشترکہ زبان ہے-اس کے بعد رسم الخط اور اُردو لٹریچر کا ذکر کیا ہے-اس کے بعد اصل کتاب شروع ہوتی ہے ابتدا میں اُردو کی پیدائش پر چند صفحے لکھے ہیں اور پھر پہلا دور شروع ہو جاتا ہے —

پہلے دور کا لکھنا بہت مشکل کام ہے-اس کے لئے موجودہ کتابوں میں سامان کم ملتا ہے جو کچھہ آب حیات یا دوسری کتابوں اور رسالوں میں ملا وہ لکھہ دیا ہے ذاتی تحقیق بہت کم ہے-اس کے لئے بہت محنت اور وقت درکار تھا-ورنہ اس قدر جلد ایسی کتاب تیار نہیں ہو سکتی تھی-قابل مولف نے اگرچہ بعض مقامات میں حوالے دئیے ہیں اور کہیں کہیں سرسری طور سے ماخذ کا ذکر کر دیا ہے لیکن بعض جگہ اُن سے فرو گزاشت ہو گئی ہیں-کئی مقام اس کتاب

میں ایسے نظر آئے جو دوسروں سے نقل یا اخذ کئے ھیں مگر مطلق حوالہ نہیں دیا مثلاً فورٹ ولیم کالج کے مولفین اور تالیفات کا اکثر حصہ "رسالہ اُردو" کے مضمون سے منقول یا ماخوذ ھے مگر کہیں اس کا ذکر نہیں کیا-دوسروں کی تحقیق سے فائدہ اُٹھانا بیشک جائز ھے لیکن اُن کی محنت کو تسلیم نہ کرنا ظلم ھے —

چونکہ بعض حصوں کی بنیاد آب حیات پر ھے اس لئے کہیں کہیں وھی قصے دھرا دئے ھیں جو مولوی محمد حسین آزاد مرحوم نے اپنی کتاب میں لکھے ھیں-حالانکہ اُن کی صحت میں بہت کچھہ شبہ ھے یہی حالت بعض اور منقولی حصوں کی ھے جن کے بعض بیانات بعد تحقیق سے غلط ثابت ھوئے ھیں لیکن قابل مولف نے اِتنی تکلیف گوارا نہیں کی کہ بعد تلاش اس کی تصحیح کر دیتے۔ دوسروں کی عبارت بجنسہ نقل کر دی ھے —

بہرحال کتاب اور مولف کی محنت قابل قدر ھے-جو کچھہ قابل مولف نے اس میں جمع کر دیا ھے اور کوشش سے جو سامان فراھم کیا ھے وہ بہت غنیمت ھے اور چونکہ اُردو نثر نگاروں کے حالات میں یہ پہلی کتاب ھے اِس لئے امید ھے کہ اُردو ادب کے شایق ضرور اس کی قدر کریں گے —

لکھائی چھپائی اور کاغذ اچھا ھے-تعداد صفحات ۲۲۴-دو روپئے میں منیجر دارالاشاعت غازی آباد (مہا اک متحدہ آگرہ) سے مل سکتی ھے —

نقش فرنگ

(اقصاے مغرب کی سیر کے دلاویز تاثرات)

قاضی عبدالغفار صاحب کے نام سے کون واقف نہیں-جمہور و صباح کے کالموں میں اُن کے قلم نے جو جو گلفشانیاں کی ھیں اُس کا لطف اِس کتاب میں آگیا۔

سابق وزیر اعظم انگلستان-مسٹر لائڈ جارج کے بلاوے پر سنٹرل خلافت کمیٹی کی طرف سے خلافت کے معاملات پر گفتگو کرنے کے لئے جو چند صاحب انگلستان تشریف لے گئے تھے اِن میں قاضی صاحب بھی تھے۔ قاضی صاحب اِس وفد کے سکریٹری تھے اِن ایام میں اُنھوں نے لندن اور انگلستان کے مقامات کے علاوہ پیرس-روما اور سوٹزرلینڈ کی بھی سیاحت فرمائی-یہ کوئی معمولی سفرنامہ نہیں ھے بلکہ یورپ میں جاکر جوکچھہ انھوں نے دیکھا اور اُس سے جوخیالات اُن کے دل میں پیدا ھوئے اُن کی تصویر ھے جس میں اُن کے قلم نے طرح طرح کی گلکاریاں کی ھیں۔ یورپ کے شھروں میں پیرس اور یورپ کی اقوام میں فرانسیسی اُنھیں سب سے زیادہ پسند ھیں-وہ فرانسیسیوں کی بے تکلفی-اخلاق اور زندہ دلی کے بہت مداح ھیں-پہلے روز جب وہ بمبئی سے روانہ ھوئے ھیں تو جہاز میں چند فرنگی خاتونوں کے لباس-اُن کی خودآرائیوں اور کرشموں کو دیکھہ کر اس قدر طیش میں آگئے تھے کہ گویا آپے سے باھر ھوگئے تھے (اور جسے پڑھکر مولوی عبدالماجد صاحب کو بھی جلال آگیا تھا) پیرس کی رعنائیوں اور دلکشیوں کے سامنے وہ سب بھول جاتے ھیں اور بے اختیار اُن کی داد دینے لگتے ھیں—

وزیر اعظم سے وفد کی ملاقات بہت ھی پر لطف لکھی ھے-روما پہنچ کر سلطنت روما کی تاریخ انھیں یاد آجاتی ھے اور وھاں کی بعض قدیم عمارتوں اور آثار کو دیکھہ کر بعض تاریخی مناظر اس خوبی سے لکھے ھیں کہ آنکھوں کے سامنے سماں سا کھیچ جاتا ھے-اسی طرح وفد کے حالات-ترکوں کی ملاقات-اتحاد اسلامی کے متعلق اپنے ذاتی حالات-دعوتوں کے ذکر-معاشرت کی کیفیت عجب انداز سے بیاں کی ھیں-اور شروع سے آخر تک ھر بیان جوش سے لبریز ھے—

کتاب دلچسپ اور پڑھنے کے قابل ھے اور بہت اچھی چھپی ھے-دارالاشاعت پنجاب سے ایک روپیہ چارآنہ میں مل سکتی ھے—

نور اللغات

ابتدا میں اُردو لغت کی کتابیں اهل-یورپ اور خاص کر انگریزوں نے لکھیں-جن میں ڈاکٹر هنٹر-ڈاکٹر هیرس-ڈاکٹر گلکرسٹ-ڈاکٹر فوربس-جان شکسپیر-ڈاکٹر فیلن اور پایٹس کی زیادہ مشهور رهیں-اهل زبان نے اُس طرف بہت بعد میں توجہ کی اور حیرت کی بات هے کہ اهل زبان کی کتابیں اکثر ناقص اور ناقابل التفات هیں-البتہ مولوی سید احمد مرحوم کی کتاب فرهنگ آصفیہ ایسی هے جو مکمل اور مستند کہی جاسکتی هے اگرچہ وہ بھی غلطیوں سے پاک نہیں اور بہت کچھہ اصلاح طلب هے-لیکن اِس میں شک نہیں کہ مرحوم نے اُردو زبان کی بہت بڑی خدمت انجام دی اور اِس سے ملک کو بے حد فائدہ پہنچا-اُردو زبان کو ابھی صحیح مستند اور مکمل لغت کی کتابوں کی شدید ضرورت هے-کوئی زبان اِس سے بے نیاز نہیں هوسکتی اور جس زبان میں اعلیٰ درجہ کی محققانہ لغت کی کتابیں نہیں هیں وہ زبان مہذب نہیں کہلا سکتی-همیں اِس سے حقیقی مسرت هوئی کہ مولوی نورالحسن صاحب نیر ایک مدت سے اُردو لغت کی ترتیب اور تکمیل میں مصروف هیں اور اِس وقت اُس کا پہلا حصہ جس میں پہلے دو حرف الف اور بے هیں چھپ کر شایع هوگیا هے-اِس میں هر لفظ پر تفصیل سے بحث کی هے-چنانچہ یہ حصہ بڑی تقطیع پر ۷۴۱ صفحے پر هے-مولف کی محنت اور تحقیق قابل داد هے-جہاں تک ممکن هوا هے هر لفظ کی اصل بھی ساتھہ ساتھہ لکھہ دی هے-هماری لغت کی کتابوں میں هندی الفاظ کی طرف سے عموماً بے توجہی کی گئی هے لیکن اِس لغت میں اکثر هندی الفاظ کا مادہ بتا دیا گیا هے اور هر لفظ کے تحت میں اِس کے محاورات تفصیل کے ساتھہ دئے هیں اور هر لفظ اور هر محاورے کے لئے مستند شعرا اور اهل زبان کے کلام سے سند بھی بیان کردی هے-اِس میں همارے لغت نویسوں نے بہت افراط سے

کام لیا ھے-ھر لفظ کے لئے سند میں شعر کی ضرورت نہیں ھے-اِس لغت میں بھی اس کی پیروی کی گئی ھے-مثلاً برؔ (برگد) کے لئے انشا کے شعر کی ضرورت نہ تھی—

ھمارے لغت نویسوں نے صرف تحریری زبان کو پیش نظر رکھا ھے اور اِس کی وجہ ظاھر ھے کہ بول چال کی زبان ھر حصے میں اِس قدر مختلف ھے کہ ھر مقام کے الفاظ لغت میں لکھنا ممکن نہیں-لیکن کیا یہ درست نہو گا کہ اگر کوئی لفظ کسی مقام پر ایسا بولا جاتا ھے جس کا مترادف دلی-لکھنؤ کی زبان میں نہیں پایا جاتا-تو اُسے لغت میں داخل کر لیا جائے؟ یہ امر اُن صاحبوں کے لئے قابل غور ھے جو اپنی زبان کی لغت لکھنا چاھتے ھیں—

جب دو یا دو سے زائد الفاظ مل کر ایسی ترتیب سے استعمال ھوں جو اھل زبان بولتے ھیں اور اِس میں کسی قیاس یا تغیر و تبدل کو دخل نہ ھو یا جب یہ ایسے معنے پیدا کریں جو حقیقی معنوں سے الگ ھوں تو وہ محاورہ کہلاتا ھے-لیکن جب یہ عام یا حقیقی معنوں میں استعمال ھوں تو وہ محاورہ نہیں کہلاتا-مثلاً فاضل مولف نے بڑا کی تحت میں بڑا نکیلا ھے-بڑا ھی سخت ھے-بڑا تقدیر والا ھے-وغیرہ جو محاورے لکھے ھیں وہ بالکل غیر ضروری معلوم ھوتے ھیں-یہاں بڑا بطور صفت یا تمیز کے نکیلا-سخت اور تقدیر والا کے ساتھ عام معنوں میں استعمال ھوا ھے اور کوئی خاص معنے پیدا نہیں کرتا-ورنہ اگر اِس قسم کے جملے اور الفاظ لکھنے کا التزام کیا جائے تو کتاب اِس قدر ضخیم ھوجائے گی کہ اُس کے لئے بیسیوں مجلدات کی ضرورت ھوگی-اِسی طرح آپ کی شکایت میرے سر آنکھوں پر-آپ کا منہ ھے وغیرہ-جو محاورے لکھے گئے ھیں-اُن کے متعلق یہ امر قابل غور ھے کہ آیا محاورے آپ کے تحت میں آنے چاھئیں یا نہیں کیونکہ یہ محاورے صرف "آپ" سے مخصوص نہیں ھیں بلکہ دوسری ضمیروں اور اِسموں کے ساتھ بھی استعمال ھوتے ھیں-ھماری راے

میں پہلا محاورہ ''سر آنکھوں'' اور دوسرا ''منہ'' کے تحت میں آنا چاھئے —

هندی یا کسی دوسری زبان کا غیر مانوس لفظ استعمال کیا جاتا ہے تو اهل زبان ناک بھوں چڑھاتے هیں اور اُسے جائز نہیں خیال کرتے - لیکن عربی فارسی اِس قید سے مستثنیٰ معلوم ہوتی ہے - مصنفین ثقیل سے ثقیل اور غیر مانوس عربی فارسی کے لفظ بے تکلف اپنی تحریروں میں استعمال کرجاتے هیں اور شعرا تو قصائد میں بالکل آزاد هیں - اِس نظر سے اگر عربی فارسی کے لفظ اُردو لغت کی کتابوں میں داخل کئے جائیں تو عربی فارسی کے لغات نصف سے زیادہ اردو کی لغت میں آجائیں گے - مثال کے طور پر لفظ ''استتار'' ہے جو فاضل مولف نے اِس لغت میں لکھا ہے اور سند میں ''نوازش'' کا شعر تحریر فرمایا ہے - یہ لفظ اردو زبان کے لئے بالکل غیر مانوس ہے اور هم نے اردو تحریروں میں کہیں اِس کا استعمال نہیں دیکھا اور اُردو تو اُردو عربی فارسی میں بھی شاذ ھی استعمال ہوتا ہے - نوازش کا شعر اس کے لئے سند نہیں ہوسکتا - ہماری رائے میں اردو لغت میں عربی فارسی کے صرف وہی الفاظ داخل کرنے چاھئیں جو یا تو اُردو زبان میں خاص معنوں میں استعمال ہوتے هیں یا عام بول چال اور تحریر میں آتے هیں - خاص الفاظ کے لئے عربی فارسی کی لغت کی کتابیں موجود هیں —

کتاب کے دیباچے میں لایق مولف نے متروکات کی ایک فہرست دی ہے - متروکات کا مسئلہ بھی بہت ٹیڑھا ہوگیا ہے - بعض اساتذہ نے بعض الفاظ متروک کردئے هیں اور اپنے کلام میں استعمال نہیں کئے - ان کے شاگردوں نے بھی اِس کی تقلید کی اور اِس طرح متروکات کی تعداد بڑھتی گئی - ہماری رائے میں کسی شخص کو یہ حق حاصل نہیں ہے کہ وہ یہ کہے کہ فلاں لفظ آج سے متروک ہے - الفاظ کی حالت بھی جانداروں کی سی ہے - بڑھتے گھٹتے هیں - صورت بدلتے هیں - حیثیت میں فرق آجاتا ہے - بعض نام پیدا کرتے هیں بعض گمنام ہوجاتے هیں رذیل سے شریف اور شریف سے رذیل ہوجاتے هیں اور بعض ایک مدت کے بعد مرجاتے هیں

لیکن دانستہ گلا گھونٹنے کا حق کسی کو حاصل نہیں۔ تعجب ہے کہ اِس کی ابتدا شعرا کی طرف سے ہوئی۔ حالانکہ شاعر ہی کو اِن کی زیادہ ضرورت ہوتی ہے اور بعض اوقات یہ الفاظ کلام میں حسن پیدا کردیتے ہیں۔ مثلاً پر (لیکن کے معنوں میں) متروک بتایا جاتا ہے۔ نثر میں متروک ہو تو ہو ایک کوئی وجہ نہیں کہ نظم میں متروک کردیا جائے۔ کس قدر مختصر اور خوبصورت لفظ ہے اور ہر لحاظ سے لیکن سے بہتر ہے۔ شاعر اِسے بلا تکلف استعمال کرسکتا ہے۔ بھانا بھی متروک ہے۔ حالانکہ اِس کے بجائے اُردو میں کوئی لفظ نہیں۔ پسند آنا اور پسند کرنا میں اختیار اور ارادہ ظاہر ہوتا ہے اور "بھانا" وہاں استعمال ہوتا ہے جو کوئی شے بغیر ارادہ و اختیار کے خود بخود دل کو اچھی معلوم ہوتی ہے۔ کہتے ہیں کہ "پرے" کا لفظ بھی متروک ہے۔ لیکن جب یہ عرض کیا جاتا ہے کہ اِس کی بجائے کیا استعمال کیا جائے تو ارشاد ہوتا ہے کہ "اُدھر" مگر پرے اور اُدھر کے معنوں میں بہت فرق ہے۔ اُدھر سمت کو بتاتا ہے اور پرے بعد کا اظہار کرتا ہے۔ "مت" بھی متروک سمجھا گیا ہے۔ حالانکہ اِس کے معنے خاص ہیں "نہ" یہ کام نہیں دے سکتا "نہ" افعال کی عام نفی کے لئے ہے اور "مت" نہی کے واسطے مخصوص ہے۔ اِسی طرح بہت سے لفظ مثلاً خاطر۔ سو۔ تو۔ ناؤ۔ منہ دجانا۔ بھلا (بمعنے اچھا) کا نتھ رغیرہ وغیرہ متروک قرار دئے گئے ہیں۔ ان الفاظ کے متروک ہونے کی کوئی اور وجہ نہیں معلوم ہوئی سوائے اِس کے کہ لکھنؤ کے بعض شعرا نے اِن کا لکھنا ترک کردیا۔ اور ظاہر ہے کہ یہ کوئی معقول وجہ نہیں ہوسکتی۔ یہ بحث طویل ہے یہاں اِس کی گنجائش نہیں۔ انشاالله آیندہ کسی وقت اِس پر علیحدہ بحث کی جائے گی—

الفاظ کے اعراب کا جو طریقہ لائق مولف نے اختیار کیا ہے اُس میں کسیقدر تکلف اور دقت ہے۔ آج کل جو طریقہ رائج ہوگیا ہے وہ زیادہ آسان ہے—

ہم فاضل مولف کو اِس کوشش اور محنت پر جو انھوں نے اِس کتاب کی تالیف میں برداشت کی ہے مبارک باد دیتے ہیں۔ اِس میں شبہ نہیں کہ یہ کتاب

موجودہ لغت کی کتابوں میں خاص امتیاز رکھتی ہے اور بعض وجوہ سے سب میں بہتر ہے۔ہمیں اُمید ہے کہ اِس کا کام جاری رہیگا اور جلد تکمیل کو پہنچے گی۔ ایسی کتابوں کی ملک کو بہت ضرورت ہے—

مولف سے نیر پریس پاتانالہ لکھنو سے مل سکتی ہے۔

حکایات پنجاب

یہ پندرہ کہانیوں کا مجموعہ ہے جو سید عبدالقادر صاحب ایم۔اے پروفیسر اسلامیہ کالج۔لاہور نے انگریزی سے ترجمہ کی ہیں۔کہانیاں اُسی قسم کی ہیں جو کبھی بڑی بوڑھیاں بچوں کو سنایا کرتی تھیں۔افسوس کہ اب یہ عزیز رسم اُٹھتی جاتی ہے یا اُٹھ گئی ہے۔اِس کی قائم مقام اب اِس قسم کی کتابیں ہوں گی۔کہانیاں دلچسپ ہیں اور لڑکے لڑکیوں کے پڑھنے کے قابل ہیں۔ترجمہ بھی پروفیسر صاحب نے سلیس زبان میں اچھا کیا ہے۔البتہ دو ایک جگہ بعض الفاظ یا ترکیبیں اُن کے قلم سے محاورے کے خلاف نکل گئی ہیں۔ مثلاً (۱) نو ماہ کے بعد ملکہ "کو" بچہ پیدا ہوا۔(۲) جس "نے" چاروں ہتیار پہنے ہوئے ہیں۔(۳) لڑکے "گندم" کی روٹی کھایا کرتے تھے۔(اِس موقع پر گندم کا لفظ مناسب نہیں معلوم ہوتا۔گیہوں کہتے تو بہتر ہوتا)۔(۴) "اُسے" اپنا وعدہ بھول گیا تھا۔اِسی طرح اُنھوں نے "ترکھاں" کا لفظ استعمال کیا ہے جو غالباً پنجابی میں بڑھئی کے معنوں میں آتا ہے—

بہرحال کتاب دلچسپ ہے اور بچوں کے لئے بہت اچھی ہے۔امید ہے دوسری اشاعت میں اِن خفیف غلطیوں کی اصلاح کردی جائے گی—

چھوٹی تقطیع پر ۲۰۶ صفحے ہیں۔کہیں کہیں سادہ تصویریں بھی دی ہیں کاغذ اور چھپائی اچھی ہے۔ قیمت ایک روپیہ چار آنہ میکملن اینڈ کمپنی سے مل سکتی ہے —

باغبان

یہ ہندوستان کے نامور شاعر ڈاکٹر رابندرا ناتھہ ٹیگور کی نظموں کا ترجمہ ہے-انگریزی میں یہ نظمیں " گارڈنر " کے نام سے چھپی ہیں-ترجمہ اچھا اور صاف ہے-ٹیگور کی نظموں اور اُن کی خاص طرز تحریر سے اُردو داں اصحاب بخوبی واقف ہوچکے ہیں لہذا اُس پر کچھہ لکھنے کی ضرورت نہیں!-

یہ کتاب بھی میکملن اینڈ کمپنی نے چھاپی ہے-قیمت ایک روپیہ چار آنہ—

دختر سمرنا

یہ کتاب صوفی پرنٹنگ کمپنی کے سلسلۂ مطبوعات کی ۴۸ وین کڑی ہے اور خالدہ ادیب خانم وزیر معارف انگورہ کی کتاب "قمیص من نار" کا ترجمہ ہے-موصوفہ بڑی زبردست ادیب ہیں-اُن کا طرز تحریر نہایت دلکش ہوتا ہے اور آسانی کے ساتھہ ترجمہ کا متحمل نہیں ہوسکتا-ان کی اِس کتاب کا ترجمہ اِس سے پہلے بھی " پیراہن آتشین " کے نام سے ہوچکا ہے اور ملک میں عام طور پر پسند کیا گیا-زیر تبصرہ ترجمہ مولوی غلام ربانی صاحب لودھی علیگ کا کیا ہوا ہے—

کتاب ایک طرح کا روزنامچہ ہے-جس میں ایک مجروح ترکی افسر بیامی نے جنگ یورپ کے خاتمہ سے لیکر کمالیوں کی فتح تک کے تمام واقعات بہت ہی موثر پیرایہ میں درج کئے ہیں-جو حضرات کمالیوں کی صحیح تاریخ پڑھنا چاہتے ہیں-اُن کو اِس کتاب سے بہت کچھہ مدد ملے گی—

ترجمہ صاف اور سادہ ہے-لیکن کہیں کہیں جملے پیچیدہ ہوگئے ہیں-مثلاً صفحہ ۶۷ " اس کی یہ نگاہیں میرے نزدیک اس طرح رائگاں جاتی تھیں جس طرح ایک ایسے شخص کو روٹی کے بجائے سیم وزر سے لاد دیا جائے جو ایک صحرا میں بھوک سے مرا جارہا ہو "—

لیکن اِن چند معمولی فرو گذاشتوں کے علاوہ ترجمہ میں اور کوئی نقص نہیں ہے - جن لوگوں کو ترکی فوج کی اندرونی زندگی اور عام ترکی معاشرت کے ساتھہ دلچسپی ہے اُن کے لئے اِس کا مطالعہ ضرور دلچسپ ہوگا - کاغذ لکھائی چھپائی معمولی - صوفی پرنٹنگ کمپنی پنڈی بہاؤالدین سے مل سکتی ہے - قیمت درج نہیں —

(و)

تیغ کمال

یہ کتاب راشدالخیری صاحب کی تازہ ترین تالیف ہے اور صوفی پرنٹنگ کمپنی کی طرف سے شایع ہوئی ہے —

کتاب میں جیسا کہ خود اُس کے نام سے ظاہر ہے - مدبرین یورپ کی ریشہ دوانیوں اور مصطفیٰ کمال پاشا کی فتوحات کا تذکرہ ہے - اگر اِن چیزوں کو محض افسانے کی حیثیت سے بیان کردیا جاتا تو ہمیں کچھہ اعتراض نہوتا - لیکن بد قسمتی سے اِس میں تاریخی واقعات اور دور حاضر کی یورپی سیاسیات کی تصویر کھینچنے کی کوشش کی گئی ہے - جو افسوس ہے کہ کہیں بھی کامیاب اور قرین قیاس نہیں ہے —

معمولی افسانوں کی طرح تاریخی ناولوں کا بھی ایک پلاٹ ہوتا ہے جس کے ضمن میں مختلف تاریخی واقعات جمع کردئے جاتے ہیں - باوجود کوشش کے ہمیں اِس کتاب میں کوئی مرکزی پلاٹ نظر نہیں آتا اور نہ مختلف حصوں میں کوئی ربط ھی پایا جاتا ہے - کہیں (غالباً پیرس میں) لائڈجارج - موسیو برایند اور کرزن سیاسی امور پر عوام کی طرح گفتگو کرتے ہوئے نظر آتے ہیں - کہیں قسطنطنیہ میں جنرل ہیرنگٹن اور داماد فرید پاشا بحث میں مشغول نظر آتے ہیں - اِن مدبروں کی مکالمت جیسی کچھہ غیر مدبرانہ اور خلاف قیاس ہے وہ ذیل کے اقتباسات سے معلوم ہوجائے گا —

صفحہ ۷ کرزن - ہاں تو اب جرمن اور ترکی کا کیا حشر ہو ؟

براینڈ - ترکی کا تو خاتمہ کردینا چاہئے

لائڈ جارج - ایسی سزا ملنی چاہئے کہ عمر بھر یاد کرے

برانیڈ - نہایت نمک حرام قوم ہے

....

کرزن - ایشیاے کوچک میں تھوڑا سا حصہ دیدینا چاہئے

لائڈ جارج - وہ بھی براے نام

——:o:——

صفحہ ۲۶ داماد فرید پاشا - توفیق پاشا بھی تو انسان ہے

شہزادہ عبدالمجید - اور آپ ؟

فرید - میں بھی

شہزادہ - اِس انسان کے ساتھہ قوم ہے - آپ کے ساتھہ دشمنان قوم

فرید - آپ کی گفتگو بہت سخت ہے

شہزادہ - ختم کردیجے

یہ وزیر اعظم ترکی اور سلطان کی گفتگو ہے اور کس قدر قرین قیاس اور مدبرانہ!

——:o:——

کتاب کو مقبول بنانے کی غرض سے حسن و عشق کی داستان بھی شامل کردی گئی ہے - شاہ یونان کی بھتیجی "کونکوئست" (Conquest) ہیروئن ہے - اٹلی - فرانس اور برطانیہ کے شہزادے اُس کے پاس پیغام بھیجتے ہیں - خدا معلوم فرانس میں دوبارہ شاہنشاہیت کب سے قائم ہوگئی - اگر "مز سیو پوائنکار" بھی پیغام بھیجتے تب بھی غنیمت تھا - لیکن بد قسمتی سے صدر جمہور کی مدت عہدہ صرف پانچ سال ہوتی ہے - سمجھہ میں نہیں آتا کہ یہ زبردست فروگذاشت جو معمولی تعلیم یافتہ اور اخبار بیں شخص بھی نہیں کرسکتا

علامہ راشدالخیری سے کیوں کر ہوئی۔ اور اِسی پر اکتفا نہیں کی گئی ہے۔آئندہ
چلکر کونکوئست مسلمان ہوجاتی ہے۔اُس کے قتل کا حکم ہوتا ہے۔غازی مصطفیٰ
کمال پاشا ساحل یونان سے بذریعہ سرنگ قصر شاہی تک پہونچتے ہیں اور اُسے
بچا لیتے ہیں اور ملکہ راشدالخیری صاحب کو انگورہ کی مسجد میں نماز
پڑھتی نظر آتی ہے۔لیکن صفحہ ۱۰۲ پر جناب مولف صاحب کا حافظہ انہیں
دھوکا دیتا ہے اور ہمیں "استیٹسمن ڈیلی ہیرالڈ" کے حوالہ سے یہ خبر معلوم ہوتی
ہے کہ "وہ ۱۷ جولائی کو جہاز کے ذریعہ سے انگورہ پہونچی اور رومال
محبت" (!!) مصطفیٰ کمال پاشا کی خدمت میں پیش کیا۔کاش "مصور غم
صاحب" دلی کی معاشرت ہی کی تصویریں کھینچتے رہتے اور سیاسیات اور
تاریخی واقعات کی الجھنوں میں نہ پڑتے!

کتاب اسی قسم کے بے سروپا واقعات سے لبریز ہے۔جن کو بخوف طوالت
ہم یہاں قلمبند نہیں کرسکتے پلاٹ کے علاوہ کتاب کی زبان بھی کہیں کہیں اصلاح
طلب ہے۔ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کمپنی کے اصرار پر بہت جلد لکھی گئی ہے—

کاغذ لکھائی چھپائی بہت معمولی۔صوفی پرنٹنگ کمپنی پنڈی بہاؤالدین
پنجاب سے مل سکتی ہے۔قیمت درج نہیں—

(و)

خمخانۂ کیفی

یہ جناب پنڈت برجموہن دتاتریہ صاحب کیفی دہلوی کی چند نظموں
کا مجموعہ ہے جو صاحبزادہ محمد عمر اور میاں نورالٰہی صاحب نے کسی ترکیب سے
حضرت کیفی کی بیاض سے نقل کر کے شایع کردی ہیں۔حضرت کیفی ایک کہنہ مشق
اور بلند خیال شاعر ہیں۔اُن کی طبیعت اور شاعری کا رنگ عارفانہ اور حکیمانہ ہے۔
شروع میں خان بہادر چودھری خوشی محمد صاحب ناظر بی۔اے ممبر کونسل
عالیہ ریاست جموں و کشمیر نے بہت دلچسپ اور اچھا دیباچہ لکھا ہے۔اِس کے بعد

اِس مجموعہ کے مرتب صاحبوں نے بھی ایک مقدمہ لکھاھے جس میں حال کی اُردو شاعری پر سر سری طور سے بہت اچھی بحث کی ھے—

اِس مجموعے میں چند ترکیب بند۔ ترانۂ حقیقت۔ باغ دل۔ عشق۔ مجذوب کی بڑ۔ خیر مقدم گرامی۔ ھفت بند کیفی اور اِن کے علاوہ ادب اور شعر کی تجدید۔ نیا زمانہ اور چند غزلیں ھیں—

یہ کلام پڑھنے کے قابل ھے۔ اِس میں قدیم و جدید رنگ ساتھہ ساتھہ نظر آتا ھے۔ زبان کے ساتھ خیالات کا لطف خاص انداز رکھتا ھے۔ یہ مجموعہ شیخ مبارک علی صاحب تاجر کتب لوھاری دروازہ لاھور سے چھہ آنہ میں مل سکتا ھے—

ھمارا گھر

یہ تین ایکٹ کا نیا "سوشیل ڈراما ھے" جس کے لکھنے والے جناب عبدالطیف صاحب شاد ھیں۔ ڈرامے کے نام اور سر ورق پر جلی قلم سے "سوشیل ڈراما" لکھا ھوا دیکھکر ھمیں بہت خوشی ھوئی تھی کہ ھمارے جدید ڈراما لکھنے والوں کو سماجی ناٹک تصنیف کرنے کا شوق پیدا ھوا اور اسی امید میں کہ اِس نئے ناٹک میں ھمیں ھندی معاشرت کی جیتی جاگتی بولتی تصویریں نظر آئیں گی ھم نے اسے شروع سے آخر تک پڑھا۔ لیکن بدقسمتی سے ھماری یہ امید پوری نہوسکی۔ مانوس اور سچی تصویروں کے بدلے ھمیں اِس کتاب میں اپنی سماج کے ایسے بھیانک اور غیر فطری مناظر نظر آئے جن کا وھم و گمان بھی نہ تھا—

سب سے پہلے ھم ڈرامے کی کتھا (Plot) سناتے ھیں:—

دیانند۔ سدانند اور برجیشر تین بھائی ھیں۔ دیانند کانپور کا ایک شریف مہاجن ھے۔ سدانند بیرسٹر ھے اور یہی شخص اِس کتھا کا راون ھے۔ برجیشر ایک لاأبالی۔ قوم پرست۔ آریہ سماجی نوجوان ھے جو اپنی سماجک دھن میں اپنی محبوب منگیتر سرسوتی کو بہن بنالیتا ھے۔ بھگوانداس اِن تینوں بھائیوں کا

پرانا وفادار ملازم ہے۔ دیانند ایک بڑی جائداد کا مالک ہے ۔ لیکن روشن بینک کا دیوالہ نکل جانے کی وجہ سے وہ اپنی ذاتی جائداد کو قرضداروں میں تقسیم کرنا چاہتا ہے ۔ سدانند دھوکے سے اِس سے بے دخلی کا کاغذ لکھا لیتا ہے ۔ برجیشر کو چوری کے الزام میں گرفتار کرا دیتا ہے اور اپنی بڑھیا ماں اور دیانند کی بیوی اور بچے کو مکان سے باہر نکال دیتا ہے ۔ ماں بھائی اور بھاوج صدموں سے مر جاتے ہیں ۔ سدانند بھائی کے بیٹے کو زہر دینے کی کوشش کرتا ہے ۔ لیکن خود اسکی بیوی سروجنی اُسے بچا لیتی ہے اور شوہر کے تپنچہ سے ہلاک ہوتی ہے ۔ ان اعمالِ بد کی پاداش کے طور پر سدانند آگ میں جل کر ہلاک ہوتا ہے آخر میں برجیشر اور سرسوتی ملتے ہیں بینک کی ڈوبی ہوئی رقم مل جاتی ہے اور ہندو ۔ مسلم اتحاد پر بھگوانداس اور برجیشر کے خسر مسٹر ونایک (مجسٹریٹ) کی تقریروں پر قصہ ختم ہو جاتا ہے —

یہ ہے اِس ناٹک کی کتھا جسے مختصراً یہاں پیش کیا گیا اس میں جذبات کی کشمکش اور سیرت نگاری کی تلاش فضول ہے صرف ایک خواہش "حب دولت" ہے اور اسی کے مظاہرات کو بہت مبالغہ کے ساتھہ پیش کر دیا گیا ہے اس کے علاوہ اگر جزئیات پر نظر ڈالئے تو غیر فطری واقعات تضاد اور بے ربط تقریروں کا وہ طومار نظر آتا ہے کہ جی گھبرا اُٹھتا ہے "کانپور کا شریف مہاجن" جس روز اپنی ماں کو لیکر کاشی کی تیرتھہ کو جانا چاہتا ہے اسی روز وہ دھت شرابی نظر آتا ہے جو کبھی تو اہل زمانہ کے برے لچھنوں پر جلے کٹے فقرے کہتا ہے کبھی "دیوانہ بکار خویش ہوشیار" کی طرح اپنے بھائی سے بے دخلی کا کاغذ چھین لیتا ہے اور کبھی بلند پایہ فلسفیانہ اشعار پڑھتا ہے! —

———:o:———

پہلے سین میں کانپور کے کسی کُھلے ہوئے میدان میں قوم پرستوں کا جلسہ

نظر آتا ھے۔صدر بھی ھے۔سکریٹری بھی ھے۔مقرر بھی ھیں۔لیکن تھوڑی دیر کے
بعد یہ ”جلسۂ عام“ صرف پانچ آدمیوں کی مکالمت کی شکل اختیار کر لیتا ھے
اسی طرح سے مسٹر ونایک حکومت کے ھوا خواہ ھیں۔جج ھیں مجمع عام میں
قوم پرستوں کی مخالفت کرتے ھیں لیکن جونہی کہ وہ برجیشر کو چوری کے
الزام میں چھ ماہ کی قید کا حکم سنا چکتے ھیں ویسے ھی بر سر اجلاس
”وایسرائے کے وارنٹ“ کی بنا پر ”بغاوت کے جرم میں“ گرفتار ھو جاتے ھیں
مکافات عمل کا کیا انوکھا طریقہ ھے؟ لیکن ذرا ٹھیرئے! تھوڑے ھی دنوں کے بعد
یہ ”پارلیمنٹ کے فرمان“ کی بنا پر رھا کردئے جاتے ھیں لیکن اب قوم خواہ
بن کر نکلتے ھیں کیونکہ جیل میں برجیشر انھیں تلقین کر چکا ھے بچارے جج
صاحب کو مصنف صاحب نے محض اس وجہ سے جیل خانے بھجوا دیا کہ ان کی
”قلب ماھیت“ کی معقول توجیہ ھو سکے! —

ڈرامے کی زبان خاص طور پر قابل غور ھے۔ گزشتہ پانچ سالوں میں قوم
پرستی۔سواراج۔ترک موالات وغیرہ کی جو لہریں اُٹھیں اُنھوں نے ھمارے
ڈرما نویسوں کو اُردو کے ساحل سے ھٹاکر ھندی اور سنسکرت کے میدانوں میں پہنچا
دیا۔حشر اور منشی عباس وفا کے ڈرامے اِس میدان میں ایسے پھولے پھلے
کہ ان لوگوں نے اپنی تصنیفات میں اُردو کی حیثیت ”اُرد پر سفیدی“ کی سی
کردی۔لیکن منشی عبدالطیف شاد نے رد عمل کا آغاز کیا ھے۔اِن کے ڈرامے کے
سب اشخاص ھندو ھیں۔لیکن اِن کی بول چال ایسی ھے کہ جس پر ندوۃالعلما اور
دارالعلوم دیوبند کے فارغ التحصیل رشک کریں تو بجا ھے۔یہ لوگ زیادہ تر
گفتگو اشعار میں کرتے ھیں۔چند مثالیں ملاحظہ ھوں:—

مسٹر ونایک اپنی بیٹی سرسوتی سے غصہ کی حالت میں یوں کلام
کرتے ھیں: —

" میں تیری زبان سے بد مذہبی کا فلسفہ نہیں سننا چاہتا۔میں یہ بیہودہ شطحیات و طامات۔یہ سوفسطائی لغویات نہیں پسند کرتا "

———:o:———

سدانند کی بیوی سروجنی اپنے دیور کی طرف داری ان الفاظ میں کرتی ہے:—

" اُس کے ذہن میں اتنی جودت اور دراکیت نہیں ہے کہ وہ ایمان کو ایک طبعی دیانت اور خدا کو عالم اسباب کی ایک آخری علت کہے "

———:o:———

سدانند کے گھر میں آگ لگ گئی ہے۔ایسے موقعوں پر انسان الفاظ کے بدلے چیخوں اور بے تکے حرکات وسکنات پر اُتر آتا ہے لیکن سدانند کے الفاظ ملاحظہ ہوں:—

"او آگ بجھانے والے ساب الغار! کیمیاوی جوہر! چل نکل اوز توھی عنصر ناری کے التہاب کو ساب کر ڈال " اس جمعیت خاطر کی داد نہ دینا ظلم ہے!

———:o:———

بھگوان داس ملازم ہے۔لیکن (شاید لکھنؤ کے قرب کی وجہ سے) " ایثار " " شکم پرور " " حرمت مآب " " اجرام سماوی " اور ایسے دوسرے الفاظ بہت بے تکلفی کے ساتھہ استعمال کرتا ہے۔ذیل کے جملے سے تو معلوم ہوتا ہے کہ شاعری منطق اور فاسفہ میں بھی دخل رکھتا ہے:—

لفظ سے مدلول اور مدلول سے دلالت صاف نظر آنے لگی ہے—

نغمہ سے حسن اور حسن سے نغمہ جھلکنے لگا—

———:o:———

یہ محض چند مثالیں ہیں۔ورنہ پوری کتاب اسی قسم کی گفتگو سے بھری

ہوئی ہے-انگریزی ڈرامے میں جن چیزوں کو " مغالطۂ مکان و زماں " (Fallacies of time and place) کہا جاتا ہے وہ دوسرے اُردو افسانوں اور ناٹکوں کی طرح اِس میں بھی موجود ہیں-جا و بے جا ہر گفتگو کی تان قومیت پر ٹوٹتی ہے جو شاید مقبولیت کی ضمانت ہے—

یہ ہے " ہمارے گھر " کی حالت-جو ایک گھر کے بھیدی نے بیان کی ہے- افسوس ہے کہ طوالت کے خیال سے ہم اِس سے زیادہ مفصل تبصرہ نہیں کر سکتے ورنہ یہ کتاب ہمارے ملک کے ڈراما نویسوں کے لئے سبق آموز ہوتی-لیکن مصنفین سے زیادہ عوام کے خیال کی اصلاح ضروری ہوتی ہے-معمولی افسانے اور ڈرامے ہی عوام کے مذاق کا چربہ ہوتے ہیں اور سب سے زیادہ انہی کے مصنفین کو اپنے حسن و قبح سے واقف ہونا چاہئے تا کہ بجاے اس کے کہ قبولیت عامہ کی لہر اپنی رو میں انہیں بہا لے جائے اُن کی تصانیف عوام کے مذاق کو اپنے سانچے میں ڈھا لیں-اسے سنواریں اور اس کا معیار بلند کریں-اُردو ادب میں ناٹک اور افسانوں کی جو درگت ہے اُس کی بڑی ذمہ داری اتنی زیادہ غریب مصنفین پر عاید نہیں ہوتی جتنی کہ عوام پر-ہمیں امید ہے کہ جناب مصنف صاحب جنہیں اظہار خیال پر کافی قدرت ہے جو زبان کے ماہر ہیں اور جن کا ذوق اعلیٰ معلوم ہوتا ہے اپنی موجودہ تصنیفات میں ہماری مخلصانہ تنقید کو مد نظر رکھیں گے-ان کی طبیعت میں جولانی ضرور ہے اور جولانی میں بگاڑنے اور سنوارنے دونوں کے لچھن ہوتے ہیں-کاغذ لکھائی-چھپائی اچھی ہے-جناب منصف سے " نمبر ۷۰ نیا قاضی محلہ متصل مسجد بمبئی نمبر ۹ " کے پتہ سے مل سکتی ہے-قیمت درج نہیں ہے —

-:o:-

لیلیٰ

(یا محاصرۂ غرناطہ)

یہ لٹن کا ایک ناول ہے جس کا اُردو ترجمہ سید امتیاز علی صاحب تاج نے شایع کیا ہے - سنہ ۱۳۱۱ ھجری میں سید محمود مرحوم نے اِس کا ترجمہ شروع کیا تھا اور تھوڑا تھوڑا کر کے تہذیب الاخلاق میں چھپوایا - صرف تین فصلوں کا ترجمہ ہوا اور ناتمام رہ گیا —

یہ ایک تاریخی ناول ہے جس میں مسلمانوں کی حکومت اندلس کا آخری منظر دکھایا گیا ہے - لٹن کو اِس قسم کے ناول لکھنے میں کمال ہے وہ تاریخ کو اِس خوبی سے فسانہ بنادیتا ہے کہ پڑھنے والا تاریخ و فسانہ میں مشکل سے تمیز کر سکتا ہے - اِسی لئے تاریخی ناول لکھنا بہت مشکل ہے - جو لوگ مسلمانوں کی حکومت ھسپانیہ سے ذوق رکھتے ھیں وہ اِسے پڑھ کر بہت لطف حاصل کریں گے —

ترجمہ بہت صاف ستھرا اور شگفتہ کیا گیا ہے سید امتیاز علی صاحب اُن ھونہار نوجوانوں میں سے ھیں جو اُردو زبان کی اچھی خدمت کر رہے ھیں کتاب بہت اچھی چھپی ہے ۲۶۲ صفحے قیمت دو روپئے دارالاشاعت پنجاب لاھور سے مل سکتی ہے —

انوری بیگم

یہ ناول طیبہ بیگم مرحومہ دختر جناب نواب عمادالملک بہادر کا لکھا ھوا ہے - مرحومہ ایک اعلیٰ تعلیم یافتہ اور روشن خیال خاتون تھیں - اِس سے قبل بھی اُن کے ایک ناول کا تبصرہ اِس رسالہ میں ھو چکا ہے اِس ناول میں حیدرآباد کے ایک شریف خاندان کا حال ہے - جس سے معلوم ھوگا کہ اِس زمانے میں معاشرت اور خیالات میں کیا کیا تغیرات ھوئے ھیں - کتاب کے پڑھنے سے معلوم ھوتا ہے کہ لائق مصنفہ نے اپنے ھاں کی سوسائٹی کو کس قدر غور کی نظر سے

دیکھا ہے۔ پرانے توہمات اور تعصبات اور جدید خیالات کو باتوں باتوں میں بہت اچھی طرح بیان کیا ہے۔ حقوق و تعلیم نسواں پر ضمناً جہاں کہیں ذکر آگیا ہے۔ بڑی خوبی سے اپنے خیالات ظاہر کئے ہیں۔ شادی کا معاملہ ہمارے خاندانوں میں بہت ہی ٹیڑھا ہوتا ہے اور اِس میں لڑکی لڑکے کی راے کو مطلق کسی قسم کا دخل نہیں ہوتا۔ ماں باپ کبھی تو عزیز داری کے خیال سے اور کبھی اپنی ضد سے اِس قسم کی شادیاں کر دیتے ہیں جو آخر میں بڑی تباہی اور مصیبت کا باعث ہوتی ہیں۔ اِس ناول میں انوری اور سجاد۔ احمدی اور جعفر کی شادیاں ایسی خوبی سے کی ہیں کہ جن میں افراط و تفریط دونوں نہیں۔ نہ تو عام رواج کے موافق جس میں جانوروں کی طرح جوڑے ملا دئے جاتے ہیں اور نہ انگریزوں کی سی آزادی۔ اِس مشکل مسئلہ کو اِس سلیقہ سے حل کیا ہے کہ شادی در حقیقت خانہ آبادی معلوم ہوتی ہے جہگہ جگہہ ماماؤں کی زبانی ٹھیٹ دکنی زبان کو بہت ہی خوبی سے ادا کیا ہے۔ ناول کا قصہ اگرچہ سادہ ہے لیکن بہت دلچسپ ہے۔ خاندان کی معاشرت۔ رسم و رواج۔ تعلیم و تربیت۔ آپس کے تعلقات۔ یہ ساری باتیں اِس طرح لکھی ہیں کہ پڑھنے والے کے سامنے ایک سماں کھچ جاتا ہے۔ کتاب کی زبان بہت صاف ستھری ہے۔ اِس قسم کے پاکیزہ ناولوں کی ہمارے ملک کو بہت ضرورت ہے اور اِن سے جو عمدہ اخلاقی اثر پیدا ہوتا ہے وہ خطبوں اور وعظوں سے نہیں ہو سکتا۔

تاریخ

تاریخ الامۃ جلد پنجم

اِس جلد میں دولت عباسیہ کے عہد انحطاط کو نہایت واضح طور پر بیان کیا گیا ہے اور خلفا کے عہدوں کو بیان کرنے میں نہایت محنت سے کام

لیا گیا ھے اِس کے ساتھہ ساتھہ ممالک اسلام کی مختلف سلطنتوں کے قیام اور ان بادشاھتوں کے واقعات درج ھیں جومرکزی حکومت کی کمزوری کی وجہ سے پیدا ھوگئی تھیں ترکوں کے استیلا اور اِن کی سازشوں کے مفصل بیان سے مولف کا وسیع مطالعہ ظاھر ھوتا ھے - دیالمہ - سلاجقہ اور خوارزمیوں کی کشمکش کے واقعات سلسلے سے نہایت تفصیل کے ساتھہ بیان کئے گئے ھیں - وزارت میں جو تغیر و تبدل ھوتا رھا اور جو اسکے موقتی اسباب ھوتے تھے وہ بھی نظرانداز نہیں ھوئے ھیں - مولف نے فوجی قوت کو بھی بیان کیا ھے - کہیں کہیں حکومت کے موازنہ پر بھی نظر ڈالی ھے ایک جگہ خلیفہ کے ذاتی اخراجات بھی بیان کئے ھیں دوسری تاریخوں کے مقابلہ میں ایک نئی بات اِس میں پائی جاتی ھے یعنی احوال خارجیہ کا ذکر ھے قوت علویہ کے عنصر کو نہایت صراحت سے درج کیا گیا ھے جو فرقے اِس زمانہ میں پیدا ھوئے ان کی شورشیں ھر عہد میں تفصیل سے دی گئی ھیں - قرامطہ - باطینہ اور حبشیوں بالخصوص فرقۂ مقدم الذکر کی بغاوتوں اور ان کے اثرات سے بحث کی گئی ھے - یونانیوں کے ساتھہ جو لڑائیاں ھوتی رھیں ان کی حیثیت الگ قایم رکھی گئی ھے - غرضیکہ تہذیب بغداد کے زوال کے متعلق جملہ واقعات نہایت صراحت سے بیان کئے گئے ھیں - مگر موجودہ زمانے کے تاریخی نقطۂ نگاہ سے کتاب میں کچھہ قصے کی سی حیثیت پیدا ھوگئی ھے بڑی - خامی یہ ھے کہ قدیم مورخین کی نہ کوئی سند درج ھے اور نہ کہیں اقتباس یا حوالے سے کام لیا گیا ھے جسکی وجہ غالباً یہ ھے کہ یہ کتابیں مدارس ملیہ کی جماعتوں کے لئے تالیف کی گئی ھیں اگر کوئی قوم ایک زمانے تک دنیا کے بہت بڑے حصے پر حکمراں رھی ھو اور تہذیب و تمدن کی تشکیل میں اُس کا بہت بڑا حصہ ھو تو اُسکی تاریخ بیان کرتے وقت یہ لازم ھے کہ اُس مملکت کے نظم و نسق اور سیاسی نظم پر بحث کی جائے اِس کتاب میں یہ فروگزاشت ھوئی ھے —

نیز اُس زمانے کے تمدن و معاشرت پر بھی بحث نہیں کی گئی - اگر تاریخ

قوم کی ھے تو اُس کے تمدن و معاشرت کو ضرور بیان کرنا چاھئیے۔خواہ اِس میں اختصار سے کام لیا جائے-تا کہ یہ معلوم ھو کہ کن موافق و مخالف اسباب سے ایک تمدن یا تہذیب پیدا ھوئی-اِس میں یہ ضروری نہیں ھے کہ ھر عہد میں اِس تمدنی ترقی یا تنزل کو بیان کیا جائے۔تمدن کے کسی خاص شعبے میں ایک خاص زمانے تک جو شکل پیدا ھو جاتی ھے اسے اس زمانے کے اخیر میں مختصراً مع اسباب کے بیان کرنا چاھئیے اور جہاں اس کا زوال شروع ھوتا ھے یا تہذیب کے اس شعبے میں تغیر یا انقلاب ھوتا ھے وھاں اُس زوال-تغیر یا انقلاب کو بالتفصیل بیان کرنا چاھئیے-زیر تبصرہ کتاب میں اِس بیان کی عدم موجودگی سے یہ معلوم ھوتا ھے کہ یہ تاریخ الامۃ نہیں ھے بلکہ تاریخ خلفاے اسلام ھے—

تاریخ لکھتے وقت ھمیں نہایت محنت سے واقعات کی چھان بین کرنی چاھئیے اور جن قوموں کو اِس قوم سے خاص واسطہ رھا ھے ان کے تعلقات پر ایک گہری نظر ڈالنی چاھئیے-موالف نے اِن تمام فرقوں اور مخالف قوتوں کی تحقیر کی ھے جو حکومت بغداد سے نبرد آزما تھے-کئی جگہ مبالغہ سے کام لیا گیا ھے- قرامطہ کے متعلق صفحات ۸۱ و ۹۹ ملاحظہ ھوں—

صفحہ ۸۱ " لوگ نماز پڑہ کر واپس آرھے تھے-اُنہوں نے جس کو پایا قتل کرنا شروع کیا"

صفحہ ۹۹ " جوملا-اُس کو مارڈالا "

صفحہ ۵۲ " آخرکار اللہ تعالی نے فوج کو فتح اور نصرت عطا فرمائی اور سنہ ۲۷۰ ع میں یہ کذاب مارا گیا"

صفحہ ۱۳۱ " آخر کار اللہ تعالی نے اِن کی مدد کی-رومیوں میں وبا پھیل گئی- جس کی وجہ سے وہ محاصرہ اٹھاکر چلے گئے "

یہ صرف چنداقتباسات ھیں-اِن کے علاوہ متعدد مقامات پر باطنیوں اور

زندیقوں کی تکفیر کی گئی ھے اگرھم قدیم عیسائی مورخین کی تاریخوں کا مطالعہ کریں تو ھمیں یہی بات نظرآتی ھے—

سٹینلی لین پول حاجب المنصور کی وفات پر ایک راھب کا فقرہ اقتباس کی صورت میں درج کرتاھے " ۱۰۰۲ ع میں المنصور کا انتقال ھوا اور وہ جہنم میں مدفون ھوا "

سرولیم میور " آخرکار صلیب نے ھلال پر فتح پائی "

دیگر عیسائی تاریخوں میں کئی واقعات اسی طرح پر دئے گئے ھیں مورخین کا اِس قسم کی تاریخیں لکھنا آنیوالی نسلوں کے حق میں کانٹے بوناھے۔

مملکت عباسیہ کے زوال کے اسباب بیان کرنے میں فلسفۂ سیاست کو بالکل نظرانداز کردیاگیاھے صلیبی جنگوں کو کوئی اھمیت نہیں دیگئی۔ان کے اسباب و عوامل پر بہت کم بحث ھوئی ھے۔جواثرات ان جنگوں کے یورپ کے سیاسیات و تمدن پر پڑے۔اِن کا بھی ذکر نہیں ھے۔اِن جنگوں کو قرامطہ۔باطینہ یا دیگر ایسے مخالف عناصرکی طرح بیان کیاگیا ھے اور زیادہ اھمیت نہیں دی گئی—

کتاب کی عبارت ایسی ھی ھے جیسی کہ تاریخوں کی ھونی چاھئے اور اس میں ربط و سلاست پائی جاتی ھے۔مگر استدلال سے معرا ھے—

مولف نے واقعات کو سمجھانے کی کوشش کی ھے اوراس میں وہ ایک حدتک کامیاب ھوئے ھیں۔لیکن اقتباسات کے نہ ھونے کی صورت میں کہیں کہیں الجھنیں پیداھوگئی ھیں بالخصوص قرامطہ کے بیان میں۔

تمام تاریخی پہلوؤں پر نظرڈالنے کے بعد ھمارا یہ خیال ھے کہ باوجود خامیوں کے اِس کتاب سے اردوکی اسلامی تاریخوں میں ایک اضافہ ھوا ھے جو عام لوگوں کیلئے بہت کچھہ فائدہ مند ھے—

یہ کتاب جامعہ ملیہ علی گڈھ نے شایع کی ہے-قیمت دو روپیہ ہے
انجمن ترقی اُردو اورنگ آباد دکن سے بھی مل سکتی ہے—

هند عهد اورنگ‌زیب میں

یہ کتاب جناب مرزا یارجنگ بہادر (مرزا سمیع اللہ بیگ صاحب) کے تحریر فرمائی ہے جس میں دس باب ہیں-پہلے نو باب درحقیقت تمہیدی ہیں اصل باب جس سے کتاب کی غرض و غایت متعلق ہے دسواں ہے جس میں ہندو مسلمانوں کے مسئلۂ اتحاد پر ہر پہلو سے غور کیا گیا ہے-کتاب پڑھنے کے بعد ہمیں اِس بات سے خوشی ہوئی کہ مرزا صاحب نے اس مسئلہ پر ٹھنڈے دل سے بحث کی ہے نہ کسی پر حملہ کیا ہے نہ کسی کو الزام دیا ہے بلکہ بہت نرمی اور شایستگی سے ہر پہلو پر غور کیا ہے-اُن کی تحریر کا ایک ایک لفظ اُن کی نیک نیتی اور صفاے دل کی شہادت دیتا ہے-آخر میں اُنھوں نے خلوص کے ساتھہ یہ درخواست کی ہے کہ دوسرے اصحاب بھی اس مسلہ پر اپنی آزادانہ راے کا اظہار فرمائیں تاکہ آئے دن جو جھگڑے ٹنٹے ہمارے ملک میں بپا ہوتے رہتے ہیں اُن کی جڑ کٹ جائے اور اہل وطن صلح و آشتی کے ساتھہ رہنے سہنے لگیں—

اِس کتاب کی تحریر کا باعث مسٹر جے آر راے صاحب کا مضمون ہوا جو زمانہ میں شایع ہوا تھا-اس مضمون میں مسٹر راے نے ایسٹ انڈیا کمپنی کے گماشتوں کے خطوط کے حوالوں سے یہ ثابت کیا ہے کہ عہد مغلیہ میں رشوت کا بازار گرم تھا-رعایا تنگ دست اور مفلوک الحال تھی-تجارت پر تباہ کن قیود عائد تھیں-صداقت نابود تھی-انگریزوں اور ڈچوں کو تجارت کرنی دشوار تھی-ملک میں رہزنوں کا زور تھا-زمین کا بڑا حصہ ویران اور غیر آباد تھا-تعلیم

کا نام و نشان نہ تھا - وغیرہ وغیرہ - اِس کے جواب میں مرزا صاحب نے یہ چند باب لکھے ہیں - فاضل موالف کو خود اس بات کا اعتراف ہے کہ "یہ مضمون تاریخ کی وقعت نہیں رکھتا ہے اور نہ اس میں مورخ کی حیثیت سے عہد اورنگ زیب کے تمام واقعات پر گہری تنقیدی نظر ڈالی گئی ہے" اور یہ بالکل صحیح ہے - اُنھوں نے مسٹر رائے کے الزامات کے جواب میں صرف اورنگ زیب کے عہد کو لیا ہے جو سب سے زیادہ اعتراضات کا آماجگاہ بنا ہوا ہے اور اپنی تائید کے لئے اُنھوں نے نہ تو مسلمانوں کی تاریخوں کا حوالہ دیا ہے نہ ہندؤں کی تاریخوں سے مدد لی ہے اور نہ انگریزی تاریخوں پر نظر ڈالی ہے - بلکہ ان سب سے قطع نظر کر کے اُنھوں نے ایک ایسے شخص کے بیانات پیش کئے ہیں جس نے اُس عہد کے واقعات اپنی آنکھوں دیکھے ہیں - جو اگرچہ ایسٹ انڈیا کا ملازم تھا مگر اس نے اپنی تحریر میں انصاف کو ہاتھ سے نہیں دیا - ایسے شخص کی شہادت اُن تاریخوں اور مضامین کے مقابلے میں بہت زیادہ قابل وقعت ہے جن کی بنیاد زیادہ تر قیاس اور جانبدار روایتوں پر ہے —

اِس شخص کا نام الگزنڈر ہملٹن تھا - یہ ایک انگریز سیاح اور سوداگر تھا یونیورسٹی کا تعلیم یافتہ تھا سنہ ۱۶۸۸ ع میں جو اورنگ زیب کا زمانہ تھا بہت سا سوداگری مال لیکر چند توپوں اور تھوڑے سے فوجی سپاہیوں کے ساتھ اپنے ملک سے چلا اور تمام ساحل افریقہ و عرب و ایران میں تجارت کرتا ہوا ہندوستان پہنچا - تخمیناً ۲۵ برس تک ہندوستان اور اس کے گرد و نواح میں زندگی بسر کی اور اپنا سفرنامہ لکھا - اسی سفرنامہ سے فاضل مولف نے عہد اورنگ زیب کے بہت سے حالات اور واقعات پیش کئے ہیں جنھیں پڑھ کر بہت سی غلط فہمیاں خود بخود رفع ہو جاتی ہیں —

ہم ذیل میں اُس کے چشم دید حالات کے بعض اقتباس پیش کرتے ہیں جن سے معلوم ہوگا کہ جو کچھ اُس نے دیکھا بجنسہٖ بغیر کسی تعصب اور جانبداری

کے لکھہ دیا ہے مثلاً سب سے پہلے وہ سندھ کے ایک شہر ٹھٹہ میں پہنچا۔اس کے متعلق وہ لکھتا ہے:—

"ٹھٹہ شہر علوم فقہ و فلسفہ و سیاسیات کے لئے مشہور ہے۔ان علوم میں لڑکوں کی تعلیم دینے کے لئے تقریباً چار سو کالج یہاں ہیں"—

مذہبی رواداری کے متعلق لکھتا ہے کہ

"ریاست کا مسلمہ مذہب اسلام ہے لیکن تعداد میں اگر دس ہندو ہیں تو ایک مسلمان ہے۔ہندؤں کے ساتھہ مذہبی رواداری پوری طور سے برتی جاتی ہے۔وہ اپنے برت رکھتے ہیں اور تہواروں کو اُسی طرح سے مناتے ہیں جیسے اگلے زمانہ میں مناتے تھے جبکہ بادشاہت خود ہندؤں کی تھی۔وہ اپنے مردوں کو جلاتے ہیں لیکن اُن کی بیویوں کو اجازت نہیں کہ شوھروں کے مردوں کے ساتھہ ستی ہوں"—

جب سورت میں پہنچتا ہے تو مذہبی حالت ان الفاظ میں بیان کرتا ہے—

"اس شہر میں تخمیناً سو مختلف مذاهب کے لوگ رہتے ہیں لیکن ان میں کبھی سخت جھگڑے ان کے اعتقادات اور طریقۂ عبادت کے متعلق نہیں ہوتے ہر ایک کو پورا اختیار ہے کہ جس طرح چاہے اپنے طریقہ سے اپنے معبود کی پرستش کرے۔صرف اختلاف مذہب کی بنیاد پر کسی کو تکلیف دینا اور آزار پہنچانا اِن لوگوں میں مفقود ہے"—

اِس نے ملک کی خوش حالی۔ارزانی اور ثروت کے جو حالات لکھے ہیں اُنہیں پڑھ کر حیرت ہوتی ہے اور ایک افسانہ معلوم ہوتا ہے۔مثلاً وہ لکھتا ہے کہ ایک ٹن نمک ایک کراؤن (دو تہائی روپئے) میں آتا ہے۔کٹک میں مکھن ایک آنے میں ایک پونڈ۔ڈھاکہ میں دو آنے میں سو مچھلیاں آتی تھیں جو اتنی بڑی ہوتی تھیں کہ ان میں کی دو مچھلیاں آدمی کا پیٹ بھرنے کے لئے کافی ہوتی تھیں اور ایک روپیہ میں پانسو آسی پونڈ چاول ملتے تھے—

اِسی طرح اُس نے ملک کے امن و امان - تجارت - حرفت و صنعت - مہمان نوازی - یہاں کے باشندوں کے اخلاق - یوروپین تجار سے اورنگ زیب کے برتاؤ کے متعلق بیسیوں واقعات لکھے ھیں - ایک جگہ وہ لکھتا ھے کہ "سیاہ فام ھندوستانیوں میں رشوت ستانی اس سے زیادہ نہیں جتنی کہ گورے چمڑے والوں میں ھے" ملک کے امن و امان کی بہت تعریف کرتا ھے اور لکھتا ھے کہ "یہاں ڈاکہ اور قتل کی خبریں بہت کم سنی جاتی ھیں - ایک غیر ملک کا باشندہ اِس ملک میں چلا جائے تو کوئی یہ بھی نہیں پوچھتا کہ وہ کہاں جاتا ھے اور کیوں جاتا ھے" وہ یورپین تجار سے اورنگ زیب کے منصفانہ برتاؤ کی تعریف کرتا ھے اور یورپین تجار کی پالیسی اور اخلاق کو شرمناک بتاتا ھے اور اس کی تائید میں اُس نے متعدد واقعات بیان کئے ھیں —

کیا اچھا ھوتا اگر فاضل مولف اسی کے ساتھ ایک دوسرے یورپی سیاح کے بیانات بھی اپنی کتاب میں درج کر دیتے جو نہ کسی کا ملازم تھا نہ تاجر تھا بلکہ اپنے گھر سے دنیا کی سیاحت کی خاطر نکلا تھا اور جس نے اورنگ زیب سے خلوت اور عام دربار میں ملاقات کی عزت حاصل کی تھی - یہ شخص اٹلی کا رھنے والا اور سول لا کا ڈاکٹر تھا - دنیا کی سیر کرتا ھوا یہ ۱۳ جون سنہ ۱۶۹۳ع میں ھندوستان پہنچا اور دسمبر سنہ ۱۶۹۹ع تک یہاں رھا - وہ ۵ مارچ سنہ ۱۶۹۴ع کو گوا سے اورنگ زیب کے اردوے معلی کی طرف روانہ ھوا جو اس وقت گلگلا میں تھا (غالباً یہ مقام بیجاپور کے قرب و جوار میں معلوم ھوتا ھے) رستے میں جہاں کہیں اُسے موقع ملتا چوری چھپے بتوں کو توڑ جاتا تھا - آخر ۱۷ مارچ کو منزل مقصود پہنچا - ۲۱ مارچ کو بادشاہ سے خلوت میں ملاقات ھوئی اور اِس کے بعد دربار عام میں بھی حاضر رھا - یہ حالات اُس نے بڑے لطف سے لکھے ھیں - بادشاہ نے اُس سے مختلف قسم کے سوال کئے اور ھنگری اور ترکی کی لڑائی کا حال پوچھا اور دول یورپ کے حالات دریافت کرتے رھے - یہ

سیاح (جمیلی کریری) اورنگ زیب کی مذہبی رواداری کی بہت تعریف کرتا ہے۔وہ کہتا ہے کہ اورنگ زیب کی فوج کے عیسائی افسروں نے میری بڑی خاطر مدارات کی اور اُنھوں نے کہا کہ اس بادشاہ کی ملازمت ایک طرح کی مسرت اور خوشی ہے کیونکہ اول تو کوئی بادشاہ اپنے سپاہیوں کو اتنی تنخواہ نہیں دیتا اور جب وہ کبھی لڑنا نہیں چاہتے یا ٹھیک طور سے پہرہ نہیں دیتے تو صرف یہی سزا دی جاتی ہے کہ اس روز کی تنخواہ کاٹ لی جاتی ہے جس روز ایسا واقع ہوتا ہے۔اُن کے مذہب میں کسی قسم کی مداخلت نہیں کی جاتی۔ فوج میں رومن کیتھلک والوں کا ایک گرجا تھا جس میں دو پادری مذہبی خدمت انجام دیتے تھے۔اُس نے یہ بھی دیکھا کہ ایک عیسائی کپتان نے دو مسلمانوں کو شراب نوشی کی سزا میں بندھواکر پٹوایا اور ان دونوں نے کپتان کا اس مناسب سزا پر شکریہ ادا کیا۔وغیرہ وغیرہ ....

بہر حال ان چشم دید بیانات سے یہ ضرور ثابت ہوتا ہے کہ اورنگ زیب کے زمانہ میں پوری مذہبی رواداری تھی اور وہ اس قدر متعصب نہیں تھا جیسا کہ عام طور پر مشہور ہے —

اب ہم دسویں باب پر آتے ہیں جو کتاب کی جان ہے اور جس کی خاطر یہ سب کچھ لکھا گیا ہے۔اس باب کے لایق مولف نے تین حصے کئے ہیں۔پہلے حصے میں انہوں نے گزشتہ ابواب کا خلاصہ بیان کر کے یہ بتایا ہے کہ عہد مغلیہ بھی اہل ہند کے لئے اسی طرح قابل فخر ہونا چاہئے جیسا کہ اشوک یا چندرگپت کا زمانہ اور ہندؤں کا یہی نقطۂ نظر ہونا چاہئے۔دوسرے حصے میں اِس امر پر بحث کی ہے کہ مسلمانوں کا نقطۂ نظر کیا ہونا چاہئے۔اول خلافت پر بحث کی ہے اور یہ بتایا ہے کہ سیاسی خلافت محال ہے۔تمام عالم کے مسلمانوں کا نہ پہلے کبھی کوئی سیاسی خلیفہ تھا اور نہ اب ممکن ہے اور اگر سیاست خلافت سے نکال لی جائے تو پھر خلافت کوئی چیز نہیں رہتی۔غرض مسلمانوں کا صحیح نقطۂ نظر

فاضل مولف کی راے میں یہ ھونا چاھئیے کہ ''وہ بلا لحاظ مذھب و ملت اپنے تمام برادران وطن کے ساتھہ ایک ھي کشتی میں بیٹھا تصور کریں اور وہ کشتی ھندوستان ھے'' گویا ھندوستان کی ذلت اور تباھی اُن کی ذلت اور تباھی اور ھندوستان کا عروج اُن کا عروج ھو-تیسرے حصے میں نفاق کے نتائج اور باھمی اتحاد کی تدبیر پر بحث کی ھے-اتحاد کی تدابیر مفصلۂ ذیل بتائی ھیں—

اصلی تدبیر اُن کی راے میں یہ ھے کہ ھندوستان کی صحیح تاریخ ھندوستانی نقطۂ نظر سے لکھی جائے جس میں نہ تعصب کو دخل ھو اور نہ غلط فہمی کا امکان اور ایسی ھی تاریخیں مدارس کے نصاب میں داخل کی جائیں-اُن کا خیال ھے کہ باھمی اتحاد کو سب سے بڑا صدمہ ایسی تاریخوں سے پہنچا ھے جن میں حقیقت اور صداقت کو چھپا کر تعصب کا بیج بویا گیا ھے-اس اصل تدبیر کے بعد چند اور چھوٹی چھوٹی تدبیریں بھی بتائی ھیں-مثلاً اضلاع کی کانگریس کمیٹیاں مقامی ضروریات اور حالات کے رو سے اتحادی تجاویز عمل میں لائیں-اخباروں میں اتحادی مضامین کی بھرمار کی جائے-دھلی کی اتحادی کانفرنس کی تجاویز پر عمل کرنے کی کوشش کی جائے-کانگریس کی رکنیت کے لئے یہ شرط لازم قرار دی جائے کہ ھر رکن اتحاد پر ایک مضمون لکھہ کر کسی اخبار میں شایع کرے یا کانگریس کمیٹی میں پیش کرے-قابل موئف کا مقصد اِس سے یہ ھے کہ قبل اِس کے کہ کوئی شخص انڈین نیشنل کانگریس میں شرکت کی درخواست پیش کرے وہ اتحاد و اتفاق کے مسئلہ پر غور کر کے اپنی ذمہ داریوں کو محسوس کرلے-ھندو مسلمانوں کے لئے علیحدہ علیحدہ مدارس کا اصول درست نہیں-ان کے بچوں کو ایک جگہ تعلیم دی جائے تاکہ بچپن سے باھم محبت اور دوستی کے خیالات پیدا ھو جائیں-جیسا کہ پہلے دستور تھا اب بھی کوشش کی جائے کہ ھندو مسلمان آپس میں ملیں جلیں ایک جگہ اُٹھیں بیٹھیں-غرض جہاں تک ممکن ھو ایک دوسرے سے ملنے جلنے

کے موقع پیدا کئے جائیں۔مولف کی راے میں اتحاد قائم رکھنے کے لئے مسلمانوں کے جداگانہ حق میں ہاتھہ نہ لگانا چاہئے۔یہ بھڑوں کا چھتہ ہے اور جو قرارداد لکھنؤ میں ہو چکی ہے اُسی پر قائم رہنا چاہئے۔اُن کے خیال میں مسلمانوں کے جداگانہ انتخاب سے وہی فائدہ ہوگا جو انگلستان کی پارلیمنٹ کو مختلف فریقوں کے وجود سے ہوتا ہے یعنے متضاد قوتوں اور کششوں میں اعتدال پیدا کرنا۔آخر میں فاضل مولف نے اپنا ذاتی عقیدہ یہ بیان کیا ہے کہ ہندو مسلمانوں میں اتحاد ہو کر رہیگا۔خدا کرے ایسا ہی ہو—

یہ تجویزیں جو اُوپر بیان ہوئی ہیں بہت اچھی ہیں اور جناب مرزا صاحب کے خلوص پر دلالت کرتی ہیں لیکن کیا اس پیچ درپیچ مسئلہ کے حل کرنے کے لئے جس نے اس وقت ایک عجیب ناگوار صورت اختیار کرلی ہے کافی ہیں؟ اصل اور بڑی تجویز یہ بتائی گئی ہے کہ ہندوستان کی تاریخیں سچائی اور صداقت کے ساتھہ لکھی جائیں۔یہ بہت عمدہ تجویز ہے۔لیکن اتنی مدت کے بعد جب کہ زہر سرایت کر چکا ہے اب اس ذریعہ سے اتحاد اور اتفاق قائم کرنا آسان نہیں۔اس کے لئے ایک زمانہ چاہئے۔قطع نظر اِس کے ان تجویزوں کے عمل میں لانے کی کوئی صورت نہیں بتائی گئی —

ہم اکثر اگلے زمانے کی محبت و الفت کا ذکر حسرت سے کرتے ہیں (اور حقیقت یہ ہے کہ موجودہ حالت دیکھہ کر دل کو ٹھیس لگتی ہے) اور حیرت کرتے ہیں کہ یہ کیا ہو گیا اور دل سے یہ آرزو کرتے ہیں کہ پھر وہی لیل و نہار ہوں۔وہی محبت و آشتی ہو۔وہی دوستانہ اور عزیزانہ تعلقات اور باہمی موانست ہو۔ہمارے اخباروں اور تقریروں میں یہ خیالات اور یہ تمنائیں بار بار دہرائی جاتی ہیں۔بیشک یہ باتیں نیک نیتی پر محمول ہو سکتی ہیں مگر حقیقت سے بعید ہیں۔ہم یہ نہیں دیکھتے کہ زمانہ کہاں سے کہاں چلا گیا ہے۔نہ وہ اگلا سا نظام حکومت ہے۔نہ وہ آئین و قوانین ہیں۔نہ وہ معاشرت ہے۔نہ

وہ خیالات ہیں۔ایسی حالت میں کیونکر ممکن ہے کہ وہی حالات پیدا ہو جائیں جو پہلے تھے۔اس وقت ہم پر ایک جدید حکومت فرمانروا ہے جس کے تحت ہم نے حقوق طلبی کا نیا سبق سیکھا ہے۔تعلیم کا ڈھنگ بالکل بدل گیا ہے۔زندگی کے ہر شعبہ میں انقلاب نمایاں ہے۔جو پہلے رعایا اور حاکم تھے اب خواجہ تاش ہیں۔ اس لئے نہ وہ تعلقات قائم رہ سکتے ہیں اور نہ وہ معاشرت باقی رہ سکتی ہے۔ لیکن اتحاد کی ضرورت پہلے سے کہیں زیادہ ہے کیونکہ مقابلہ ایسے سے ہے جو ہم سے کہیں افضل ہے —

ہندو مسلمانوں میں جو جھگڑے اور فساد ہوتے رہتے ہیں اُن میں سے اکثر بلکہ سب کے سب مذہبی سمجھے گئے ہیں۔ہندوستان عام طور پر ایک مذہبی ملک سمجھا جاتا ہے اور یہ خیال کیا جاتا ہے کہ یہاں کے باشندے مذہب و تصوف میں ڈوبے ہوئے ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ اکثر باتیں جو مذہب کے نام سے مشہور ہیں محض تعصبات اور توہمات ہیں۔جس ملک کے اتحاد کا انحصار معبدوں کے سامنے باجے بجانے۔پیپل کی ٹہنیوں کے کاٹنے اور گائے کے ذبح پر ہو وہاں اتحاد ہونا معلوم۔تعجب یہ ہے کہ ہندو مسلمانوں کے سردار اور رہنما اتحادی کانفرنسوں اور انجمنوں میں اُنہیں توہمات اور تعصبات پر جوش و خروش سے بحثیں کرتے اور اُنہیں قواعد کے تحت میں لانا چاہتے ہیں حالانکہ یہ وہ چیزیں ہیں جو کسی قاعدے کی پابند نہیں ہو سکتیں۔توہمات اور تعصبات کی اصلاح کی صرف ایک ہی صورت ہے اور وہ ان کا استیصال ہے۔اگر ہمارے رہنما بھی اِن توہمات پر ایسا ہی عقیدہ رکھتے ہیں جیسا کہ عوام تو اُن پر افسوس ہے اور اگر وہ ان باتوں کو مہمل سمجھتے ہیں اور پھر اُن کی حمایت کرتے ہیں تو اس سے زیادہ افسوس ہے۔سر سید احمد خاں مرحوم نے جب اپنا کام شروع کیا تو سب سے پہلے اُنہوں نے توہمات اور تعصبات کی جڑ کاٹنی شروع کی اور مخالفت اور بدنامی کی کچھ پرواہ نہ کی اور یہی صحیح

طریقہ اصلاح کا ہے-شاید ہمارے رہنما ڈرتے ہیں کہ اگر ان باتوں کی مخالفت کی گئی تو اُن کی ہردلعزیزی اور شہرت میں فرق آجائے گا-لیکن ایسی شہرت اور ہردلعزیزی جو اس قسم کے توہمات پر مبنی ہے قائم رہنے والی نہیں-رسوائی کہیں نہ کہیں اس کی تاک میں لگی ہوئی ہے-اس لئے ہماری رائے میں اتحاد کے لئے ایک ایسی جماعت کی ضرورت ہے جو ان تعصبات اور توہمات سے بالا ہو جس کا تعلق نہ کسی خاص مذہبی انجمن سے ہو نہ کسی سیاسی کانفرس سے-وہ آزادانہ کام کرے اور اہل ملک کی آنکھیں کھولے کہ وہ کن مہملات میں مبتلا ہیں اور اپنی اِن حرکات سے ملک کو کیا نقصان پہنچا رہے ہیں-وہ ایک معتدبہ سرمایہ جمع کرکے اعلیٰ درجہ کا اخبار اور رسالہ جاری کرے اور رفتہ رفتہ ہر صوبے کی مقامی زبان میں اسی قسم کے اخبار اور رسالے شایع کئے جائیں-وہ ان تمام تعصبات اور توہمات کو نہایت تحمل اور شایستگی سے رفع کرنے کی کوشش کرے-ہندوستان کی تاریخ کے متعلق صحیح اصول پر تحقیق کا کام کرے اور ملک میں رواداری اور بلند نظری کے خیالات پھیلائے-اگر چند عالی خیال اصحاب اخلاقی جرأت سے کام لیکر کھڑے ہو جائیں تو سیکڑوں آدمی اُن کا ساتھہ دینے پر آمادہ ہو جائیں گے اور جب لوگوں کو اُن کی راستی اور خلوص پر یقین ہو جائے گا تو اُن کے قول پر بہ نسبت کسی دوسری جماعت کے زیادہ اعتماد ہوگا-وہ ملک میں ایک زبردست قوت ہو جائے گی اور ان تمام تجویزوں کو زیادہ خوبی سے انجام دے گی جس کی تمنا فاضل مولف نے اپنی کتاب میں ظاہر کی ہے-ورنہ اگر فساد کی اصل بنا قائم رہی اور دونوں جانب سے یہی مطالبات پیش ہوتے رہے تو مصالحت کی جتنی کوششیں کی جائیں گی وہ سب بیکار ہوں گی-اگر فاضل مولف اس بات پر آمادہ ہوں تو اس جماعت کے پروگرام پر تفصیلی بحث بعد میں ہو سکتی ہے—

" البیان المغرب فی اخبار المغرب "

علامہ ابن العذاری المراکشی کی کتاب البیان المغرب فی اخبار المغرب کا ترجمہ جو پروفیسر جمیل الرحمن صاحب ایم-اے وغیرہ وغیرہ پروفیسر تاریخ اسلام جامعۂ عثمانیہ حیدرآباد دکن نے اصل عربی سے اُردو میں کیا ہے اور تنقید کے لئے ہمارے پاس بھیجا گیا ہے-ہم نے اِس ترجمے کا اکثر حصہ اصل عربی سے مقابلہ کرکے دیکھا- بحیثیت مجموعی ترجمہ غنیمت ہے-زبان بھی صاف ہے مگر افسوس ہے کہ ترجمہ کی صحت کا لحاظ نہیں رکھا گیا-کیونکہ متعدد مقامات ایسے ہیں جہاں فاضل مترجم نے اصل کتاب کے سمجھنے میں غلطی کی ہے جس سے ترجمہ کچھہ کا کچھہ ہوگیا ہے-اِس سے ہماری نیت خدا نخواستہ فاضل مترجم یا اُردو ترجمہ کی تنقیص نہیں ہے کیونکہ علم کی خدمت جس حد تک اور جس طرح بھی کوئی کرے بہر حال قابل قدر ہے اور اُمید ہے کہ یہی کوشش آگے چل کر اُنہیں صحیح معنے میں مستند مترجم بنا دے گی—

ذیل میں ترجمہ کی چند کمزوریاں بطور نمونہ پیش کی ہیں تا کہ آئندہ جب مترجم صاحب کو کتاب کی دوبارہ اشاعت یا نظر ثانی کا موقع ملے تو وہ ان اسقام سے اُسے پاک کرنے کی کوشش فرمائیں—

اُردو ترجمہ صفحہ ۱۳ "جب جرجیر نے دیکھا کہ مسلمانوں پر اُس کا رعب طاری ہوگیا ہے" اصل عربی عبارت "فلما رای جرجیر العرب اشتد رعبه"—

صحیح ترجمہ یوں ہونا چاہئے "جب جرجیر نے عربوں کو دیکھا وہ سخت مرعوب ہو گیا" اِس ترجمہ سے معلوم ہوسکتا ہے کہ فاضل مترجم نے ترجمہ بالکل الٹا کیا حالانکہ عربی جملہ بالکل آسان اور واضح ہے—

اُردو ترجمہ صفحہ ۱۵ "مسلمانوں کے رسالہ اور پیدل فوج نے سبیطلہ کے قلعہ کی جانب پیشقدمی کی-رومی قلعہ میں داخل ہونے سے مانع آئے"

اصل عربی عبارت " و سبقت خیول المسلمین و رجالہم الی حصن سبیطلہ فمنعوہم من دخولہ "

صحیح ترجمہ مسلمانوں کا رسالہ اور پیدل سپاہ اُن سے پہلے سبیطلہ کے قلعہ پہنچ گئی اور اُنہوں نے کفار کو اُس قلعہ میں داخل نہ ہونے دیا —

فاضل مترجم نے یہاں ترجمہ میں لغزش کھائی ہے جس سے اصل مفہوم بالکل بدل گیا حالانکہ سبقت۔کا فعل خود اِس بات کو ظاہر کر رہا ہے کہ مسلمان اُن سے پہلے پہونچے اور اُنہوں نے اِس شکست خوردہ فوج کو جو قلعہ میں پناہ لینا چاہتی تھی اُس سے باز رکھا جو آگے کی عبارت سے بالکل صاف ہو جاتا ہے —

صفحہ ۲۸ میں فاضل مترجم نے مسجد جامع کی صفت جلیل القدر لکھی ہے۔ " وہاں ایک جلیل القدر مسجد جامع بھی ہے " اصل عربی میں صرف اتنا ہے وبہا جامع جلیل۔جس کا ترجمہ عظیم الشان اور وسیع سے کرنا چاہئے ہماری نظر سے مسجد کی یہ صفت اُردو زبان میں نہیں گزری —

صفحہ ۳۰ میں فرماتے ہیں جن سے ہم نے بہت سے عہد نامے اور وعدے کئے ہوئے ہیں۔یہ جملہ محاورۂ زبان اُردو کے بالکل خلاف ہے —

صفحہ ۵۷ " بشر نے کہا دشمنوں سے جاکر کہدے کہ وہ نہ مریں "

اصل عربی عبارت میں ہے " فقال لہا قولی للاعداء لایموت " جس کے صاف معنے یہ ہیں کہ بشر نے اپنی جاریہ سے کہا کہ دشمنوں سے جاکر کہہ دے کہ امیر ابھی مرتے نہیں "

یہاں خاص بات قابل لحاظ یہ ہے کہ لایموت فعل واحد ہے بھلا "اعداء" جو جمع ہے وہ اُس کا فاعل کیسے ہوسکتا ہے؟ یہ صرف و نحو کی ایسی غلطی ہے جو شاید مبتدی بھی نہیں کرے گا —

صفحہ ۵۹ میں ایک شعر کا ترجمہ ملاحظہ ہو —

اصل عربی شعر جو ترجمه میں بهی نقل کر دیا گیا هے—

"تعا میتم عنا بعین جلیته وانتم کذا ما قد علمنا لنا فعل"

فاضل مترجم نے اِس کا ترجمه کیا هے "تم نے همارے لئے اپنی آنکهیں بند کر لیں حالانکه تم کو همارے کارخانے معلوم هیں"—

هماری سمجهه میں نهیں آتا که دوسرے مصرع کا یه ترجمه مترجم کے ذهن میں کهاں سے آیا حالانکه اس کے بهت هی صاف معنے یه هیں "اور همیں پہلے سے معلوم هے که تم همارے ساتهه همیشه ایسا هی کیا کرتے هو" اِس سے نه صرف ترجمے کی غلطی بلکه فاضل مترجم کے ذوق و دانش کا بهی پته چلتا هے۔ترجمه کا ایک اور مقام قابل لحاظ هے:—

صفحه ۱۱۹ " طنجه اور گرد و نواح کے علاقه کے عامل عمر بن عبدالله المراوی نے سوءسیرۃ اظهار کیا صدقات اور عشر کے معامله میں لوگوں پر تشدد کیا اور سب پر اِس زعم میں اضافه کیا که تمام بربری مال غنیمت اور مسلمانوں کے فئے میں داخل هیں چنانچه ان کی تقسیم کا اراده کیا۔یه ایک ایسا فعل تها جس کا ارتکاب اس سے پہلے کسی عامل نے نه کیا تها۔وه لوگ صرف اُن هی بربریوں کو اپنا خمس سمجهتے تهے جنهوں نے اسلام قبول نه کیا تها۔عمر کے اِس مذموم فعل کا نتیجه یه هوا ...."

اصل عربی عبارت یه هے:—

"ثم ان عمر بن عبدالله المراوی عامل طنجة و ماوالاها اساءالسیرۃ وتعدی فی الصدقات والعشر واراد تخمیس البربر وزعم انهم فی المسلمین وذلک مالم یرتکبه عامل قبله وانما کان الولاۃ یخمسون من لم یجب الاسلام وفکان فعله الذمیم سبباً"

اِس عبارت کا صحیح ترجمه کیا جاتا هے تا که ناظرین کو اُن فاحش غلطیوں کا علم هو جائے جو فاضل مترجم نے اپنے ترجمه میں کی هیں:—

"عمر بن عبدالله المراوی نے جو طنجہ اور اُس کے ملحقہ علاقہ کا عامل تھا ظلم و زیادتی شروع کی صدقات عشر میں اضافہ کر دیا بربروں سے خمس لینا چاہا کیوں کہ اُس نے یہ گمان کیا کہ بربر مسلمانوں کی غنیمت جہاد ہیں حالانکہ اس سے پہلے کسی عامل نے ایسا گمان اُن کے متعلق نہیں کیا تھا اور اِس وقت تک جتنے والی ہوچکے تھے وہ مال گذاری میں پانچواں حصہ صرف اُن بربروں سے وصول کرتے تھے جنہوں نے اسلام قبول نہیں کیا تھا اور اُس کا یہی قبیح فعل سبب بن گیا........."

تاریخ اسلام کا ہر طالب علم اسے خوب جانتا ہے کہ مسلمان مسلمانوں سے عشر اور غیر مسلم سے خمس خراج میں وصول کرتے تھے۔اگر تاریخ اسلام کا پروفیسر اِس مقام پر تخمیس کا ترجمہ ایک جگہ"اُن کی تقسیم"اور دوسری جگہ "اُن کو اپنا خمس سمجھتے تھے"کرے تو اِس سے زیادہ قابل افسوس بات کوئی نہیں ہوسکتی—

چونکہ یہاں اِس ترجمہ کی نظر ثانی مقصود نہیں ہے بلکہ محض سرسری تبصرہ ہے اِس لئے ہم مذکورۂ بالا مثالوں کے پیش کرنے پر اکتفا کرتے ہیں ورنہ سارا ترجمہ اسی قسم کی لغزشوں سے مملو ہے۔اسی طرح زبان اور انشا کی جا بہ جا غلطیاں موجود ہیں—

ہم پروفیسر جمیل الرحمن اور اُن کے فاضل والد اور بھائی کی اُن قابل قدر مساعی کا دل سے اعتراف کرتے ہیں جو اُنہوں نے تاریخ اسپین کے متعلق فرمائی ہیں۔ لیکن اسی کے ساتھہ ہماری یہ دلی تمنا اور درخواست ہے کہ بجائے جلد جلد ترجمہ کرنے کے صحت کا زیادہ خیال رکھیں تو بہتر ہوگا—

کتاب مقتدر حکیم الرحمن صاحب بی۔اے نصیر کاٹیج ربانی روڈ لاہور کے پتہ سے طلب کی جاسکتی ہے۔۳روپیہ ۸ آنہ اسکی قیمت ہے—

مذہب

کشاف الہدیٰ

مقدمہ

کتاب الہدیٰ - مرتبۂ مولوی سیٹھہ یعقوب حسن صاحب

قیدخانہ بعض اوقات موجب برکت ثابت ہوا ہے - بڑے بڑے لوگوں نے جن پر ایسی مصیبت نازل ہوئی ہے اپنے زمانۂ قید میں ایسے ایسے کام کئے ہیں جو زمانہ میں یادگار رہے ہیں - کچھہ عرصہ ہوا یہ مصیبت ہماری قوم کے بزرگوں پر بھی نازل ہوئی - ان میں سے اکثر نے قید میں رہکر مذہب کی تحصیل کی یا مذہبی مسائل پر غور کیا - مولوی سیٹھہ یعقوب حسن صاحب بھی اُنھیں بزرگوں میں ہیں - اُنہوں نے قیدخانے میں ایک جامع کتاب لکھہ ڈالی - جس کا نام کتاب الہدیٰ ہے - اور کتاب زیر تبصرہ اِس کا مقدمہ ہے اسکا مقصد صرف کتاب الہدیٰ کی ترغیب و تعارف ہے اِس میں کوشش کی گئی ہے کہ تمام اخلاقی سیاسی مذہبی معلومات کا ذخیرہ صرف قران سے اخذ کیا جائے اور قران کے تمام اہم ترین مضامین و مباحث کی واضح تفصیل پیش کی جائے اِس مقصد کے لئے بڑی احتیاط کے ساتھہ شان نزول اور مضامین کی پریشان ترتیب اور تقسیم کو موزوں اور مرتب ضابطے اور قاعدے کے ساتھہ جمع کیا گیا ہے —

مولف نے تمام مجمل اور مبہم آیات کی تفصیل کے لئے ہم مضمون آیتوں کو ایسی ترتیب کے ساتھہ جمع کردیا ہے جس سے وضاحت مضمون کے ساتھہ ہی یہ بھی معلوم ہو جاتا ہے کہ احکام قرانی کے تدریجی منازل کیا ہیں - اِس سے عبادات - معاملات - معتقدات کی حقیقی حالت اور نوعیت و کیفیت عیاں ہوتی ہے —

قران کے نزول - وحی - نزول وحی کی کیفیت - وحی باللفظہ - الہام - القا پر معنی خیز بحث کی گئی ہے - قران اور دیگر الہامی کتابوں کا مقابلہ بڑی خوبی سے کیا گیا ہے - توراۃ - انجیل - زبور و دیگر کتب قدیمہ سے قران کا توازن کرکے

اُس کی جامعیت اور افضلیت کا کافی ثبوت دیا گیا ہے-عرب کی جغرافیائی حالت عرب و دیگر ممالک کی مروجہ زبان-انداز معاشرت و تمدن و دیگر ماحول کو بڑی سلاست سے واضح کرکے ثابت کیا گیا ہے کہ عربی زبان ہی میں قران کا اتارا جانا مصلحت تھا—

نیز یہ کہ قران معجزۂ نبوت ہے کیونکہ آنحضرت اُمی تھے-قران میں بہت سے ایسے مضامین کتب سابقہ کے موجود ہیں جن سے اُس زمانہ کے علماء بالکل نابلد تھے-طرز کلام اور گوناگوں مضامین کا انتظام معجز ہے-قران میں ابتدا سے آجتک کوئی اختلات نہیں ہوا-اسکے بعد قران کے وقتاً فوقتاً اُتارے جانے کی مصلحت پر بحث کرتے ہوئے قران کی کتابت-تعلیم و حفظ-ترتیب-جمع مصحف صدیقی و مصحف عثمانی کا فرق بتاکر یہ ثابت کیا گیا ہے کہ مصحف عثمانی بے کم و کاست وہی قران ہے جو آنحضرت کے وقت تھا-پھر فن کتابت کی ایجاد اور اسکی مختصر تاریخ بڑی خوبی سے بیان کی گئی ہے-آخر میں اصل کتاب (کتاب الہدیٰ) کا ٹائٹل مع دیباچہ مولانا سید سلیمان ندوی بہاری-مکمل فہرست مضامین اور اصل کتاب کا ایک جز بطور نمونہ نقل کردیا گیا ہے جس سے کتاب الہدیٰ کا بخوبی اندازہ ہوسکتا ہے—

مقدمہ قابلیت-محنت اور تحقیق سے لکھا گیا ہے اور اس میں بڑی جگر کاوی کی گئی ہے-اس میں تمام مسلمان اور غیر مسلم افراد کے لئے معلومات قران کا اچھا خاصہ مواد موجود ہے-کہیں کہیں زبان کے اسقام اور طباعت کی غلطی نظر آتی ہے مگر یہ چنداں قابل خیال نہیں ہے—

تاہم مولف صاحب کی جگر کاوی-محنت اور تحقیق قابل داد ہے اور کتاب اپنے انداز بیان و مضامین کے لحاظ سے خوب ہے-حجم سب ملاکر ۳۰۰ صفحہ سے زیادہ ہے-کاغذ عمدہ اور طباعت بھی اچھی خاصی ہے-قیمت دو روپیہ آٹھ آنے-دفتر اشاعت ۷ سیق نہم روڈ مدراس سے مل سکتی ہے—

یسرنا القرآن

یہ قاعدہ اِس غرض سے لکھا گیا ھے کہ اس کے پڑھنے کے بعد بچے قران خودہ سمجھہ کر آسانی سے پڑہ سکیں-ھمارے ھاں بچوں کو قاعدہ اِس بری طرح سے پڑھایا جاتا ھے کہ اُن کی سمجھہ میں خاک نہیں آتا اور جو اُستاد بتاتے ھیں اُسے بے سوچے سمجھے رٹ لیتے ھیں-یہ قاعدہ صاحبزادہ پیر منظور محمد صاحب نے اِس طریقے سے لکھا ھے کہ بچہ تدریجی طور سے سمجھہ کر پڑہ سکے-الفاظ کی ترتیب بھی ایسی رکھی ھے کہ پہلے آسان آسان لفظ ھیں اِس کے بعد رفتہ رفتہ مشکل الفاظ کی مشق ھے اور الفاظ بھی ھر سبق میں اس طرح رکھے ھیں کہ اگر بچہ اُن پر قادر ھوجائے تو قران خود بخود پڑہ سکتا ھے-چھپائی اِس قدر صاف اور بین ھے اور الفاظ کی تحریر اِس قدر کُھلی ھے کہ پڑھنے میں بہت سہولت ھے-اعراب ھر حرف پر الگ الگ کُھلے کُھلے لکھے ھیں تا کہ اُن کے ملانے میں کسی قسم کی دقت نہ ھو—

اِس قاعدہ کے بعد پڑھنے کے لئے قران شریف کے پارے بھی اِسی سلیقہ اور خوبی کے ساتھہ چھاپے ھیں-کاغذ بھی بہت اچھا لگایا ھے-ھماری راے میں قران پڑھنے والے بچوں کے لئے یہ قاعدہ اور یہ پارے سب سے بہتر ھیں—

قاعدہ کی قیمت ساڑھے پانچ آنے—

پارہ آلم و سیقول اورعم اعلیٰ کاغذ پر آڑھائی آنے فی پارہ-پورہ قران شریف اسی طرز کا مجلد پانچ روپیہ—

ملنے کا پتہ-منشی محمد لعل خاں صاحب ادیب-سناٹوریم-مدن پلی ضلع چتور—

متفرق

اُردو آموز (Urdu simplified)

اِنگریزوں یا انگریزی داں اصحاب کو اُردو سکھانے کے لئے اگرچہ سیکڑوں کتابیں لکھی گئی ہیں۔لیکن یہ کتاب جس کے مولف دنیش چندردت صاحب یم-اے-ایم-آر-اے-ایس-پروفیسر سینٹ جان کالج کلکتہ نے تالیف فرمائی ہے پنی نوعیت میں سب سے ممتاز ہے-اِس قسم کی کتابیں ہماری نظر سے بہت سی گذری ہیں لیکن کوئی کتاب جو ایسی جامعیت اور خوبی سے لکھی گئی ہو اب تک دیکھنے میں نہیں آئی-اِس میں صرف و نحو-ترجمہ-انشا-سب کچھ آگیا ہے- ابتدا آسان آسان مشقوں سے کی گئی ہے-اِس کے بعد درجہ بدرجہ مشق کے لئے ایسے سبق دئے ہیں جن میں زبان کے تمام قواعد آگئے ہیں اور اُن کے ساتھ ساتھ وضاحت کے لئے ایسی مثالیں دی ہیں کہ قاعدے خود بخود سمجھ میں آجاتے ہیں-روز مرہ اور محاورات کا استعمال اِس خوبی سے کیا گیا ہے کہ اہل زبان بھی داد دے-عروض پر بھی دو سبق دئے ہیں اور اِس کی تفہیم کا ایسا سہل طریقہ اختیار کیا ہے جس میں ایک قسم کی جدت پائی جاتی ہے-ان تمام باتوں کے علاوہ اُردو زبان کے نکات-مختلف فوائد-نازک فروق- الفاظ و محاورات کا استعمال اور اور بہت سی ایسی کام کی باتیں بتائی ہیں کہ سوائے ایسے شخص کے جس نے مدتوں غور و فکر سے زبان کو حاصل نہ کیا ہو کوئی نہیں بتا سکتا-ہمیں حیرت ہے کہ ہندو بنگالی کو اُردو کے روز مرہ اور محاورات پر اِس قدر عبور کیوں کر حاصل ہوا-معلوم ہوتا ہے کہ اُنہوں نے اِس زبان کا مطالعہ بہت محنت اور غور و خوض سے کیا ہے-کتاب کے آخر میں اُردو سے انگریزی اور انگریزی سے اُردو کی ایک مختصر فرہنگ بھی لگادی ہے جس میں اکثر ضروری اور کار آمد الفاظ آگئے ہیں —

جو انگریزی داں حضرات اُردو زبان حاصل کرنا چاہتے ہیں انہیں اِس سے بہتر کتاب نہیں مل سکتی —

کتاب تقریباً چار سو صفحہ پر ہے قیمت (تین روپیہ) سکۂ انگریزی —
انجمن ترقی اُردو اورنگ آباد دکن سے مل سکتی ہے —

Humour and Fancy of Persia.

یہ کتاب مہرجی بھائی نوشیرواں جی کوکا-ایم-اے-کی تالیف کی ہوئی ہے- پہلی مرتبہ صاحب موصوف نے Wit and Humour of the Persians کے نام سے ایک کتاب سنہ ۱۹۰۲ع میں لکھی تھی- زیر تبصرہ تالیف اسی کا دوسرا اڈیشن ہے اور اس مرتبہ اس میں بہت کچھہ اضافہ کیاگیا ہے —

ہر زبان میں متین اور سنجیدہ تحریروں کے علاوہ کچھہ نہ کچھہ حصہ ظریفانہ نظم و نثر کا بھی ہوتا ہے اور جس قدر جو زبان زیادہ ترقی کرتی ہے- اس کی ظرافت اور خوش طبعی بھی نکھرتی جاتی ہے- زیر تبصرہ نسخہ میں جناب مولف نے قدیم اور جدید شعراے فارسی کے کلام سے وہ نظمیں منتخب کی ہیں جن میں ظرافت- خوش طبعی یا اصناف صنائع کے نمونے نظر آتے ہیں- نظموں کے علاوہ نثر کے لطیفے اور ظریفانہ حکایتیں بھی ہیں —

جناب مولف کی محنت قابل داد ہے- مختلف مستند کتابوں اور تذکروں سے مدد لی گئی ہے اور اِن سب کی ایک فہرست بھی دیدی گئی ہے —

کتاب انگریزی زبان میں ہے- لیکن فارسی کلام کے جملہ اقتباسات اصل زبان میں بھی دئے گئے ہیں- ہر مثل کا انگریزی ترجمہ بھی دیاگیا ہے- ایرانی شعرا کے علاوہ- اکبر- بیربل- ملادوپیازہ- جہانگیر- نورجہاں- زیب النسا کے قصے بھی نظر آتے ہیں- اِن میں سے بہت سے ایسے ہیں جو اگرچہ زبان زد عام و خاص ہیں لیکن

اُنکی صداقت تحقیق طلب ہے - مثلاً نورجہاں اور کسی شاعر کی گفتگو - نورجہاں شاعر کو دیکھکر کہتی ہے —

زمیں ترقید و پیدا شد سرخر

شاعر جواب دیتا ہے :- شمیدہ بوے مادہ آمدہ نر

یا زیب النسا کی حاضر جوابی کے قصے علمی تحقیق سے اگر قطع نظر کرلی جائے تو یہ ظرافت اور زندہ دلی کی اچھی مثالیں ہیں اور یہی کتاب کا اصل مقصد ہے ہماری راے میں یہ کتاب فارسی ادبیات کا ذوق رکھنے والے حضرات کے لئے بہت دلچسپ ہے - کتاب مجلد ہے - پانچ روپئے میں جناب مولف سے ذیل کے پتہ پر مل سکتی ہے —

THE SWADESHI MILLS Co. Ltd.

NAVSARI BUILDINGS, HORNBY ROAD, FORT,

BOMBAY.

جدید رسالے

نوید

یہ رسالہ انجمن ترقی اُردو پٹنہ (عظیم آباد) کی جانب سے شایع ہوا ہے - اِس کا مقصد "صوبۂ بہار کے نوجوانوں میں زبان اُردو کا صحیح مذاق پیداکرنا اور ماہرین فن کی ادبی خدمات کو گوشۂ گمنامی سے نکال کر زندہ اور روشناس کرنا ہے" - انجمن کا یہ کام بہت قابل قدر ہے اور اس نے اپنے مقاصد کو عمل میں لانے کی کوشش بھی کی ہے - چنانچہ حضرت شاد کا کلام ابھی انجمن کی طرف سے شایع ہے اس رسالے میں حضرت وحید مرحوم کی ایک غزل بھی شایع ہوئی ہے - حضرت وحید

ایک نازک خیال شاعر تھے-افسوس ھے کہ ان کا کلام ضایع ھوگیا-اس رسالے میں علاوہ دوسرے ادبی مضامین کے ایک مضمون صوبۂ بہار اور اُردو پر ھے-نیو کالج پٹنہ کے ایک مشاعرے کی غزلوں کا انتخاب بھی درج ھے-ھمیں اُمید ھے کہ یہ رسالہ ترقی کریگا اور اپنے مقاصد میں کامیاب ھوگا-بہار میں اس قسم کے رسالوں اور اُردو زبان کی ترقی کی کوششوں کی بہت ضرورت ھے—

یہ رسالہ حضرت ساقی کی اڈیٹری میں ماھانہ شایع ھوتا ھے-سالانہ چندہ چار روپیہ ھے—

سفیرالتجار

یہ ماھانہ رسالہ دھلی سے شایع ھوتا ھے جس میں تجارت کے متعلق مختلف مفید معلومات اور مضامین شایع ھوتے ھیں-رسالہ بہت اچھا چھپتا ھے اور نقشے تصویریں بھی بہت اچھی ھوتی ھیں-جن اصحاب کو تجارت کا شوق ھے اُن کے لئے یہ بہت کارآمد ھے سالانہ چندہ چار روپیہ ھے—

کشاف

یہ ماھوار علمی اور ادبی رسالہ چھوٹی تقطیع پر امرتسر سے شایع ھوتا ھے-اِس میں نظم و نثر کے دلچسپ مضامین ھوتے ھیں-علمی مضامین کے علاوہ فسانہ اور تنقید کا حصہ بھی ھے-مالک و اڈیٹر-ایم محمد الدین غریب اور آنریری اڈیٹر غلام حسین بشر ھیں-سالانہ چندہ ایک روپیہ بارہ آنہ—

تاج

تاج حیدرآباد دکن نے میلاد نمبر خاص اھتمام سے شایع کیا ھے سرورق خوبصورت چھاپا ھے-نظم و نثر کے مختلف مضامین جو میلاد خاتم النبیین سے متعلق ھیں ۳۲ ھیں-تمام مضامین مطالعہ کے قابل ھیں اور بہت خوبی سے لکھے گئے ھیں-ضخامت بھی معمول سے بہت زیادہ ھے-حضرت وفا اڈیٹر کی محنت اور

کوشش بہت قابل قدر ہے-یہ حیدرآباد کا بہترین رسالہ ہے-لکھائی-اور چھپائی کے لحاظ سے بھی یہ رسالہ حیدرآباد کے دوسرے رسالوں سے بہتر ہے-

مطبوعات انجمن

جاپان اور اس کا تعلیمی نظم ونسق

سرکار نظام نے نواب مسعود جنگ بہادر ناظم تعلیمات ممالک محروسہ سرکارعالی کو جاپان کے تعلیمی نظام کے مطالعہ اور تحقیق کے لئے بھیجا تھا۔نواب صاحب موصوف نے وہاں رہکر اس عجیب وغریب ملک کے حالات اور خاصکر تعلیمی نظام و نسق کو نہایت غور اور تحقیق سے مطالعہ فرمایا۔کتاب کے ابتدائی حصہ میں جاپان کی تاریخ اور اس کی ترقی کے اسباب پر نہایت دلچسپ اور فاضلانہ بحث کی ہے۔جو ہمارے اہل وطن کے لئے بہت سبق آموز ہے۔اُردو میں یہ پہلی کتاب ہے جو جاپان پر اس طرز میں لکھی گئی ہے۔ہر محب وطن کا فرض ہے کہ اس کتاب کو شروع سے آخرتک پڑھے جو علاوہ دلچسپ ہونے کے پر از معلومات ہے۔خاصکر ان لوگوں کے لئے اس کا مطالعہ ناگزیر ہے جو ملک کی تعلیم سے تعلق رکھتے ہیں (حجم ۴۸۲ صفحہ)

قیمت فی جلد مجلد تین روپیہ کلدار

سرگزشت حیات یا آپ بیتی

اس کتاب میں حیات کے آغاز اور اس کے نشو ونما کی داستان نہایت دلچسپ طرز پر بہت ہی سلیس زبان میں بیان کی گئی ہے۔حیات کی ابتدائی حالت کیسے لے کر اس کا ارتقا انسان تک پہنچایا گیا ہے اور تمام تاریخی مدارج کو اس سہل طریقہ سے بتایا گیا ہے کہ ایک معمولی پڑھا لکھا ہوا آدمی بھی سمجھ سکے اور اگرچہ جدید سے جدید علمی تحقیقات بھی اس میں آگئی ہے مگر بیان کی سلاست میں فرق نہیں آیا۔ یہ کتاب جدید معلومات سے لبریز ہے اور ہر شخص کو اس کا مطالعہ کرنا لازم ہے (حجم ۳۰۰ صفحہ)

قیمت فیجلد مجلد دو روپیہ آٹھ آنہ کلدار—

تذکرۂ شعرائے اردو

مولفۂ میر حسن دھلوی۔میر حسن کے نام سے کون واقف نہیں۔ان کی مثنوی بدر منیر کو جو قبول عام نصیب ہوا شاید ہی اردو کی کسی کتاب کو نصیب ہوا ہو۔یہ تذکرہ اسی مقبول اور نامور استاد کی تالیف ہے۔یہ کتاب بالکل نایاب تھی بڑی کوشش سے بہم پہونچا کر طبع کی گئی ہے۔ میر صاحب کا نام اس تذکرہ کی کافی شہادت ہے۔اس پر مولانا محمد حبیب الرحمن خاں صاحب شروانی نے ایک بسیط نقادانہ اور عالمانہ تبصرہ لکھا ہے جو قابل پڑھنے کے ہے۔قیمت فی جلد مجلد ایک روپیہ ۱۴ آنہ کلدار۔ غیر مجلد ایک روپیہ ۲ آنہ کلدار—

تاریخ تمدن

سرتامس بکل کی شہرۂ آفاق کتاب کا

ترجمہ ہے۔الف سے ی تک تمدن کے ہر
مسئلہ پر کمال جامعیت سے بحث
کی گئی ہے اور ہر اصول کی تائید
میں تاریخی اسناد سے کام لیا گیا ہے
اس کے مطالعہ سے معلومات میں انقلاب
اور ذہن میں وسعت پیدا ہوتی ہے۔
حصۂ اول غیر مجلد ایک روپیہ ۸ آنہ
مجلد دو روپیہ کلدار حصۂ دوم مجلد
۳ روپیہ کلدار —

مقدمات الطبیعات

یہ ترجمہ ہے مگر انگلستان کے مشہور
سائنس داں حکیم ہکسلے کی کتاب کا
جس کا نام کتاب کی کافی ضمانت ہے۔
اس میں بظاہر فطرت کی بحث درج ہے
لیکن کتاب علم و فضل کا مرقع ہے
قیمت غیر مجلد دو روپیہ کلدار۔
مجلد دو روپیہ ۸ آنہ کلدار —

القول الاظہر

امام ابن مسکویہ کی معرکۃ الارا تصنیف
فوز الاصغر کا یہ اردو ترجمہ ہے۔یہ کتاب
فلسفۂ الہیین کے اصول پر لکھی گئی ہے
اور مذہب اسلام پر انہیں اصول کو
منطبق کیا گیا ہے قیمت غیر مجلد
۸ آنہ کلدار مجلد ایک روپیہ کلدار —

القمر

قوانین حرکت و سکون اور نظام شمسی
کی صراحت کے بعد چاند کے متعلق جو
جدید انکشافات ہوئے ہیں ان سب کو
جمع کر دیا ہے طرز بیان دلچسپ اور
کتاب ایک نعمت ہے قیمت غیر مجلد
۱۰ آنہ کلدار —

قاعدہ و کلید قاعدہ

یہ قاعدہ مدت کے غور و خوض کے بعد
اور بالکل جدید طرز پر لکھا گیا ہے
جن اصول اور طریقہ پر اس کی تعلیم
ہونی چاہئے ان کی تشریح کے لئے ایک
کلید بھی تیار کی گئی ہے۔قاعدہ
غیر مجلد ۲ آنہ کلدار۔کلید قاعدہ
غیر مجلد ۴ آنہ کلدار —

فلسفۂ تعلیم

ہربرٹ اسپنسر کی مشہور تصنیف اور
مسئلۂ تعلیم کی آخری کتاب ہے غور
و فکر کا بہترین کارنامہ۔والدین و معلم
کے لئے چراغ ہدایت ہے۔تربیت کے
قوانین کو اس قدر صحت کے ساتھہ
مرتب کیا ہے کہ کتاب الہامی معلوم
ہوتی ہے۔اس کا نہ پڑھنا گناہ ہے۔قیمت
مجلد ۳ روپیہ کلدار۔غیر مجلد ۲ روپیہ
۸ آنہ کلدار —

دریاے لطافت

ہندوستان کے مشہور سخن سنج میر
انشاالله خاں کی تصنیف ہے۔اردو
صرف و نحو اور محاورات اور الفاظ
کی پہلی کتاب ہے اس میں زبان کے
متعلق بعض عجیب و غریب نکات درج
ہیں۔قیمت غیر مجلد ایک روپیہ ۸ آنہ
کلدار مجلد ۲ روپیہ کلدار —

طبقات الارض

اس فن کی پہلی کتاب ہے۔تین سو
صفحوں میں تقریباً جملہ مسائل

قلم بلد کئے ہیں۔کتاب کے آخر میں انگریزی مصطلحات اور ان کے مرادفات کی فہرست بھی منسلک ہے۔قیمت غیر مجلد ۲روپیہ کلدار مجلد ۲ روپیہ ۸ آنہ کلدار—

مشاہیر یونان و رومہ

ترجمہ ہے۔سیرت نگاری اور انشاپردازی میں اصل کتاب کا مرتبہ دوہزار برس سے آج تک مسلم الثبوت چلا آتا ہے۔ ادیبان عالم بلکہ شکسپیر تک نے اس چشمہ سے فیض حاصل کیا ہے۔وطن پرستی اور بے نفسی عزم وجواں مردی کی مثالوں سے اس کا ہر ایک صفحہ معمور ہے۔قیمت جلد اول غیر مجلد ۳ روپیہ کلدار۔مجلد ۴ روپیہ کلدار جلد دوم مجلد ۲ روپیہ ۸ آنہ کلدار—

اسباق النحو

ملک کے ادیب کامل مولانا حمیدالدین صاحب بی اے کی تالیف ہے اختصار کے باوجود عربی صرف و نحو کا ہر ایک ضروری مسئلہ درج ہے۔قیمت حصۂ اول غیر مجلد ۲ آنہ کلدار حصۂ دوم غیر مجلد ۴ آنہ کلدار—

علم المعیشت

اس کتاب کی تصنیف سے پروفیسر محمد الیاس صاحب برنی ایم اے نے ملک پر بہت بڑا احسان کیا ہے۔ معیشت پر یہ کتاب جامع و مانع ہے۔ مبہم و مشکل مسائل کو پانی کر دیا ہے اس کے اکثر باب نہایت عجیب و غریب ہیں۔اشتراکیت کا باب قابل دید ہے۔ حجم ۸۸۵ صفحے قیمت مجلد ۵ روپیہ ۸ آنہ کلدار—

تاریخ اخلاق یورپ

اصل مصنف پروفیسر لیکی کا نام علم و تبحر۔تحقیق صداقت کامرادف ہے۔ یہ کتاب کئی ہزار برس کے تمدن۔ معاشرت – اصول – اخلاق – مذاہب و خیالات کا مرقع ہے۔حصۂ اول مجلد ۳روپیہ کلدار حصۂ دوم مجلد ۲ روپیہ ۸ آنہ کلدار—

تاریخ یونان قدیم

یہ کتاب مطالب کے لحاظ سے مستند کتابوں کا خلاصہ ہے اور زبان کے لحاظ سے سلاست و شگفتگی کا نمونہ۔اس کا نقطۂ خیال خالصاً ہندوستانی ہے۔ایف اے کلاس کے طلبا جو یونان قدیم کی تاریخ سے گھبراتے ہیں اس کتاب کو انتہا درجہ مفید پائیں گے۔قیمت مجلد ۲ روپیہ کلدار—

انتخاب کلام میر

میر تقی میر تاج شعرائے اردو کے کلام کا انتخاب ہے۔مولوی عبدالحق صاحب سکریٹری انجمن ترقی اردو نے یہ انتخاب ایک مدت کی سعی و محنت کے بعد کیا ہے اورشروع میں میر صاحب کی خصوصیات شاعری پر ۴۰ صفحہ کا ایک عالمانہ مقدمہ بھی لکھا ہے۔قیمت مجلد ۲ روپیہ کلدار—

رسالۂ نباتات

اس موضوع کا پہلا رسالہ ہے۔علمی اصطلاحات سے معرا۔طلباء نباتات جس مسئلہ کو انگریزی میں نہ سمجھہ سکیں وہ اس رسالہ میں مطالعہ کریں قیمت مجلد ایک روپیہ چار آنہ کلدار —

دیباچۂ صحت

اس کتاب میں مطالبات صحت پر (مثلاً ھوا-پانی غذا-لباس-مکان وغیرہ) مبسوط اور دلچسپ بحث کی گئی ہے۔ زبان عام فہم اور پیرایہ موثر و دلپزیر ھے ملک کی بہترین تصنیف ہے اس کا مطالعہ کئی ھزار نسخوں سے زیادہ قیمتی ثابت ھوگا۔حجم ایک ھزار صفحے۔قیمت مجلد چار روپیہ —

قواعد اردو

ارباب فن کا اتفاق ہے کہ اردو زبان میں اس سے بہتر قواعد نہیں لکھے گئے۔ بسط و شرح کے علاوہ اس میں بڑی خوبی یہ ہے کہ فارسی قواعد کا تتبع نہیں کیا گیا ہے قیمت غیر مجلد دو روپیہ کلدار —

نکات الشعراء

یہ اردو کا تذکرہ استادالشعرا میر تقی مرحوم کی تالیفات سے ہے۔اس میں بعض ایسے شعرا کے حالات بھی ملیں گے جو عام طور پر معروف نہیں۔نیز میر صاحب کی رائیں اور زبان کے بعض بعض نکات پڑھنے کے قابل ھیں۔مولانا محمد حبیب الرحمن خاں صاحب شروانی صدرالصدور امور مذھبی سرکار عالی نے اس پر ایک ناقدانہ اور دلچسپ مقدمہ لکھا ہے۔قیمت مجلد دو روپیہ ۴ آنہ کلدار —

فلسفۂ جذبات

کتاب کا مصنف ھندوستان کا مشہور نفسی ہے۔جذبات کے علاوہ نفس کی ھر ایک کیفیت پر نہایت لیاقت اور زبان آوری کے ساتھہ بحث کی گئی ھے۔ متعلمان نفسیات اسے مفید پائیں گے قیمت مجلد دو روپیہ ۸ آنہ کلدار غیر مجلد دو روپیہ کلدار —

وضع اصطلاحات

یہ کتاب ملک کے نامور انشا پرداز اور عالم مولوی وحیدالدین سلیم (پروفیسر عثمانیہ کالج) نے سالہا سال کے غور و فکر اور مطالعہ کے بعد تالیف کی ھے بقول فاضل مولف " یہ بالکل نیا موضوع ہے۔میرے علم میں شاید کوئی ایسی کتاب نہ آج تک یورپ کی کسی زبان میں لکھی گئی ہے نہ ایشیا کی کسی زبان میں "۔ اس میں وضع اصطلاحات کے ھر پہلو پر تفصیل کے ساتھہ بحث کی گئی ہے اور اس کے اصول قائم کئے گئے ھیں۔مخالف و موافق رایوں کی تنقید کی گئی ہے اور زبان کی ساخت اور اس کے عناصر ترکیبی مفرد و مرکب اصطلاحات کے طریقے۔سابقوں اور لاحقوں۔اردو مصادر اور ان کے

مشکلات-غرض سیکڑوں دلچسپ اور علمی بحثیں زبان کے متعلق آگئی ہیں-اردو میں بعض اور بھی ایسی کتابیں ہیں جن کی نسبت یہ کہا جا سکتا ہے کہ زبان میں ان کی نظیر نہیں-لیکن اس کتاب نے زبان کی جڑیں مضبوط کردی ہیں اور ہمارے حوصلہ بلند کر دئے ہیں-اس سے پہلے ہم اردو کو علمی زبان کہتے ہوئے جھجکتے اور اس کی آیندہ ترقی کے متعلق دعوی کرتے ہوئے ہچکچاتے تھے-مگر اس کتاب کے ہوتے یہ اندیشہ نہیں رہا-اس نے حقیقت کا ایک نیا باب ہماری آنکھوں کے سامنے کھول دیا ہے-تعداد صفحات ۳۰۵ قیمت مجلد تین روپیہ ۱۲ آنہ کلدار—

نفح الطیب

یہ کتاب اسلامی عہد کی تاریخ اسپین کے معلومات کا خزانہ ہے-خلافت اسپین کے ہر مورخ کو اس کی خوشہ چینی کرنی پڑی ہے-علامۂ مقری کی نامور اور مشہور آفاق کتاب ہے جو پہلی دفعہ اردو میں ترجمہ ہوئی ہے-یہ کتاب عثمانیہ یونیورسٹی کے نصاب میں بھی داخل ہے صفحات ۶۰۴ قیمت مجلد چھہ روپیہ ۸ آنہ کلدار—

محاسن کلام غالب

ڈاکٹر عبدالرحمن بجنوری مرحوم کا معرکۃالارا مضمون ہے-اردو زبان میں یہ پہلی تحریر ہے جو اس شان کی لکھی گئی ہے-یہ مضمون اردو کے پہلے نمبر میں طبع ہوا تھا-صاحب نظر قدر دانوں کے اصرار سے الگ بھی طبع کیا گیا ہے-قیمت غیر مجلد ایک روپیہ ۸ آنہ کلدار

مالِ قدیمہ

ایک فرانسیسی کتاب کا ترجمہ ہے-اس میں بعض قدیم اقوام-سلطنت کلدانی-آشوری-بابل-بنی اسرائیل و فنیقیہ کی معاشرت-عقائد-صنعت و حرفت وغیرہ کے حالات دلچسپی اور خوبی کے ساتھہ دئے ہیں-اردو میں کوئی ایسی کتاب نہ تھی جس سے ان قدیم اقوام کے حالات صحیح طور سے معلوم ہوسکیں اس لئے انجمن نے اسے خاص طور پر طبع کرایا ہے حالات کی وضاحت کے لئے جا بجا تصویریں دی گئی ہیں-صفحہ ۲۷۴-قیمت مجلد دو روپیہ ۶ آنہ کلدار—

بجلی کے کرشمے

یہ کتاب مولوی محمد معشوق حسین خاں صاحب بی اے نے مختلف انگریزی کتابوں کے مطالعہ کے بعد لکھی ہے-برقیات پر یہ ابتدائی کتاب ہے اور سہل زبان میں لکھی ہے ہمارے بہت سے ہم وطن یہ نہیں جانتے کہ بجلی کیا چیز ہے-کہاں سے آتی ہے کیا کام آسکتی ہے-یہ کتاب ان تمام معلومات کو بتاتی ہے-لڑکے لڑکیوں کے لئے بھی مفید ہے-قیمت دو روپیہ ۴ آنہ کلدار—

——:o:——

حسب ذیل کتابیں بھی انجمن ترقی اُردو اورنگ آباد دکن سے مل سکتی ہیں
(کل قیمتیں سکۂ انگریزی میں ہیں)

(دارالمصنفین اعظم گڈھ)

۱- سیرۃ النبی حصۂ اول ۴ روپیہ
۲- سیرۃ النبی حصۂ دوم ۳ روپیہ ۸ آنہ
۳- شعرالعجم مکمل ۵ حصے ۱۳ روپیہ
۴- سفرنامہ مولانا شبلی ۲ روپیہ
۵- علم الکلام ۲ روپیہ
۶- الکلام ۲ روپیہ
۷- کلیات شبلی ۱ روپیہ ۸ آنہ
۸- اسوۂ صحابہ مکمل دو حصہ ۸ روپیہ
۹- انقلاب الامم ۲ روپیہ
۱۰- برکلے ۱ روپیہ ۸ آنہ
۱۱- مکالمات برکلے ۱ روپیہ ۸ آنہ
۱۲- مثنوی بحرالمحبت ۱۲ آنہ
۱۳- تفسیر ابومسلم اصفہانی (عربی) ۲ روپیہ
۱۴- سیرالصحابیات ۲ روپیہ ۴ آنہ
۱۵- روح الاجتماع ۲ روپیہ
۱۶- ابن رشد ۴ روپیہ

(مطبع کاویانی - برلن)

۱- موش و گربہ (فارسی) ۵ آنہ ۶ پائی
۲- زادالمسافرین (فارسی) ۸ روپیہ
۳- گلستان (فارسی) ۲ روپیہ ۸ آنہ
۴- تیاتر (فارسی) ۲ روپیہ ۸ آنہ
۵- تاریخ سنی ملوک الارض (عربی) ۲ روپیہ ۸ آنہ
۶- نصاب الصبیان (فارسی) ۱ روپیہ
۷- رہنمای پسران (فارسی) ۱ روپیہ ۸ آنہ
۸- تلغراف بی سیم (فارسی) ۱ روپیہ
۹- ہزار و یک سخن (فارسی) ۱۱ آنہ

(جامعہ ملیہ - علی گڈھ)

۱- الخلافت الکبریٰ ۵ روپیہ
۲- الصراط المستقیم ۲ روپیہ
۳- بصائر ۶ آنہ
۴- سیرۃ الرسول ۱ روپیہ ۸ آنہ
۵- خلافت راشدہ ۲ روپیہ
۶- خلافت بنی امیہ ۲ روپیہ ۸ آنہ
۷- خلافت عباسیہ ۲ روپیہ
۸- خلافت عباسیہ بغداد ۲ روپیہ
۹- مبادی معاشیات ۱ روپیہ
۱۰- انتخاب میر (از نورالرحمن صاحب) ۱ روپیہ
۱۱- قواعد عربی ۲ روپیہ
۱۲- عرض جوہر ۸ آنہ
۱۳- مجموعہ کلام جوہر ۶ آنہ
۱۴- اسلامی تہذیب و قومی تعلیم ۴ آنہ
۱۵- ازہارالعرب ۸ آنہ
۱۶- انتخاب مضامین جوہر ۱ روپیہ
۱۷- ترکوں کی کہانیاں ۴ آنہ
۱۸- خطبہ شیخ الہند ۲ آنہ

۱۹- خطبہ حکیم اجمل خاں صاحب
۲ آنہ
۲۰- ہمارے نبی ۸ آنہ
۲۱- تاریخ ہند قدیم ۱ روپیہ
۲۲- اورنگ زیب عالمگیر پر ایک نظر
۱۲ آنہ

(نظامی پریس - بدایون)

۱- قاموس المشاہیر جلد اول ۲ روپیہ
۲- نکات غالب مجلد ۱ روپیہ
۳- دیوان غالب مشرح مجلد دو روپیہ
۸ آنہ
۴- دیوان جان صاحب مجلد ۱ روپیہ
۸ آنہ
۵- دیوان درد ۱ روپیہ ۴ آنہ
۶- دیوان غالب (لائبریری ایڈیشن)
۱ روپیہ ۸ نہ
۷- خطوط سرسید قسم اول ۳ روپیہ
۸- خطوط سرسید قسم دوم ۲ روپیہ
۹- لیتھوگرافی مجلد ۲ روپیہ ۸ آنہ
۱۰- انتخاب زرین مجلد ۲ روپیہ
۱۱- مراثی انیس جلد اول مجلد
۱۰ روپیہ
۱۲- مراثی انیس جلد دوم قسم اول
۸ روپیہ قسم دوم ۴ روپیہ
۱۳- تذکرۃ الصلحا ۸ آنہ
۱۴- کنز التاریخ ۱ روپیہ ۸ آنہ

(دائرۂ ادبیہ - لکھنؤ)

۱- مکاتیب امیر مینائی ۲ روپیہ ۸ آنہ
۲- مکاتیب اکبر ۱ روپیہ
۳- مینائے سخن ۱ روپیہ

۴- حزن اختر ۸ آنہ
۵- درس عمل ۴ آنہ
۶- خواتین انگورہ ۱ روپیہ
۷- بیگمات بنگال ۲ آنہ
۸- اسلام کا اثر یورپ پر ۴ آنہ
۹- مشرقی ترکستان ۲ آنہ
۱۰- سیاحت زمین ۱ روپیہ
۱۱- سیاحت ہوا ۱ روپیہ

الناظر پریس - لکھنؤ

۱- تاریخ عرب ۷ روپیہ ۸ آنہ
۲- موازنہ انیس و دبیر ۳ روپیہ
۳- مقدمہ شعر و شاعری ۱ روپیہ ۴ آنہ
۴- اصول النسخ ۲ آنہ
۵- مسلمانان اندلس ا روپیہ ۸ آنہ
۶- اسرار رنگون ۱ روپیہ
۷- ہوم رول ۵ آنہ
۸- خوان دعوت ۱ روپیہ
۹- مصنوعی شوہر ۲ آنہ
۱۰- وکرم اروسی ۱ روپیہ ۸ آنہ
۱۱- مسلمانوں کی تہذیب ۲ آنہ
۱۲- الاحسان ۸ آنہ

(دوسری قابل قدر کتابیں)

۱- رسائل شبلی ۱ روپیہ ۸ آنہ
۲- کتب خانہ اسکندریہ ۵ آنہ
۳- مسدس حالی ۱۲ آنہ
۴- جنگل کی پہلی کہانی ۵ آنہ
۵- بادل کے بچے ۱ روپیہ
۶- بانگ درا ۴۰ روپیہ
۷- یادگار غالب ۱ روپیہ ۸ آنہ
۸- مجموعۂ نظم حالی ۸ آنہ